رسائلِ یوسفی

* اِنکارِ حدیث کیوں؟
* ترجمہ فرمان علی پر ایک نظر
* ترجمہ اِنتباہُ المؤمنینؒ
* عورت کی سربراہی (کل)
* کیا ذِکری مسلمان ہیں؟
* عورت اور مرد کا رُتبہ
* تنقید اور حقِ تنقید

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

رسائل یوسفی

- ترجمہ فرمان علی پر ایک نظر
- انکار حدیث کیوں؟
- ترجمہ انتباہ المومنین
- عورت کی سربراہی (مکمل)
- کیا ذکری مسلمان ہیں؟
- عورت اور مرد کا رتبہ
- تنقید اور حق تنقید

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

مکتبہ لدھیانوی

اشاعت اول-- اپریل ۱۹۹۶ء

تعداد-- ایک ہزار

قیمت--

ناشر-- مکتبہ لدھیانوی

جامع مسجد فلاح فیڈرل بی ایریا

نصیر آباد بلاک نمبر ۱۴، کراچی ۳۸

رابطہ-- جامع مسجد باب الرحمت پرانی نمائش

ایم اے جناح روڈ۔ کراچی ۷۴۴۰۰

فون ۷۷۸۰۳۳۷

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محدث العصر عاشق رسول حضرت اقدس مولانا سید محمد یوسف بنوری" نور اللہ مرقدہ کے ہم نام و ہم کام، خلیفہ ارشد قطب الاقطاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ و عارف باللہ حضرت اقدس ڈاکٹر عبدالحی عارفی"، مرشدی و سیدی والد ماجد حضرت اقدس حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانوی زیدمجدھم کو اللہ تعالیٰ نے موجودہ دور میں ترجمان علماء حق کی حیثیت سے تکوینی طور پر ہر فتنے کے مقابلہ میں جہاد بالقلم کے اولین سپاہی کے منصب پر فائز فرمایا۔ حضرت بنوری" کے زمانہ ہی میں جب آپ نے اس صدی کے فتنہ انکار حدیث کے موجد مسٹر غلام احمد پرویز اور موجودہ صدی کے ماڈرن اسلام کے بانی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تو حضرت بنوری" کی طرف سے جو حوصلہ افزائی ہوئی وہ آپ کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ جانشین حضرت بنوری" مولانا مفتی احمد الرحمٰن" تو اپنے شیخ بنوری" کی اقتدا میں ہر باطل فتنے کی قلمی سرکوبی کے لئے حضرت والد ماجد کی طرف رجوع کرنا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ الحمد للہ اکابر امت کے اس اعتماد کی برکت سے پاکستان اور بیرون پاکستان جس فتنے نے سر اٹھانے کی کوشش کی حضرت والد ماجد نے دن رات کا آرام تج کر اس کا بھرپور تعاقب کیا۔

حضرت والد ماجد کی یہ تحریریں مختلف رسائل اور اخبارات کی زینت بنیں تو احباب کا اصرار ہوا کہ ان کو کتابی شکل میں یکجا شائع کردیا جائے۔ الحمد للہ مکتبہ لدھیانوی "رسائل یوسفی" کے نام سے حضرت کے سات رسائل پر مشتمل ایک بہترین کتاب شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے اللہ تعالیٰ شرف قبولیت عطا فرمائے۔

حافظ محمد عتیق الرحمٰن
ناظم مکتبہ لدھیانوی کراچی

اجمالی فہرست

ترجمۂ فرمان علی پر ایک نظر

جس میں واضح کیا گیا ہے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں، ادر قرآن کریم کو غلط مانتے ہیں۔ نیز حضرات صحابہ کرام رض اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔

فہرست

باب اول:

باب دوم:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ: حال میں جناب سید فرمان علی شاہ صاحب کا ترجمۂ قرآن کریم مع فوائد تفسیریہ نظر سے گذرا، جو" پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ - ۱۳۹ فاران ہاؤسنگ سوسائٹی، حیدر علی روڈ کراچی ۵" کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ پون صدی پہلے لکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں مطبع نظامی سے شائع ہوا تھا، اب جناب سید نجم الحسن کراروی (پشاور) کی نظر ثانی اور اصلاح و ترمیم کے بعد دوبارہ شائع ہوا ہے۔ موصوف "سرلفظ" کے زیر عنوان اس ترجمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کا زیر نظر ترجمہ حضرت علامہ حافظ سید فرمان علی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ (چندن پٹی ضلع دربھنگہ، صوبہ بہار، بھارت) کا کیا ہوا ہے اگرچہ علامہ موصوف بے پناہ قابلیت وصلاحیت کے مالک تھے اور ان کا ترجمۂ قرآن بھی بے انتہا خوبیوں سے بھرپور ہے اور بڑے بڑے علماء نے اسے سراہا اور تمام اردو ترجموں کا سرتاج قرار دیا جن میں فقیہ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید محمد باقر صاحب قبلہ مجتہد، عمدۃ المتالہین حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید ظہور حسین صاحب، قبلہ مجتہد، وشمس

العلماء حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد، وشمس العلماء حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید نجم الحسن قبلہ مجتہد، وعمدۃ العلماء حجۃ الاسلام حضرت سید کلب حسین صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہم شامل ہیں"۔

اس ترجمہ پر نظر ثانی کی ضرورت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن بمقولہ "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" ترجمہ اور حواشی میں بھول چوک اور تسامح بعید از امکان نہیں۔ ... علامہ موصوف نے لازماً ترجمہ کرتے وقت تفاسیر محمدؐ و آل محمدؐ اور ان کے پاکیزہ ارشادات کو سامنے رکھا ہوگا لیکن بمقتضائے بشریت کسی مقصد، مطلب اور مفہوم کا نظر انداز ہو جانا غیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقام پر حواشی میں تسامحات ہو گئے جن کی طرف نہ صرف ناچیز بلکہ خطیب اعظم حضرت مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد مصطفیٰ صاحب قبلہ جوہر اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا آغا مرزا مہدی حسن صاحب قبلہ پویا اور بہت سے دیگر علماء کرام متوجہ تھے اور ہر ایک کی تمنا تھی کہ اس بے نظیر ترجمہ کو نظر ثانی کے بعد اس کے شایان شان انداز میں زیور طبع سے آراستہ کیا جائے ..."

اس ترجمہ پر متعدد حضرات کی تقریظیں ثبت ہیں جن کے نام القاب کے ساتھ اس طرح لکھے گئے ہیں۔

حضرت حجۃ الاسلام سرکار نجم العلماء مولانا السید نجم الحسن صاحب قبلہ

مجتہد العصر

۲۔ حضرت حجۃ الاسلام سرکار مولانا السید محمد باقر صاحب قبلہ مجتہد

۳۔ حضرت حجۃ الاسلام سرکار مولانا السید ظہور حسین صاحب قبلہ مجتہد

۴۔ حجۃ الاسلام عمدۃ العلماء جناب مولانا السید کلب حسین صاحب قبلہ مجتہد العصر۔

۵۔ صدر المحققین ناصر الملۃ والدین شمس العلماء جناب مولانا السید ناصر حسین صاحب قبلہ۔

اس ترجمہ کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے:۔

"اگر کتاب اللہ اردو میں نازل ہوتی تو آپ کے ترجمہ میں اور اس میں ایک نقطہ کا فرق نہ ہوتا" (صـ۱۴ـ)

دین کی دو بنیادیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے تو آپؐ کے بعد آپؐ کی چھوڑی ہوئی دو چیزیں دنیا میں موجود تھیں، ایک کتاب اللہ جو حق تعالیٰ نے آپؐ پر ۲۳ سال میں نازل فرمائی اور جس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا۔ دوسری آپؐ کی جماعت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی محنت سے تیار کی، جس کی اصلاح و تربیت براہ راست وحی الٰہی کی نگرانی میں ہوئی، اور جسے آزمائش و امتحان میں پورا اترنے کے بعد "رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ" کے "تاج کرامت" سے سرفراز فرمایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے لائے ہوئے دین کے قائم و دائم رہنے کا مدار انہی دو چیزوں پر

تھا "کتاب اللہ" اور "جماعت نبی" (صلی اللہ علیہ وسلم)

ظاہر ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد "کتاب اللہ" اپنی صحیح حالت میں محفوظ نہیں رہی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام باقی نہیں رہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ محنت اور فیضانِ نبوت کے نتیجہ میں قدوسیوں کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اور جن پر آپؐ کے بعد اسلام کی دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری عائد ہوئی ان کے بارے میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ پوری کی پوری جماعت یا اس کی غالب اکثریت خدا اور رسول سے منحرف ہو گئی تھی تو اس کا نتیجہ بھی اسلام کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ بعد والوں کو جو کچھ ملا انہی کے واسطے سے ملا، وہی قرآن کے ناقل ہیں، انہی سے احادیث مروی ہیں۔ انہی سے دین کی ایک ایک بات منقول ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور آپؐ پر قرآن کریم کے نزول کے عینی شاہد بھی وہی ہیں، پس اگر "جماعت نبیؐ" لائق اعتماد نہ ہو تو نہ قرآن کریم لائق اعتماد رہتا ہے نہ دین اسلام کی کوئی بات، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کا کوئی ثبوت باقی رہتا ہے اور نہ اس امر کا کہ قرآن کریم واقعتاً آپ پر نازل ہوا تھا۔ الغرض "اصحاب رسولؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائق اعتماد ہونے پر پورے دین کا مدار ہے۔ اگر قابل اعتماد ہیں تو دین بھی لائق اعتماد ہے اور اگر وہ لائق اعتماد نہیں تو دین کی کوئی چیز بھی لائق اعتماد نہیں رہتی۔

ان دو بنیادوں کے بارے میں شیعی مسلک:

فاضل ترجمہ نگار جس مکتب فکر کے ترجمان ہیں اس کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ دونوں چیزیں بگڑ گئیں، جماعت نبی بھی اور کتاب نبی بھی ——— جماعت نبی تو اس طرح بگڑ گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی فلاں صاحب کو اپنے بعد اپنا جانشین اور بنا دیا تھا۔ لیکن "جماعت نبی" میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جس نے اس حکم کی تعمیل کی ہو، بلکہ سوائے تین چار کے باقی سب مرتد ہو گئے اور انہوں نے "وصی رسول" کی جگہ کسی دوسرے کو آپ کا جانشین بنا دیا اور یہ تین چار جو سچے مؤمن تھے انہوں نے بھی طوعاً و کرہاً اسی مرتد کی بیعت کر لی۔ بلکہ جن صاحب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحکم الٰہی اپنی جگہ نامزد کر گئے تھے اس نے بھی بامرِ مجبوری ایک مرتد کے ہاتھ میں ہاتھ دے دئے۔ یوں پوری کی پوری "جماعتِ رسولؐ" مرتد ہو گئی اور جو تین چار افراد ارتداد سے بچے تھے وہ بھی مرتدین کے حلقہ بگوش اطاعت بن گئے۔ ——— چونکہ "کتاب نبی" انہی مرتدین کے قبضہ میں تھی انہی کے زمانے میں جمع و تدوین ہوئی اس لئے اس میں جس طرح چاہا تصرف کیا۔ اس طرح کتاب اللہ بھی تحریف و تبدیل سے پاک نہ رہی۔

شیعہ اور تقیہ

اس مسلک میں اخفا اور پردہ داری کی خاص اہمیت ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ اس مسلک کا اصل عقیدہ راز سربستہ رہے

اور کسی طرح منظر عام پر نہ آئے۔ چنانچہ اخفاء و تقیہ کو دین کے دس حصوں میں سے نو حصے قرار دیا گیا ہے اور اکابرین مسلک کی جانب سے اخفاء و تقیہ کی تاکید بلیغ فرمائی گئی ہے اس مسلک کے ایک بزرگ فرماتے ہیں:-

التقیۃ من دینی ودین آبائی فلا دین لمن لا تقیۃ له	تقیہ میرا اور میرے باپ دادا کا دین ہے۔ جو تقیہ سے کام نہ لے وہ دین سے خارج ہے

(اصول کافی، باب التقیہ ص۲۱۹ ج۲)

انہی بزرگ کا یہ بھی ارشاد ہے:-

ان تسعة اعشار الدین فی التقیۃ ولا دین لمن لا تقیۃ له	دین کے دس حصوں میں سے نو حصے (۹/۱۰ دین) تقیہ میں ہے۔ اور جو تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے

(اصول کافی، باب التقیۃ ص۲۱۷ ج۲)

اس لئے فاضل ترجمہ نگار نے اپنے مسلک کے اکابر کی ہدایت کے مطابق اخفاء و تقیہ کی کوشش کی ہے اس کے باوجود نوک قلم پر بعض ایسی چیزیں آگئی ہیں۔ جن میں اخفاء و تقیہ کی احتیاط ملحوظ نہیں رہ سکی اور اصل عقیدہ کا اظہار کسی نہ کسی طرح ہو کر رہا۔ موصوف کی ایسی نگارشات کا استیعاب تو طویل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ یہاں بطور نمونہ قرآن کریم سے بداعتمادی کے بارے میں موصوف کے خیالات ذکر کئے جاتے ہیں۔

باب اول

شیعہ اور قرآن

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں، بلکہ اسے تحریف شدہ سمجھتے ہیں۔اس سلسلہ میں جناب فرمان علی صاحب اور ان کے تقریظ کنندگان کے اقرار ملاحظہ فرمائیے:

مترجم کا پہلا اقرار

سورہ الاحزاب کا چوتھا رکوع (آیات ۲۸ تا ۳۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات رضہ کے بارے میں ہے اسی ذیل میں آیت ۳۳ کا یہ جملہ بھی ہے،

انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرًا (الاحزاب ۳۳)

اے (پیغمبرؐ کے) اہل بیت! خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دُور رکھے اور جو پاک و

پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ
رکھے (ترجمہ فرمان علی)

اس آیت کریمہ سے ماقبل بھی خطاب ازواج مطہرات رض سے چلا آیا ہے اور مابعد میں بھی انہی سے خطاب ہے چلا گیا ہے، اس لئے لامحالہ اس آیت کا خطاب بھی انہی سے ہے، ازواج مطہرات رض ہی کو "اہل بیت" کے ساتھ پکارا گیا ہے اور انہی سے ہر طرح کی برائی دور رکھنے اور پورے طور پر پاک و پاکیزہ رکھنے کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ قرآن کریم کی اس نص قطعی سے ثابت ہوتا ہے کہ پاک نبی کی پاک بیویاں "اہل بیتِ نبی" ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہن) اس لئے مسلمان جب بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج محترمات کا ذکر کرتے ہیں انہیں ازواجِ مطہرات رض کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن کریم کا یہ اعلان کیونکہ جناب مترجم کے عقیدہ و مسلک کے خلاف ہے اس لئے پہلے تو وہ آیت کی غلط تاویل کرتے ہیں اور پھر قرآن کریم پر تحریف کی تہمت لگاتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اس امر پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے اور سنیوں اور شیعوں میں سے کوئی اس کا مخالف نہیں کہ اہل بیتِ رسول حضرت علی رض جناب فاطمہ، امام حسن اور امام حسین ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ آیت انہی بزرگواروں کے بارے میں نازل ہوئی" (ص ۵۲۷)

موصوف کے یہ دونوں دعوے قطعاً غلط اور خلاف واقعہ ہیں۔ اہلِ سنت میں ایک متنفس بھی اس کا قائل نہیں کہ اہلِ بیتِ رسول صرف یہی چار بزرگ ہیں، اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم میں جن "اہل

بیت" کا ذکر ہے اس سے تو صرف ازواج مطہرات مراد ہیں البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں بزرگوں کو بھی اہلِ بیت میں شامل فرما لیا جیسا کہ "سلمان منا اھل البیت" کہہ کر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بھی شامل فرمایا، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار بزرگوں کو اہلِ بیت میں شامل فرما کر ان کے حق میں بھی تطہیر کی دعا فرمائی۔ لہٰذا قرآن کریم کی رُو سے "اہل بیت" ازواج مطہرات ہیں ... قرآن کریم نے انہی کی تطہیر کا اعلان فرمایا ہے اور حدیث کی رُو سے یہ چار بزرگ بھی اہل بیت میں شامل ہیں اور ان کے لئے تطہیر کی دعا فرمائی گئی ہے۔

فاضل مترجم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ آیت تطہیر سے ماقبل تمام تر خطاب ازواجِ مطہرات رضؓ سے چلا آرہا ہے اور مابعد میں بھی انہی سے خطاب ہے۔ ناممکن ہے کہ درمیان میں آیت کا ٹکڑا ازواجِ مطہرات سے متعلق نہ ہو اور اسے کسی اور پر چسپاں کر دیا جائے۔ جناب مترجم نے اس عقدہ کا جو حل نکالا ہے وہ یہ ہے کہ اس مقام پر قرآن کریم میں تحریف کر دی گئی ہے، آیت کا یہ ٹکڑا کسی اور مقام کا تھا جسے یہاں داخل کر دیا گیا، موصوف لکھتے ہیں:-

> "اس آیت کو درمیان سے نکال لو اور ماقبل و مابعد کو ملا کر پڑھو تو کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ ربط اور بڑھ جاتا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس مقام کی نہیں بلکہ خواہ مخواہ کسی خاص غرض سے داخل کر دی گئی۔" (ص ۵۶۰)

جناب مصنف بغیر کسی جھجک کے صاف اقرار کرتے ہیں کہ ان

کے عقیدہ کے مطابق قرآنِ کریم میں ردّو بدل کر دیا گیا، یعنے بقول ان کے جو آیت ازواجِ مطہرات رض کے بارے میں نہیں تھی اسے خود غرضوں نے کسی دوسری جگہ سے اٹھا کر ان آیات کے سلسلہ میں درج کردیا جو ازواج مطہرات سے متعلق ہیں۔ موصوف کی اس عبارت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ وہ جس مسلک کے نقیب اور داعی ہیں وہ تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہو اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آیتِ تطہیر حضرات امہات المؤمنین کے بارے میں ہے اور قرآنِ کریم نے انہی کو " اہل بیت " فرمایا ہے۔ یہ " اہل بیت نبیؐ " کی کرامت ہے کہ ان سے بغض رکھنے والوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ قرآن کریم کو غلط اور تحریف شدہ کہہ کر دین و ایمان سے خارج ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح ارشاد فرمایا۔

الا ان مثل اهل بيتى فيكم	سُن رکھو ! بے شک میرے اہلِ بیت
مثل سفينة نوح من ركبها	کی مثال سفینہء نوح کی ہے جو شخص
نجا ومن تخلف عنها هلك	اس میں سوار ہوا بچ گیا اور جو اس
(مشکوۃ ص۵۷۳)	سے پیچھے رہا ڈوب گیا

دُوسرا اقرار

جناب مصنف کی اہلِ بیت نبویؐ سے عداوت کا یہ عالم ہے کہ قرآن کریم دوسری جگہ " اہلِ بیت " کا لفظ آیا تو جناب مصنف کو جناب مصنف کو وہاں بھی یہی کہتے بنی کہ یہاں قرآن کریم میں ـــــــ نعوذ باللہ

——تحریف کر دی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں فرشتوں کا وہ مکالمہ مذکور ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ سے ہوا اور جس میں اُن کو "اہلِ بیت" سے خطاب کیا گیا۔

رحمۃ اللہ و برکاتہ علیکم اھل البیت (ہود: ۷۳) — اے اہلِ بیت (نبوت) تم پر خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔

(ترجمہ فرمان علی)

اس کے حاشیہ میں مصنف لکھتے ہیں:

"اس مقام پر یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو خدا نے اہلِ بیت میں داخل کیا ہے کیونکہ اس کے قبل کی آیت میں جتنا خطاب ہے حضرت سارہ کی طرف ہے واحد مؤنث کے صیغہ میں۔ اور اس آیت میں کُمْ جمع مذکر حاضر کی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب کچھ اور لوگ ہیں اور یہ آیت یہاں خواہ مخواہ داخل کر دی گئی۔"

یہاں بھی جناب مصنف نے اقرار کیا ہے کہ قرآن کریم میں تحریف کی گئی ہے اور جو آیت اس مقام کی نہیں تھی "وہ یہاں خواہ مخواہ داخل کر دی گئی ہے" قرآن کریم نے اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ کو "اہلِ بیت" کہہ دیا تو یہ کوئی جرم نہیں تھا کہ قرآن کریم ہی کو غلط اور تحریف شدہ کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ عزیز ذو انتقام ہے "اہل بیت" سے دشمنی رکھنے والوں کے مقابلے میں اس نے اپنی کتاب مقدس کو پیش کر دیا کہ اس آہنی دیوار

سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑتے رہیں ـــــــــ وکفی الله المؤمنین القتال۔

تیسرا اقرار

سورہ الم نشرح کی آیت کریمہ فاذا فرغت فانصب " قرآن کریم میں" فانصب" صاد کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ لیکن فاضل مترجم اس کو صاد کے کسرہ کے ساتھ قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:۔

" تو اب جب کہ تم (تبلیغ کے اکثر کاموں سے) فارغ ہو چکے تو اپنا جانشین مقرر کر دیجیئے"

اور حاشیہ میں اس کا یہ مطلب لکھتے ہیں :۔

" خدا نے دوسرا احسان جتایا کہ تم پر جو نبوت اور احکام خدا پہنچانے کا بوجھ بہت بڑا تھا اس کو علی بن ابی طالب کی خلافت و وزارت سے ہلکا کر دیا اور چونکہ اس حکم خدا یعنی حضرت علی کی خلافت کے اظہار کو حضرت رسولؐ بہت مشکل کام سمجھتے تھے۔ اس بناء پر اس خدا نے جس طرح دوسرے مقام پر دوسرے الفاظ میں فہمائش کی ہے اسی طرح یہاں بھی یوں فرمادیا کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے، پھر وقت مقرر فرما دیا کہ جب تم آخری حج سے فارغ ہو تو خلیفہ مقرر کرو [1] اس کے بعد پھر خدا کی طرف رجوع کرو یعنے موت کی تیاری کرو"۔ [2] (ص ۱۰۷۱)

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مصنف کی یہ ساری تشریح اس پر مبنی ہے کہ لفظ " فانصب " کو زیر کے ساتھ پڑھا جائے، جب کہ قرآن کریم میں فانصِب کا لفظ (زیر کے ساتھ) سرے سے ہے ہی نہیں۔ قرآن کریم میں تو " فانصَب " فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس لئے موصوف کی مندرجہ بالا تشریح غلط بنیاد پر ٹیڑھی عمارت کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ مصنف نے خود ہی علاّمہ زمخشری کا یہ قول نقل کیا ہے:

ومن البدع ما روی عن بعض الرافضة انه قرأ فانصب بكسر الصاد۔ اے فانصب علياً للامامة	اور یہ بات بدعات میں شامل ہے جو بعض رافضیوں سے نقل کی گئی ہے کہ اس نے " فانصب " کو صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھ کر یہ مطلب بیان کیا کہ علیؓ کو امامت کے لئے مقرر کر دو۔

(ترجمہ فرمان علی ضمیمہ ص۴)

لیکن مصنف نے ضمیمہ میں صفحہ ۲ سے صفحہ ۶ تک پورا زورِ قلم اس پر صرف کیا ہے کہ " فانصب " صاد کے کسرہ کے ساتھ صحیح ہے اور فتحہ کے ساتھ غلط اور تحریف شدہ ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ قرآن کریم پر اعراب حجاج بن یوسف ثقفی نے لگوائے تھے اس نے " فانصب " کے اعراب میں تحریف کر کے کسرہ کو فتحہ سے

لہ یہ بھی عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے علی کی خلافت وزارت کے ذریعہ آپ کا بوجھ ہلکا کر دیا اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اب علی کو خلیفہ مقرر کر دو ستم بالائے ستم یہ کہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم اس نعمت عظمیٰ کو بہت مشکل سمجھتے تھے اور اس حکم ربّی سے گریز کرتے تھے نعوذ باللہ۔ لیکن آنحضرتؐ نے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ مرض وفات میں اپنی جگہ ابوبکرؓ کو امام الصلوٰۃ مقرر کر کے حضرت علیؓ اور تمام صحابہ کو ان کا مقتدی بنا دیا۔ اگر آپ حضرت علیؓ کو خلیفہ بناتے تو امام الصلوٰۃ بھی انہی کو بناتے نہ کہ حضرت ابوبکرؓ کو

بدل دیا۔ (ضمیمہ حواشی ص ۴) گویا مصنف کو کھلے لفظوں میں اقرار ہے کہ اس مقام پر قرآن کریم میں تحریف ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ فاضل مترجم کا یہ کہنا کہ یہاں "فانصب" بکسر صاد صحیح ہے اور بفتح صاد تحریف شدہ ہے، یہ قرآن کریم پر بہتان وافترا ہے، چنانچہ خود ان کے ہم مسلک علامہ محمد جواد مغنیہ صاحب "التفسیر الکاشف" میں لکھتے ہیں۔

یہاں اشارہ اس طرف بھی کر دینا مناسب ہے کہ بعض کرائے کے لوگ جنہیں فتنہ انگیزی اور اسلامی مذاہب کے درمیان تشویش پھیلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے انہوں نے شیعہ امامیہ کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ اس آیت کریمہ کے لفظ "فانصب" کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ علی رض کو خلافت کے لئے مقرر کر دو۔ اور اس افتراء کی تردید کے لئے صاحب مجمع البیان کا، جو شیعہ امامیہ کے نزدیک شیوخ مفسرین میں سے ہے، قول نقل کر دینا کافی ہے وہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں "انصب" کا لفظ نصب سے ہے

وتجدر الاشارة الى ان بعض المأجورين للفتنة و بث النعرات بين اهل المذاهب الاسلامية قد نسب الى الشيعة الامامية انهم يفسرون كلمة فانصب فى الآية الكريمة بانصب عليا للخلافة ويكفى فى الرد على هذا الافتراء ما قاله صاحب مجمع البيان، وهو من شيوخ المفسرين عند الشيعة الامامية. قال عند تفسير هذه الآية ما نصه بالحروف: ومعنى انصب من النصب: وهو التعب لا تشتغل بالراحة

جس کے معنی تعب و مشقت کے ہیں، یعنی راحت میں مشغول نہ ہو؛ (ص ۵۸۲ ج ۲ طبع بیروت)

انتہٰی بلفظہ

غور فرمایئے کہ فاضل مترجم تو فانصب بفتح صاد کو غلط قرار دینے پر تین چار صفحے سیاہ کرتے ہیں اسے حجاج بن یوسف کی کارستانی بتاکر تحریف شدہ ثابت کرتے ہیں۔ اس کے بجائے فانصب بکسر صاد کو صحیح بتاتے ہیں لیکن اُن کے ہم مسلک دوسرے صاحب ان کی اس بات کو افترا و بہتان کہتے ہیں اور جو لوگ ایسی بات کریں انہیں فتنہ انگیز اور کرائے کے لوگ کہتے ہیں۔ گویا یہ بھی قرآن کریم کا معجزہ ہے اور حضرات اہلِ بیت کی کرامت ہے کہ جو لوگ پردۂ تقیہ سے نکل کر اپنے عقیدۂ تحریفِ قرآن کا کچھ کچھ اظہار کر دیتے ہیں خود انہی کے ہم مسلک لوگ (از راہِ تقیہ) ان کو فتنہ انگیز اور "کرائے کے لوگ" کہہ کر ان کی بات کو بہتان اور افترا قرار دیتے ہیں۔ وکفی اللہ المؤمنین القتال۔ واقعی اس مسلک کے بزرگوں نے صحیح فرمایا تھا کہ:

انکم علی دین من کتمہٗ اعزہ اللہ۔ ومن اذاعہٗ اذلہ اللہ (اصول کافی، باب الکتمان ص ۲۲۲ ج ۲)

تحقیق تم ایسے دین پر ہو کہ جو اس کو چھپائے گا اللہ اس کو عزت دیگا اور جو شخص اس کو ظاہر کرے گا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔

افسوس ہے کہ یہ حضرات "امام" کی نصیحت پر عمل نہیں کرتے اور اپنے اصل عقائد کا اظہار کرکے یہاں تک ذلیل ہوتے ہیں کہ اپنے ہی ہم مسلک لوگوں کی زبان سے "فتنہ انگیز" اور "کرائے کے لوگ" کا

خطاب پاتے ہیں۔

چوتھا اقرار

فاضل مترجم نے ایک طرف تو تین چار صفحوں تک پورا زورِ قلم اس بات پر صرف کر دیا کہ "فانصب" کا لفظ بکسر صاد صحیح ہے اور بفتح صاد غلط اور حجاج بن یوسف کا تحریف کردہ ہے۔ لیکن اپنی طویل تحریر کے آخر میں وہ لکھتے ہیں :۔

"لیکن ہم حکم امام کے مطابق اسی طرح تلاوت کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس طرح موجودہ قرآن میں مرقوم ہے"

(ضمیمہ حواشی صہ ۵)

گویا "فانصب" بفتح صاد ہے تو غلط، مگر جناب مصنف اور ان کے ہم عقیدہ حضرات "حکم امام" کے مطابق غلط کو غلط ہی پڑھنے پر مجبور ہیں۔ جناب مصنف نے اس چھوٹے سے فقرے میں اشاروں کنایوں میں کئی اہم اور پتے کی باتیں کہہ ڈالی ہیں۔

ایک یہ کہ ان کے عقیدہ کے مطابق قرآن دو ہیں ایک "موجودہ قرآن" جسے وہ قول امام کی بناء پر تحریف شدہ سمجھتے ہیں، دوسرا اصلی قرآن جو تحریف سے پاک ہے مگر دنیا سے غائب ہے۔ فاضل مترجم، جس قرآن کو صحیح سمجھتے ہیں اس کا دنیا میں کہیں وجود نہیں اور جو قرآن دنیا میں موجود ہے اس پر وہ ایمان نہیں رکھتے بلکہ اسے غلط اور تحریف شدہ سمجھتے ہیں۔

دوم یہ کہ فاضل مترجم اپنے امام کی جانب سے اس امر کے

مکلف اور پابند ہیں کہ وہ موجودہ قرآن کو (مع اس کی تحریفات کے) اسی طرح پڑھتے پڑھاتے رہیں۔ ہمارے خیال میں تو جناب محمد جواد حفنیہ صاحب کے بقول یہ بھی امام پر بہتان وافترا ہے۔ امام نے ہرگز ایسا نہیں فرمایا ہوگا۔ کیونکہ کوئی صحیح الدماغ شخص نہ قرآن کریم کو تحریف شدہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ غلط کو غلط پڑھنا منشا خداوندی قرار دے سکتا ہے۔ لیکن فاضل مترجم کو اصرار ہے کہ ان کے "امام" قرآن کریم کو غلط بھی کہتے تھے، ساتھ ہی اس کی تصحیح سے منع بھی فرماتے تھے۔ اور غلط کو بدستور کلام اللہ کی حیثیت سے پڑھتے رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔ اگر امام نے واقعی کوئی ایسا حکم دیا ہے جس کی تعمیل فاضل مترجم اور ان کے ہم عقیدہ حضرات ضروری سمجھتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ قرآن غلط اور تحریف شدہ ہے اور وہ اس کے محفوظ اور عین ما انزل اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے تو اس کے پڑھنے پڑھانے سے کیا فائدہ؟ اور جناب امام نے ایسی غلط بات کا کیوں حکم فرمایا؟ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ اگر یہ بھید کھل گیا کہ "امام" اور ان کے شیعہ قرآن کریم پر ایمان نہیں رکھتے تو مسلمان ان کو خارج از اسلام سمجھیں گے اور ان کا شمار یہودیوں اور مجوسیوں کی صف میں ہونے لگے گا۔ اس لئے امام نے تقیہ کا حکم دیا ہوگا۔ تاکہ مسلمان ان سے دھوکے میں رہیں اور ان کے شیعوں کو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی تخریب اور مسلمانوں کے ایمان متزلزل کرنے کا موقع ملتا رہے ـــ گویا امام یہ چاہتے تھے کہ ان کے مقتدی ہمیشہ عبد اللہ بن ابی اور عبد اللہ بن سبا کے نقش قدم پر گامزن

رہیں۔ یخادعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔

سوم: فاضل مترجم کی مندرجہ بالا تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "امام" کا کام شیعوں کو ہدایت کی تعلیم دینا نہیں بلکہ گمراہ کرنا ہے، کیونکہ "فانصب" بفتح صاد امام کے نزدیک غلط اور تحریف شدہ ہے لیکن وہ اپنے شیعوں کو حکم فرماتے ہیں کہ غلط کو غلط ہی پڑھو۔ ظاہر ہے کہ ان کے سارے لوگوں کو تو یہ علم نہیں ہوگا کہ ہمیں غلط کو غلط سمجھ کر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، بہت سے شیعہ ایسے بھی ہوں گے جو اس تحریف شدہ لفظ کو ارشادِ خداوندی سمجھ کر پڑھیں گے اور غلط الفاظ کو کلام الٰہی سمجھ کر غلط پڑھنا یقینا افتراء علی اللہ ہے، گویا فاضل مترجم کے نزدیک ان کے "امام" نے شیعوں کو حکم فرمایا کہ وہ قیامت تک افتراء علی اللہ کرتے رہیں، اور ضلالت و گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہیں۔

چہارم: فاضل مترجم کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اپنے "امام" کے کیسے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ "امام" خواہ کیسا ہی مہمل اور خلاف عقل و شرع حکم صادر فرمائیں یہ بے چون و چرا اس کی تعمیل کرتے ہیں، اگر امام حکم دے کہ قرآن کو غلط کہہ کر کافر بنو اور اسے غلط پڑھ کر خدا پر افتراء کرو تو یہ اس کی تعمیل کو بھی حاضر ہیں، ان کے نزدیک حکم امام کے مطابق قرآن کریم کو جھٹلانا اور اسے غلط اور محرف کہنا تو جائز ہے مگر امام کے حکم سے سرتابی ناجائز ہے۔ ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔

تعجب ہوتا ہے کہ فاضل مترجم کے ہم مسلک راویوں نے کیسی غلط اور زندیقانہ روائتیں "اماموں" کی طرف منسوب کر کے انہیں قرآن سے بڑھ کر تقدس کا درجہ دیدیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

امام تو لوگوں کو ہدایت کی دعوت دیا کرتے ہیں۔ ایسی گمراہ کن تعلیم "امام" کی طرف منسوب کرنا بدترین تہمت ہے، یقیناً ایسی روایتیں زندیقوں نے خود گھڑ کر انہیں تقدس کا درجہ دینے کے لئے "اماموں" کی طرف منسوب کر دیا ہے، اماموں کا دامن اس کفر و زندقہ سے یقیناً پاک ہے، لیکن فاضل مترجم ایسی زندیقانہ روایتوں اور ان کے راویوں پر قرآن سے بڑھ کر ایمان رکھتے ہیں، ان کے نزدیک خدا اور رسول کے فرمودات کی اتنی اہمیت نہیں جتنی کہ ان روایتوں کی جو زنادقہ نے گھڑ کر "اماموں" سے منسوب کر ڈالی۔ چنانچہ وہ ان روایتوں کو صحیح مان کر قرآن کو غلط کہنے کی جسارت کرتے ہیں۔

پانچواں اقرار

قرآن کریم میں حق تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (الحجر: ۹)

بیشک ہم ہی نے تو قرآن نازل کیا اور ہم ہی تو اس کے نگہبان ہیں۔

(ترجمہ: فرمان علی)

یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے عقیدہ کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو قرآن کریم کو تحریف شدہ کہتے ہیں کیونکہ جب حق تعالےٰ شانہٗ اس کتاب مقدس کی حفاظت و نگہبانی کا وعدہ فرما چکے ہیں تو ——————

——————— یہ کہنا وعدہ الٰہی کی تکذیب ہے کہ قرآن میں ردّ و بدل کر دیا گیا۔

جناب مترجم سے یہ تو نہ ہو سکا کہ اس ارشاد خداوندی کو برحق سمجھ کر تحریف قرآن کے عقیدے سے توبہ کر لیتے اور امام کی طرف تحریف قرآن کی جو روائیتیں منسوب کی گئی ہیں ان کو دروغ باطل اور کذب و افترا تصور کرتے، لیکن جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے ان کے نزدیک امام کی طرف منسوب کی گئی روایات کی قدر و قیمت فرمودۂ خداوندی سے بڑھ کر ہے اس لئے انہوں نے اس آیت کریمہ کی ایسی تاویل کر ڈالی جس سے ان کے امام کے عقیدۂ تحریف پر کوئی آنچ نہ آئے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ذکر سے ایک تو قرآن مراد ہے۔ تب اس کی نگہبانی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کو ضائع و برباد ہونے نہ دیں گے۔ پس اگر تمام دنیا میں ایک نسخہ بھی قرآن مجید کا اپنی اصلی حالت پر باقی ہو تب بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ محفوظ ہے ——— اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ تک قرآن مجید میں کیا کیا تغیرات ہو گئے ہیں کم سے کم اس میں تو شک ہی نہیں کہ ترتیب بالکل بدل دی گئی۔ اور یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر ہر لفظ کو محفوظ رکھیں گے۔ کیونکہ اس زمانے میں چھاپہ خانوں کی طرف سے روزانہ سینکڑوں ہزاروں اوراق

قرآن کے برباد کئے جاتے ہیں۔

دوسرے ذکر سے مراد جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تب مطلب یہ ہوگا کہ کفار کے شر سے خدا آپ کو محفوظ رکھے گا۔ (ص ۴۶۹)

فاضل مترجم کی مندرجہ بالا عبارت میں چند باتیں قابل توجہ ہیں

اول یہ کہ ان کے نزدیک قرآن کریم کی حفاظت و نگہبانی کا جو وعدہ اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ قرآن کریم جو شرقاً وغرباً مسلمانوں کے پاس موجود ہے اور جس کے ہزاروں لاکھوں حافظ دنیا کے ہر خطے میں ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ اور وعدۂ الٰہی کے مطابق انشاء اللہ تعالےٰ قیامت تک رہیں گے، وہ تغیر و تبدل سے محفوظ ہے، بلکہ ان کے نزدیک حفاظتِ قرآن کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کریم کا ایک "صحیح نسخہ" اپنی اصلی حالت پر رہے گا۔ اس "ایک صحیح نسخہ" سے ان کی مراد غالباً وہ نسخہ ہے جو امام غائب کے ساتھ غار میں محفوظ ہے۔ چنانچہ اصول کافی کتاب فضل القرآن میں ہے۔

عن سالم بن سلمة قال قرأ	سالم بن سلمہ کہتے ہیں کہ میرے سامنے
رجل علی ابی عبد اللہ	ایک شخص نے امام جعفر صادقؓ کی
علیہ السلام وانا استمع	خدمت میں قرآن کریم پڑھا جس کے
حروفا من القرآن لیس	الفاظ ایسے تھے جو اس قرآن میں نہیں
علی ما یقرءھا الناس	جسے لوگ پڑھتے ہیں۔ امام نے فرمایا
فقال ابو عبد اللہ علیہ	کہ ابھی اس قرآن کے پڑھنے سے باز

السلام کفّ عن هذه القراءة . اقرأ کما یقرأ الناس حتی یقوم القائم فاذا قام القائم قرأ کتاب الله عزوجل علی حدّہ ۔

واخرج المصحف الذی کتبه علیّ وقال اخرجه علیّ الی الناس حین فرغ منه وکتبه . فقال لهم هذا کتاب الله عزوجل کما انزله الله علی محمد صلی الله علیه وسلم وقد جمعته من اللوحین فقالوا هو ذا عندنا مصحف جامع فیه القرآن لا حاجة لنا فیه . فقال اما والله ما ترونه بعد یومکم هذا ابدًا انما کان علیّ ان اخبرکم حین جمعته لتقرؤوه ۔

رہو ۔ بلکہ اسی طرح پڑھو جس طرح لوگ پڑھتے ہیں ، جب تک کہ امام مہدی کا ظہور نہ ہو ۔ جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو کتاب اللہ کو اپنی حد پر پڑھیں گے ۔

اور امام جعفرؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لکھا ہوا قرآن نکالا ۔ اور فرمایا کہ حضرت علیؓ اس کو لکھ کر فارغ ہوئے تو اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا یہ ہے وہ قرآن جو اللہ تعالٰے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا ۔ میں نے اس کو دو لوحوں سے جمع کر لیا ہے ۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس جامع قرآن موجود ہے ہمیں تمہارے قرآن کی ضرورت نہیں آپؓ نے فرمایا کہ بخدا ! تم اس قرآن کو آج کے بعد کبھی نہ دیکھ سکو گے ۔ مجھ پر لازم تھا کہ تمہیں اپنے جمع کردہ قرآن سے آگاہ کروں تاکہ تم اسے پڑھو ۔ (اصول کافی ص ۶۳۳ ج۲ مطبوعہ تہران ۱۳۸۸ھ)

ملا باقر مجلسی، حق الیقین میں لکھتے ہیں:۔

پس بخواند قرآن را بنحوی کہ حق تعالےٰ بر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل ساختہ بے آنکہ تغییر یافتہ باشد و تبدیل یافتہ باشد چنانچہ در قرآن ہائے دیگر شد (حق الیقین ص ۳۵۸ مطبوعہ طہران ۱۲۵۴ شمسی ہجری)

پس امام مہدی قرآن کو اس طرح پڑھیں گے کہ حق تعالےٰ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا بغیر اس کے کہ اس میں کوئی تغیر وتبدل ہوا ہو۔ جیسا کہ دوسرے قرآنوں میں تغیر وتبدل ہوگیا ہے

فاضل مصنف کے نزدیک "قرآن کریم کا ایک صحیح نسخہ" جو دنیا میں موجود ہے اس سے یہی غار والا قرآن مراد ہے جو امام مہدی کے ساتھ غائب ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں قرآن کریم کا کوئی صحیح نسخہ ان کے نزدیک موجود نہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم ہی اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہے اس لئے جب قرآن غائب ہے تو گویا اسلام کی بنیاد ہی غائب ہے، جن مجوسی اور یہودیوں منافقوں نے تحریف قرآن کی روائتیں گھڑ گھڑ کر اماموں کی طرف منسوب کیں ان کا مقصد و مدعا بھی یہی تھا کہ اسلام کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں آسانی ہو۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے ان کے تمام مکائد کو خاک میں ملا دیا۔ لیکن فاضل مترجم اور ان کے ہم عقیدہ حضرات بدستور انہی مجوسیوں اور یہودیوں کی تقلید پر فخر کر رہے ہیں۔

دوم: فاضل مترجم لکھتے ہیں:۔

"اس (آیت) کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں (قرآن مجید میں) کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ تک قرآن مجید میں کیا کیا تغیرات ہو گئے ہیں۔"

ایک مسلمان کا تو یہی عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کو جس طرح ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے وہ بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے جوں کا توں محفوظ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ اور یہ ایک ایسی صداقت ہے۔ جسے انصاف پسند غیر مسلم بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ واقعہ یہ ہے جو شخص کتاب اللہ کو محرف و مبدل مانتا ہے وہ کتاب اللہ پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور نہ اسلام میں اس کا کوئی حصہ ہے، کیونکہ قرآن کریم کو تحریف شدہ فرض کر لینے کے بعد قرآن کریم کے کسی حرف پر اور دینِ اسلام کی کسی بات پر اعتماد نہیں رہ جاتا ؟ ۔ اصول کافی کے محشی علامہ علی اکبر غفاری کے بقول :

لانه لو كان تطرق التحريف	کیونکہ اگر قرآن کے الفاظ میں تحریف
في الفاظ القرآن	اور تغیر و تبدل فرض کر لیا جائے تو
لم يبق لنا اعتماد على	ہمارے لئے اس کے کسی حرف
شيء منه. اذ على هذا	پر اعتماد و ایمان کی کوئی صورت نہیں
يحتمل كل آية منه	رہ جاتی کیونکہ اس صورت میں قرآن
ان تكون محرفة ومغيرة	کی ہر آیت میں یہ احتمال ہے کہ
وتكون على خلاف ما انزله	وہ تحریف شدہ اور تبدیل شدہ ہو

اور ما انزل اللہ کے خلاف ہو۔ پس قرآن ہمارے لئے حجت نہیں رہ جاتا اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے اور قرآن کی پیروی کی تاکید و وصیت اور متعارض اخبار کو قرآن پر پیش کرنے کی وصیت بے کار ہو کر رہ جاتی ہے

الله. فلا يكون القرآن حجة لنا. تنتفي فائدته. وفائدة الامر باتباعه والوصية به. وعرض الاخبار المتعارضة عليه

(حاشیہ اصول کافی ص ۲۲۱ ج ۲)

بات معقول ہے جو شخص، قرآن کریم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ اس میں تغیر و تبدل کر دیا گیا ہے اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہے اور قرآن کے ترجمہ و تفسیر پر بھی قلم اٹھائے اس سے بڑھ کر "عقلمند" کون ہو سکتا ہے۔ فاضل مترجم نے یہ تو صراحت کر دی کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے تغیرات ہوئے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم کو تغیر و تبدل سے پاک نہیں سمجھتے ہیں، نہ قرآن کریم کے ایک ایک حرف منزل من اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن فاضل مترجم نے یہ تشریح نہیں کی کہ قرآن کریم میں کیا تغیرات ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل ان کے مسلک کی دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ قرآن کریم میں پانچ قسم کی تبدیلی کر دی گئی:

۱۔ قرآن کریم کا بہت سا حصہ نعوذ باللہ ساقط کر دیا گیا

۲۔ بہت سی باتیں اپنی طرف سے ملا دی گئیں۔

۳۔ الفاظ بدل دئے گئے۔

۴۔ حروف بدل دئے گئے۔

۵۔ آیتوں، سورتوں اور کلمات کی ترتیب بدل دی گئی۔

چنانچہ علامہ حسین بن محمد تقی نوری طبرسی اپنی کتاب " فصل الخطاب فی تحریف کتاب ربّ الارباب " میں، جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے، لکھتے ہیں :-

الامیر المؤمنین علیہ السلام قرآنا مخصوصًا جمعہ بنفسہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وعرضہ علی القوم فاعرضوا عنہ، فحجبہ عن اعینھم وکان عند ولدہ علیہ السلام یتوارثونہ امام عن امام کسائر خصائص الامامۃ وخزائن النبوۃ وھو عند الحجۃ عجل اللہ فرجہ. یظھرہ للناس بعد ظھورہ ویأمرھم بقراءتہ وھو مخالف لھذا القرآن من حیث التالیف وترتیب السور والآیات بل الکلمات ایضًا ومن جھۃ الزیادۃ والنقیصۃ. وحیث ان الحق مع علی علیہ السلام وعلی مع الحق ففی القرآن الموجود

امیر المؤمنین علیہ السلام کا ایک قرآن مخصوص تھا جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خود جمع کیا تھا. اور اس کو صحابہ کے سامنے پیش کیا مگر ان لوگوں نے توجہ نہ دی لہٰذا آپ نے اس قرآن کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا. اور وہ قرآن آپ کی اولاد کے پاس رہا ایک امام سے دوسرے امام کو میراث میں ملتا رہا جیسے دیگر خصائص امامت اور خزائن نبوت. اور اب وہ قرآن کریم امام مہدی کے پاس ہے، خدا ان کی مشکل جلد آسان کرے. وہ اپنے ظاہر ہونے کے بعد اس قرآن کو ظاہر کریں گے اور لوگوں کو ان کی تلاوت کا حکم دیں گے. اور وہ قرآن اس قرآن موجود کے خلاف ہے سورتوں اور آیتوں بلکہ کلمات کی ترتیب میں بھی، اور کمی بیشی کے لحاظ سے بھی، چونکہ

تغییر من جھتین وھو المطلوب ۱ ص۷۹

حق علی کے ساتھ ہے اور علی حق کے ساتھ ہیں لہٰذا ثابت ہوگیا کہ قرآن موجود میں دونوں اعتبار سے تحریف ہے اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

احتجاج طبرسی میں ص۱۱۹ سے ص۱۳۱ تک ایک طویل روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کی گئی ہے کہ ایک زندیق نے آپ کی خدمت میں قرآن کریم پر کچھ اعتراضات کئے آپ نے اس کے جواب میں بار بار اس بات کو دہرایا کہ قرآن میں منافقوں نے تحریف کر دی ہے۔ اس کے چند اقتباسـں ملاحظہ ہوں۔

الف" زندیق کا ایک اعتراض یہ تھا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے[1] "فان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامٰی فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنٰی وثلاث ورباع " (النسآء : ۳) اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ نکاح کرکے تم یتیم (کی رکھ رکھاؤ) میں انصاف نہ کرسکو گے تو اور عورتوں سے اپنی مرضی کے موافق دو دو اور تین تین اور چار چار نکاح کرو" (ترجمہ فرمان علی)

زندیق نے کہا کہ آیت کی شرط و جزا کے درمیان کوئی جوڑ نہیں یہ کہنا کہ اگر یتیموں کے حق میں انصاف نہ کرسکو تو دو دو تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کرلو۔ بالکل بے جوڑ بات ہے۔ حضرت امیرؓ اس اعتراض کے

---

[1] قرآن کریم میں "فان خفتم" نہیں" وان خفتم" ہے زندیق تو خیر زندیق تھا وہ قرآن کو کیوں صحیح پڑھتا تعجب ہے کہ جناب امام نے بھی اپنے جواب میں آیت کو غلط ہی نقل کیا۔

جواب میں فرماتے ہیں:

واما ظهور قولك على تناكر قوله فان خفتم ان لا تقسطوا فى اليتامى فانكحوا ما طاب لكم من النساء وليس يشبه القسط فى اليتامى نكاح النساء ولا كل النساء ايتاما فهو بما قدمت ذكره من اسقاط المنافقين من القرآن وبين القول فى اليتامى وبين نكاح النساء من الخطاب والقصص اكثر من ثلث القرآن. وهذا ما اشبهه مما ظهرت حوادث المنافقين فيه لاهل النظر والتامل ووجدا المعطلون واهل الملل المخالفة للاسلام

اور تجھ کو جو اللہ تعالےٰ کے ارشاد "وان خفتم ان لا تقسطوا فى اليتامىٰ فانكحوا ما طاب لكم من النساء" میں اشکال ہوا ہے کہ یتیموں کے حق میں انصاف کرنا عورتوں سے نکاح کرنے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا اور نہ ساری عورتیں یتیم ہوتی ہیں پس اس کی وجہ وہی جو میں پہلے تجھ سے ذکر کر چکا ہوں کہ منافقوں نے قرآن میں سے بہت کچھ نکال ڈالا — فى اليتامىٰ اور فانكحوا کے درمیان بہت سے احکام اور قصے تھے. جو تہائی قرآن (یعنے دس پارے) سے زیادہ تھے. وہ سب نکال ڈالے اس وجہ سے بے ربطی ہو گئی[1] منافقوں کی اس قسم کی تحریفات

---

[1] آیت کریمہ کے مضمون میں کوئی بے ربطی نہیں جیسا کہ جناب فرمان علی صاحب کے ترجمہ ہی سے واضح ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کر سکو گے تو انکے بجائے دوسری عورتیں کچھ کم نہیں چاہو تو دو دو، تین تین چار چار تک نکاح کر سکتے ہو — تعجب ہے کہ جناب امام زندیق کے اس معمولی اعتراض سے لاجواب ہو جاتے ہیں اور انہیں قرآن کریم پر تحریف کی تہمت دھرنے کے سوا کوئی جواب نہیں سوجھتا. کاش جناب امام نے جناب فرمان علی کا ترجمہ ہی دیکھ لیا ہوتا

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

مساغاً للقدح فی القرآن (ص ۱۲۸۰)	ے، جو اہل نظر و تامل کو ظاہر ہو جاتی ہیں بے دینوں اور اسلام کے مخالفوں کو قرآن پر اعتراض کرنے کا موقعہ مل گیا۔ لہ

ب: زندیق کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام نبیوں پر بیان کی ہے حالانکہ قرآن میں جتنی آپ کی تعریف ہے اس سے کہیں بڑھ کر آپ کی توہین و تنقیص کی گئی ہے اور ایسی تنقیص کسی اور نبی کی نہیں جناب امیر نے زندیق کے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے زندیق کو بتایا کہ :-

والذی بدا فی الکتاب من الازدراء علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ من فریة الملحدین	کتاب اللہ میں جو برائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے یہ ملحدوں کی افترا ہوتی ہے یعنے جامعین قرآن کی بڑھائی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ، تو نہیں قرآن کو محرف کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مگر ہم حضرت امیر کرم اللہ وجہہ کے دامن کو اس سے پاک سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک یہ ان پر اتہام ہے اور اس کے مجرم وہ زندیق ہیں جنہوں نے تحریف قرآن کی دو ہزار سے زیادہ روایتیں گھڑ گھڑ کر حضرت امیرؓ اور دیگر اکابر کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

لہ یہ بھی خوب کہی، قرآن کریم کو صحیح ماننے سے تو بے دینوں اور مخالفین اسلام کو قرآن پر اعتراض کا موقعہ مل جاتا ہے لیکن قرآن کو تحریف شدہ کہنے سے گویا تمام اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ قرآن کو غلط کہہ دینے سے نہ قرآن باقی رہتا ہے نہ دین اسلام۔ کسی چیز کا وجود ہو تو کوئی اس پر اعتراض کرے۔ جناب امام نے اعتراض سے بچنے کیلئے قرآن ہی کو غلط اور تحریف شدہ فرما دیا۔ گویا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ امام کے نام پر ایسی روایتیں گھڑنے والے کتنے ذہین تھے۔ جنہوں نے امام کی آڑ لے کر قرآن اور اسلام کی جڑ پر تیر چلا دیا۔

(ص ۱۴۰) ہوتی ہے۔ نعوذ باللہ) [1]

ج: اس زندیق کا ایک اعتراض یہ تھا کہ قرآن کریم میں انبیاء کرام کی لغزشوں کو تو ان کے ناموں کی صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لیکن منافقوں اور ظالموں کے ناموں کی کہیں صراحت نہیں کی گئی۔ انہیں گول مول الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جناب امیر نے اس کا جو نفیس جواب دیا وہ یہ تھا۔

ان الکنایة عن اصحاب الجرائر العظیمة من المنافقین فی القرآن لیست من فعله تعالیٰ وانما فعل المغیرین والمبدلین الذین جعلوا القرآن عضین واعتاضوا الدنیا بالدین (ص ۱۲۴)

بڑے بڑے مجرموں اور منافقوں کو قرآن میں جو کنایہ کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں بلکہ ان تحریف وتبدیل کرنے والوں کا فعل ہے جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اور دین کے بدلے دنیا وصول کی۔

د: اسی روایت میں ہے کہ جناب امیر نے زندیق سے فرمایا:۔

ولو شرحت لك ما اسقط و حرف وبدل فما یجری هٰذی المجری لطال و ظهر ما تحظر التقیه اظهارہٗ

اگر میں تیرے سامنے ان تمام آیتوں کی تفصیل بیان کروں جو قرآن سے نکال دی گئیں، جن میں تحریف کر دی گئی اور جن کو تبدیل کر دیا گیا

---

[1] یہ بھی امام کا کمال ظلم ہے قرآن کریم کی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص کی گئی ہو مگر امام کی طرف ایسی روایتیں منسوب کرنے والوں کے دل اندھے تھے انہیں قرآن کریم پر امام کی زبانی افتراء کرنا مقصود تھا اور بس۔

(ص: ۱۲۸) نیز اسی طرح کی جو اور کاروائیاں کی گئیں تو بہت لمبی بات ہو جائے گی اور تقیہ جس چیز کے اظہار سے مانع ہے وہ ظاہر ہو جائے گی۔

نیز اسی روایت میں یہ بھی فرمایا:۔

ولیس یسوغ مع عموم التقیہ التصریح باسماء المبدلین ولا الزیادۃ فی اٰیاتہ علیٰ ما اثبتوہ من تلقائھم فی الکتاب لما فی ذٰلک من تقویہ حجج اھل التعطیل والکفر والملل المنحرفۃ عن ملتنا وابطال ھذا العلم الظاھر الذی استکان لہ الموافق والمخالف (ص ۱۲۵)	اور ضرورتِ تقیہ کی بناء پر اس کی گنجائش نہیں کہ میں ان لوگوں کے نام بتاؤں جنہوں نے قرآن میں تبدیلی کر ڈالی اور نہ میں اس زیادتی کو بتا سکتا ہوں جو انہوں نے اپنی طرف سے کتاب اللہ میں کی کیونکہ اس سے اہلِ تعطیل و کفر اور ملل مخالفہ اسلام ـــــ کی تائید ہوتی ہے اور اس علم ظاہر کا ابطال ہوتا ہے جس کے موافق اور مخالف سب قائل ہیں[1]۔

[1] یہ بھی خوب کہی۔ قرآن کریم کو غلط اور محرف کہنے اور حاملینِ قرآن کو منافق کہنے سے تو تقیہ مانع نہیں۔ نہ اس سے اہل کفر کی تائید ہوتی ہے نہ علم ظاہر کا ابطال ہوتا ہے لیکن اس سے تقیہ مانع ہے کہ غلط مقامات کی نشاندہی ہی کر دی جائے تاکہ باقی قرآن تو قابل اعتماد ہو۔ مگر جناب امام کے معصوم تقیہ کی روایت گھڑنے والوں کا مقصد تو پورے قرآن کو مشکوک ٹھہرانا تھا جس میں وہ ناکام رہے۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

و۔ نیز اسی روایت میں ہے :-

لو علم المنافقون لعنهم الله من ترك هٰذه الايات التى بينت لك تاويلها لاسقطوها مع ما اسقطوا منه ۔

(ص ۱۲۸)

اگر منافقوں کو ۔ خدا ان کو لعنت کرے ۔ معلوم ہو جاتا کہ ان آیتوں کے باقی رکھنے میں کیا خرابی ہے جن کی تاویل میں نے بیان کی تو جس طرح اور آیتیں نکالی تھیں ان آیتوں کو بھی نکال دیتے

ز: اسی روایت میں ہے کہ جناب امیر نے زندیق کے سامنے جمع قرآن کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ۔

ثم دفعهم الاضطرار بورود المسائل عما لا يعلمون تاويله الى جمعه وتاويله وتضمينه من تلقائهم ما يقيمون به دعائم كفرهم فصرح مناديهم من كان عندهٗ شيء من القرآن فلياتنا به ووكلوا تاليفهٗ ونظمه الى بعض من وافقهم الى معاداة اولياء الله فالفه على اختيارهم

(ص ۱۳۰)

پھر جب ان منافقوں سے وہ مسائل دریافت کئے گئے جن کو وہ نہیں جانتے تھے تو وہ مجبور ہوئے کہ قرآن کو جمع کریں اس کی تفسیر کریں ۔ اور قرآن میں وہ باتیں اپنی جانب سے بڑھائیں جن سے وہ اپنے کفر کے ستون قائم کریں ۔ لہٰذا ان کے منادی نے اعلان کیا کہ جس کے پاس کوئی حصہ قرآن کا ہو وہ ہمارے پاس لائے اور ان منافقوں نے قرآن کی جمع و ترتیب کا کام اس شخص کے سپرد کیا جو دوستانِ خدا کی دشمنی میں ان کا ہم خیال تھا اور اس نے ان کی پسند کے موافق قرآن کو جمع کیا ۔

ج : جناب امیر نے اس زندیق کو یہ بھی بتایا کہ :

وزاد وافیہ ما ظھر تناکرہ وتنافرہ (ص، ۱۳۰)	انہوں نے قرآن میں وہ عبارتیں بڑھا دیں۔ جن کا خلاف فصاحت اور قابل نفرت ہونا ظاہر ہے۔

ز : نیز یہ بھی بتایا کہ :

انھم اثبتوا فی الکتاب ما لم یقلہ اللہ لیلبسوا علی الخلیقۃ (ص - ۱۲۵)	ان منافقوں نے قرآن میں وہ باتیں درج کر دیں جو اللہ تعالٰے نے نہیں فرمائی تھیں۔ تاکہ مخلوق کو فریب دے سکیں۔

یہ ہیں فاضل مترجم کے عقیدے کے مطابق وہ تغیرات جن کی طرف موصوف نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ " یہ ظاہر ہے کہ کہ اس زمانے تک قرآن مجید میں کیا کیا تغیرات ہوئے ہیں "!

سوم : فاضل مترجم لکھتے ہیں :

" کم سے کم اس میں تو شک ہی نہیں کہ ترتیب تو بالکل بدل دی گئی "۔

ان کا یہ دعوٰی ایک اور ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ قرآن کریم کے غیر مبدل محفوظ اور منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے ورنہ کوئی مسلمان جو قرآن کریم کو خدا کی کتاب مانتا ہو اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کی ترتیب بدل دی گئی :

علامہ نصیرالاجتہادی کا ارشاد:

ہمارے دور کے ایک ممتاز شیعہ رہنما جناب نصیرالاجتہادی صاحب نے ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ کو شام غریباں کی مجلس سے خطاب کرتے ہوئے ضمناً "قرآن کریم کی عصمت" پر بھی اظہار خیال فرمایا ان کی یہ تقریر پاکستان ٹیلی وژن سے ٹیلی کاسٹ کی گئی۔ راقم الحروف کے پاس اس کی کیسٹ محفوظ ہے موصوف نے فرمایا:

"قرآن جو ہے وہ الحمدللہ سے لے کر والناس تک صدق ہے عصمت ہے، طہارت ہے، یعنی معصوم ہے، اور کتابوں میں تحریف ہوئی توراۃ میں، انجیل میں، تحریف ہے۔ لیکن قرآن میں کوئی تحریف نہیں، اور معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن عہدِ نبوت سے لے کر آج کے دن تک اور قیامت کے دن تک غیر محرف ہے، اس میں کوئی تحریف نہیں، کوئی ترمیم نہیں، کوئی کمی نہیں، کوئی زیادتی نہیں، انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (ہم نے قرآن اتارا ہے ہم اس کی حفاظت کریں گے) لہٰذا ہر مسلمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن جیسا عہدِ نبوت میں تھا ویسے ہی آج ہے۔ جیسے آج ہے ویسے قیامت تک رہے گا کیونکہ وعدۂ رب کریم ہے، جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ تو قرآن میں نہ کمی ہے نہ زیادتی ہے، نہ تحریف ہے۔

نہ ترمیم ہے پہلے جتنے پارے تھے اتنے ہی آج بھی پارے ہیں. کوئی فرق نہیں، تیس پارے ایک سو چودہ سورے اس میں پہلے بھی تھے آج بھی ہیں. یہودی مستشرقین چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کریں اور قرآن کے بارے میں عقائد متزلزل کریں. لیکن میں کہتا ہوں کہ اس یہودی سازش میں نہ آنا قرآن جو ہے وہ وہی تیس پارے ہیں. کوئی فرقہ ایسا نہیں اسلام کا جس کا قرآن الگ ہو، جدا ہو، فقہ الگ ہو سکتی ہے، تعبیر سنت الگ ہو سکتی ہے، تعبیر حدیث الگ ہو سکتی ہے، ترجمہ الگ ہو سکتا ہے، قرآن کسی کا الگ نہیں، سب کا قرآن ایک ہے. تو یہودی مستشرقین کی سازش پر نہ جاؤ کہتے ہیں کہ کسی کے پاس چالیس پارے ہیں، کسی کے پاس ۳۰ پارے ہیں، ارے پارے چھپے ہوئے ہیں چھپے ہوئے نہیں ہیں، قرآن حکیم جو ہے وہ معصوم ہے"

جناب نصیر الاجتہادی صاحب کا یہ اعلان حق، اگر بربنائے تقیہ نہیں تو لائق صد ستائش ہے. موصوف کے اس ارشاد کے مطابق وہ تمام لوگ جنہوں نے تحریف قرآن کا افسانہ بطور عقیدہ اپنی کتابوں میں درج کیا وہ سب یا تو یہودی تھے یا یہودیوں کے نقیب تھے. مثلاً:-

لف: سید فرمان علی شاہ صاحب جنہوں نے زیر نظر ترجمہ میں تحریف قرآن کا عقیدہ درج کیا.

ب : وہ تمام شیعہ علماء اور مجتہد، جنہوں نے اس ترجمہ کی تصدیق کی۔
ج : "پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ"، جس نے یہ ترجمہ شائع کیا۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ بھی اس ترجمہ پر اعتماد کریں گے قرآن کے بارے میں ان کا عقیدہ متزلزل ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس یہودی سازش کو ناکام بنایا جائے۔ اس ترجمہ کو ضبط کر کے اس کے ناشرین کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔

اسی طرح جن لوگوں نے اپنی کتابوں میں تحریف قرآن کی روایتیں نقل کر کے ان کی تصدیق کی اور ان کے مطابق تحریف قرآن کا عقیدہ ظاہر کیا وہ بھی موصوف کے بقول یہودی سازش کا شکار ہیں۔

واضح رہے کہ شیعہ کی کتابوں میں تحریف قرآن کی دو ہزار سے زیادہ روایتیں اماموں کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اور علماء شیعہ نے تین باتوں کا کھل کر اقرار کیا ہے

اول : یہ روایتیں متواتر ہیں
دوم : یہ کہ قرآن کریم کی تحریف پر صریح ہیں۔
سوم : یہ کہ شیعوں کا عقیدہ ان روایات کے مطابق یہی ہے کہ قرآن (نعوذ باللہ) تحریف شدہ ہے۔ چنانچہ "فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب" سے، جو تحریف قرآن کے ثبوت میں ایک شیعی عالم علامہ حسین بن محمد تقی نوری طبرسی کی تالیف ہے، چند حوالے یہاں نقل کئے جاتے ہیں :

الف : الدلیل الحادی عشر : تحریف قرآن کی گیارہویں دلیل : وہ الاخبار الکثیرۃ المعتبرۃ الصریحۃ بہت سی روایات ہیں۔ جو معتبر ہیں

فی وقوع السقط ودخول النقصان فی الموجود من القرآن زیادۃً علیٰ مامر فی ضمن الادلۃ السابقۃ، وانہ اقل عن تمام ما نزل اعجازًا علیٰ قلب سید الانس والجان من غیر اختصاصہا بآیۃ او سورۃ وھی مفرقۃ فی الکتب المتفرقۃ التی علیھا المعول عند الاصحاب جمعت ما عثرت علیھا فی ھٰذا الباب (ص ۲۱۱)	اور قرآنِ موجود میں کمی اور نقصان کے واقع ہونے پر صراحتًا دلالت کرتی ہیں۔ علاوہ ان روایات کے جو گذشتہ دلائل کے ضمن میں گذرچکی ہیں۔ یہ روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موجودہ قرآن مقدار نزول سے بہت کم ہے اور یہ کمی کسی آیت یا سورہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اور یہ روایات ان متفرق کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن پر ہمارے مذہب کا اعتماد ہے میں نے اس باب میں وہ روایات جمع کردی ہیں جو میری نظر سے گذریں۔

اس کے بعد مصنف نے بکثرت شیعہ کتابوں کے نام گنائے ہیں اور روایات تحریف کے انبار جمع کئے ہیں۔

ب: الدلیل الثانی عشر: الاخبار الواردۃ فی الموارد المخصوصۃ من القرآن الدالۃ علیٰ تغییر بعض الکلمات والآیات والسور باحدی السور المتقدمۃ	تحریف قرآن کی بارہویں دلیل: وہ احادیث ہیں جو قرآن کے مخصوص مقامات کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور جو کلمات، آیات اور سورتوں کے تغیر و تبدل پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ روایات بہت ہی زیادہ ہیں۔

وهي كثيرة جدا حتى قال السيد نعمت الله الجزائري في بعض مؤلفاته كما حكي عنه ان الاخبار الدالّة على ذٰلك تزيد على الفي حديث وادعى استفاضتها جماعة كالمفيد والمحقق الداماد والعلامة المجلسي وغيرهم: بل الشيخ ايضا صرح في التبيان بكثرتهما بل ادعى تواترها جماعة ياتي ذكرهم في اٰخر المبحث ونحن نذكر منها مايصدق دعواهم

واعلم ان تلك الاخبار منقولة من الكتب المعتبرة التي عليها معول اصحابنا في اثبات الاحكام والاثار النبوية

(ص ٢٢٧ ومابعد)

حتی کہ سید نعمت اللہ الجزائری نے اپنی بعض تصانیف میں کہا ہے جیسا کہ ان سے نقل کیا گیا ہے کہ جو روایات تحریفِ قرآن پر دلالت کرتی ہیں وہ دو ہزار سے بھی زیادہ ہیں اور ایک جماعت نے ان کے مستفیض ہونے کا دعوٰی کیا ہے جیسے مفید، محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہ: بلکہ شیخ نے تبیان میں بھی تصریح کی ہے کہ یہ روایات بہت زیادہ ہیں۔ بلکہ ایک جماعت نے، جن کا ذکر آخر بحث میں آئے گا۔ ان کے متواتر ہونے کا دعوٰی کیا ہے اور ہم ان روایات میں سے اتنی مقدار ذکر کریں گے۔ جس سے ان حضرات کے دعوی کی تصدیق ہوتی ہے۔

جاننا چاہیئے کہ تحریف کی یہ روائتیں ان معتبر کتابوں سے نقل کی گئی ہیں جن پر ہمارے اصحاب کا اعتماد ہے احکام شرعیہ کے ثابت کرنے اور آثار نبویہ کے نقل کرنے میں۔

ج : نیز علامہ مجلسی کا قول نقل کیا ہے کہ :

وعندی ان الاخبار فی ھذا الباب متواترة معنی وطرح جمیعھا یوجب رفع الاعتماد عن الاخبار رأسًا، بل ظنی ان الاخبار فی ھٰذا الباب لا یقصر عن اخبار الامامة فکیف یثبتونھا بالخبر۔

(ص ۔ ۲۲۹)

میرے نزدیک تحریف قرآن کی روائتیں معناً متواتر ہیں اور ان سب روایتوں کو ترک کر دینے سے ہماری تمام کی تمام احادیث سے یکسر اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ تحریف قرآن کی روائتیں مسئلہ امامت کی روائتوں سے کسی طرح کم نہیں، پس اگر تحریف قرآن کی روائیتوں کا اعتبار نہیں تو مسئلہ امامت کو روایتوں سے کیسے ثابت کرتے ہیں۔

د : فصل الکتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے :

قال السید المحدث الجزائری فی الانوار ما معناہ ان الاصحاب قد اطبقوا علیٰ صحة الاخبار المستفیضة بل المتواترة الدالة بصریحھا علیٰ وقوع التحریف فی القرآن کلامًا ومادة واعرابًا والتصدیق بھا۔

(ص ۳۰)

سید محدث جزائری نے انوار میں لکھا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اصحاب امامیہ نے ـــــ اتفاق کیا ہے مستفیض بلکہ متواتر روایات کی صحت پر جو صراحتاً قرآن کے محرف ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ تحریف کلام میں بھی ہے، مادہ میں بھی، اور اعراب میں بھی اور اتفاق کیا ان روایات کی تصدیق پر۔

مندرجہ بالا حوالوں سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوئے۔

۱: شیعہ کتابوں میں دو ہزار سے زیادہ روائتیں آئمہ معصومین کی طرف منسوب کی گئی ہیں کہ قرآن کریم (نعوذ باللہ) تحریف شدہ ہے اوران کے مقابلے میں آئمہ معصومین کی ایک روایت بھی نہیں جس کا مضمون یہ ہو کہ قرآن کریم تحریف سے پاک ہے اور جوں کا توں محفوظ ہے۔

۲۔ دو ہزار روائیتیں اکابر علمائے شیعہ کے نزدیک متواتر ہیں۔ جو ان کی معتبر کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں:

۳۔ یہ روایات باتفاق علماء شیعہ صحیح ہیں۔

۴۔ اوریہ روائتیں تحریف قرآن پر نص صریح ہیں۔

۵۔ یہ روایات نہ صرف روایات امامت کے ہم پلہ ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہیں، پس اگر ان پر اعتماد نہ کیا جائے تو مسئلہ امامت بھی، جو شیعہ مذہب کا بنیادی پتھر ہے، ناقابل اعتماد قرار پاتا ہے اور شیعہ مذہب کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔گویا اگر شیعہ مذہب کو مانا جائے تو قرآن کریم کی تحریف کا عقیدہ لازم ہے۔ اوراگر قرآن کریم کو صحیح اور تحریف سے پاک مانا جائے تو شیعہ مذہب خود بخود غلط ہو جاتا ہے

اب شیعہ اکابر کا عقیدہ ملاحظہ فرمایئے:

فصل الخطاب میں ہے کہ آیا قرآن میں کوئی تغیر و تبدل ہوا ہے یانہیں؟ اس میں ہمارے علماء کے دو قول مشہور ہیں، اول یہ کہ اس میں تبدیلی اور کمی ہوئی ہے اور یہ مندرجہ ذیل علماء شیعہ کا مذہب ہے:

۱۔ شیخ جلیل علی بن ابراہیم قمی۔ مصنف تفسیر قمی
۲۔ ثقۃ الاسلام کلینی۔ مصنف الکافی
۳۔ الثقۃ الجلیل محمد بن حسن صفار۔ مصنف کتاب البصائر۔
۴۔ الثقہ محمد بن ابراہیم نعمانی تلمیذ کلینی۔ مصنف کتاب الغیبت
۵۔ الثقہ الجلیل سعید بن عبد اللہ قمی۔ مصنف کتاب ناسخ القرآن ومنسوخہ
۶۔ سید علی بن احمد کوفی۔ مصنف کتاب بدع المحدثہ
۷۔ اجلۃ المفسرین والمتہم الشیخ الجلیل محمد بن مسعود عیاشی۔
۸۔ شیخ فرات بن ابراہیم الکوفی
۹۔ الثقۃ الثقہ محمد بن عباس الماہیار
۱۰۔ الشیخ الاعظم محمد بن محمد بن نعمان المفید
۱۱۔ شیخ المتکلمین ومتقدم نجتیین ابو سہل اسمٰعیل بن نوبخت۔ مصنف کتب کثیرہ
۱۲۔ الشیخ المتکلم الفیلسوف ابو محمد حسن بن موسیٰ۔ مصنف تصانیف جیدہ۔
۱۳۔ الشیخ الجلیل ابو اسحٰق ابراہیم بن نوبخت، مصنف کتاب الیاقوت
۱۴۔ اسحاق کاتب۔ جس نے امام مہدی کو دیکھا ہے۔ خدا امام موصوف کی مشکل جلد آسان کرے۔
۱۵۔ رئیس الطائفہ، جس کے معصوم ہونے کا قول کیا گیا ہے یعنے شیخ ابو القاسم حسین بن روح بن ابی بحر النوبختی، جو شیعوں کے اور امام مہدی کے درمیان تیسرے سفیر تھے۔
۱۶۔ العالم الفاضل المتکلم حاجب بن لیث بن سراج۔

۱۷۔ الشیخ الثقہ الجلیل الاقدم فضل بن شاذان مصنف کتاب الایضاح
۱۸۔ الشیخ الجلیل محمد بن حسن شیبانی مصنف تفسیر نہج البیان۔
۱۹۔ الشیخ الثقہ احمد بن محمد بن خالد برقی مصنف کتاب المحاسن
۲۰ الثقہ محمد بن خالد۔ مصنف کتاب التنزیل والتفسیر
۲۱ الشیخ الثقہ علی بن حسن بن فضال مصنف کتاب التنزیل من القرآن والتحریف۔
۲۲۔ محمد بن حسن الصیرفی۔ مصنف کتاب التحریف والتبدیل
۲۳ احمد بن محمد بن سیار۔ مصنف کتاب القراءات یا کتاب التنزیل و التحریف۔
۲۴۔ الثقہ الجلیل محمد بن عباس بن علی بن مروان ماہیار مصنف تفسیر
۲۵۔ ابوطاہر عبد الواحد بن عمر قمی۔
۲۶۔ الجلیل محمد بن علی بن شہر آشوب، مصنف کتاب المناقب وکتاب المثالب۔
۲۷۔ شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی۔ مصنف کتاب الاحتجاج [1]
۲۸۔ مولی محمد صالح۔ مصنف شرح الکافی۔
۲۹ فاضل سید علی خان۔ مصنف شرح الصحیفہ

---

[1] مصنف احتجاج نے اس کا عہد کیا ہے کہ وہ صرف وہی روایتیں ذکر کریں گے جن پر (شیعوں کا) اجماع ہے یا وہ موافق ومخالف کے درمیان مشہور ہیں یا دلیل عقل سے ثابت ہیں موصوف نے دس سے زیادہ صریح روائتیں نقل کی ہیں (فصل الخطاب ص۳) احتجاج طبرسی کی ایک روایت کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

۳۰۔ مولیٰ مہدی نراقی

۳۱۔ الاستاذ الاکبر بہبہانی، مصنف الفوائد

۳۲۔ محقق قمی

۳۳۔ شیخ ابو الحسن شریف۔ مصنف تفسیر مرأۃ الانوار[۱]

۳۴۔ شیخ علی بن محمد مقابی مصنف مشرق الانوار

۳۵۔ السید الجلیل علی بن طاؤس۔ مصنف فلاح السائل۔ سعد السعود

۳۶۔ اور یہی مذہب ہے جمہور محدثین (شیعہ) کا جن کے کلمات پر ہم کو اطلاع ہوتی ہے۔ (فصل الخطاب ص۲۵ تا ص۳۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کریم میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور یہ کہ پورا قرآن جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا وہ لوگوں کے ہاتھ میں بین الدفتین موجود ہے۔ صدوق نے عقائد میں، سید مرتضے نے، شیخ الطائفہ نے تبیان میں اور شیخ ابو علی طبرسی نے مجمع البیان میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

اور متقدمین شیعہ میں سے کوئی ایسا شخص — ولم يعرف من القدماء
معلوم نہیں جو عدم تحریف کے عقیدے — موافق لهم الا ما حكاه
میں ان کا موافق ہو بجز اس کے جو مفید — المفيد عن جماعة

---

[۱] صاحب فصل الخطاب لکھتے ہیں: وجعلہ فی تفسیرہ المسمّی بمرأۃ الانوار من ضروریات مذہب التشیع واکبر مفاسد غصب الخلافۃ بعد تتبع الاخبار وتصفح الآثار (ص۳۱) یعنی ابو الحسن شریف نے اخبار کی تتبع تلاش اور آثار کی چھان بین کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تحریف قرآن کا عقیدہ مذہب تشیع کے ضروریات میں سے ہے اور غصب خلافت کا سب سے بدترین نتیجہ ہے۔

من اهل الامامة والظاهر نے اہل امامت کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے اور بظاہر اس سے مراد
انه اراد الصدوق واتباعه صدوق اور اس کے متبعین ہیں۔
(فصل الخطاب صـ۳۲)
والی طبقته لم یعرف الخلاف اور شیخ ابوعلی طبرسی کے طبقہ تک اختلاف
الا من هٰذهِ المشائخ الاربعة معروف نہیں تھا مگر انہی چار مشائخ کا۔
(ص۔ ۳۴)

فصل الخطاب کے ان حوالوں سے مندرجہ ذیل نتائج ظاہر ہوئے

۱۔ متقدمین شیعہ تمام کے تمام تحریف قرآن کے قائل تھے۔ جن میں بانیان مذہب شیعہ بھی شامل ہیں، وہ لوگ بھی جنہوں نے خود امام مہدی کی زیارت کی ہے، وہ لوگ بھی جو امام غائب اور شیعوں کے درمیان سفارت کا مقدس فریضہ انجام دیتے رہے اور جنہیں شیعہ معصوم تک مانتے ہیں، اور وہ لوگ بھی جن کی کتابوں کو امام غائب نے ملاحظہ فرما کر ان کی تصدیق فرمائی۔ الغرض کل کے کل اساطین شیعہ تحریف قرآن کے قائل تھے۔

۲۔ تحریف قرآن کا عقیدہ شیعہ مذہب کی ضروریات اور ان کے نظریۂ غصب خلافت کے قطعی لوازم میں سے ہے، کیونکہ شیعہ مذہب کی بنیاد اس پر ہے کہ حضرات خلفائے راشدین العوذ باللہ ظالم و غاصب تھے۔ انہوں نے خلافت، جو حضرت علیؓ کا حق تھا، چھین لی اور دین سے پھر گئے اور باقی تمام صحابہ نے ان کی طوعًا و کرہًا موافقت کی، قرآن کریم انہی کے واسطے سے بعد کی امت تک منتقل ہوا۔ اس لئے شیعوں کے عقیدۂ غصب خلافت کو تسلیم کر لینے کے بعد ناممکن ہے کہ قرآن

کریم کو صحیح اور محفوظ مانا جائے۔

۴۔ شیعہ علماء میں گنتی کے چار شخص ہیں جو قرآن کریم کو غیر محرف مانتے ہیں اور ان کا یہ اظہار بھی محض تقیہ کی وجہ سے ہے ورنہ خود انہی کے کلام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم (نعوذ باللہ) تحریف شدہ ہے۔ جیسا کہ مصنف فصل الخطاب نے ان کے ایک ایک جملہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور ان میں سے بعض کے تقیہ کی تصریح کر کے باقیوں کے قول کی توجیہہ کے لئے اس کا حوالہ دیا ہے (دیکھیئے فصل الخطاب صہ ۳۲ ومابعد) اگر جناب نصیر الاجتہادی کے بقول تحریف قرآن کا افسانہ یہودیوں کا اڑایا ہوا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بانیان مذہب شیعہ اور متقدمین شیعہ سب کے سب یہودی تھے، جنہوں نے نہ صرف تحریف قرآن کا عقیدہ گھڑ کر ائمہ کی طرف منسوب کر دیا۔ بلکہ وصایت، خلافت بلا فصل۔ تقیہ، متعہ اور خلفائے راشدینؓ کے ظلم و جور کی داستانیں گھڑ گھڑ کر شیعوں میں پھیلا دیں۔ اور شیعہ بے چارے جناب نصیر الاجتہادی کے بقول اس یہودی سازش کا شکار ہو گئے۔

یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

باب دوم

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم شیعہ کی نظر میں

حضرات صحابہ کرام، خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی فضیلت و منقبت کسی تشریح و وضاحت کی محتاج نہیں یہ وہ مقدس جماعت ہے جسے پوری انسانیت میں سے چھانٹ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کے لئے منتخب کیا۔ جسے "خیر امت" کا لقب دیا۔ جسے "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کے تاج کرامت سے سرفراز فرمایا۔ جناب مصنف جس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اس کے نزدیک اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و عداوت رکھنا، ان کی توہین وتنقیص کرنا اور ان کے خلاف جھوٹے افسانے تراش کر انہیں بدنام کرنا شاید سب سے بڑی عبادت ہے۔ چنانچہ مصنف نے بھی اس "عبادت عظمیٰ" کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

الف: عام صحابہ کرامؓ

جناب مصنف نے دیباچہ میں قرآن کریم کے مضامین کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ جس میں مختلف عنوانات کے تحت قرآن کریم کی آیات کے حوالے دیئے ہیں۔ صفحہ ۱۴ پر ایک عنوان ہے: "بعض اصحاب کی مذمت" اس کے تحت مصنف نے درج ذیل حوالے دیئے ہیں:

سورۂ آل عمران: آیات ۱۰۶، ۱۴۲ تا ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۲ تا ۱۵۸، ۱۶۵ تا ۱۶۸۔

سورہ التوبہ: آیات، ۲۵، ۳۸، ۳۹، ۴۱ تا ۴۳، ۴۵ تا ۵۹، ۶۱، ۷۰، ۷۳، تا ۸۷، ۹۰، ۹۳، ۹۴، تا ۹۸، ۱۰۰ تا ۱۱۰، ۱۲۵ تا ۱۲۷

سورۃ النور: آیت، ۵۴

سورۂ الاحزاب: آیات ۹ تا ۲۱، ۵۳، ۵۴، ۵۷، ۵۸

سورۂ محمد: آیات ۲۰، ۲۲

سورۂ فتح: آیت۔ ۶

سورۂ صف: آیات ۲، ۳

سورۂ جمعہ: آیت: ۱۱

سورہ تطفیف: آیات ۲۹، ۳۳

جناب مصنف ان حوالوں سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "بعض اصحاب" کی مذمت کرتا ہے۔ حالانکہ جو آیتیں انہوں نے نقل کی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کفار و منافقین کے بارے میں ہیں۔ مثلاً: مصنف نے سورۂ توبہ کی آیات ۶۱ تا ۷۰ کا حوالہ دیا ہے جو سب کی سب منافقین کے بارے میں ہیں اور خود مصنف نے ان آیات پر "منافقین کے تذکرے" کا عنوان دو جگہ قائم کیا ہے۔ (دیکھیئے ص۲۵۱، ص۳۵۳) اسی طرح مصنف نے اسی سورہ کی آیات ۷۳ تا ۸۷ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

حالانکہ ان آیات پر خود مصنف نے یہ سرخیاں لگائی ہیں: "منافقین کا ذکر" (ص۳۵۵) اور "منافقین ہرگز نہ بخشے جائیں گے"۔ اسی سورہ کی آیات ۱۲۵ تا ۱۲۷ کا بھی مصنف نے حوالہ دیا ہے، حالانکہ ان آیات پر

خود یہ سُرخی لگائی ہے۔ "کفار کی مذمت"

انصاف فرمائیے! کہ جو آیات کفار و منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہوں ان کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر چسپاں کرنا کیا کسی مسلمان کا کام ہو سکتا ہے۔

مہاجرین و انصار

ب:

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں حضرات مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی مدح فرمائی گئی ہے اور ان کا پوری امت سے افضل و برتر ہونا ذکر کیا گیا ہے ان آیات پر ایمان رکھا جائے تو جناب مصنف اور اس کے گروہ کا عقیدہ ھباءً منثورًا ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے جناب مصنف نے کہیں تو ان آیات سے خاموشی سے گذر جانے میں عافیت سمجھی ہے اور کہیں اپنے عقیدہ کے مطابق ان آیات میں تاویلات باردہ کی کوشش کی ہے مثلاً سورۃ الانفال کی آیت ۷۴ (جس میں مہاجرین و انصار کی مدح ہے) کے تحت لکھتے ہیں،

"یہ آیت اور اس کے قبل کی آیت بھی مہاجرین و انصار کی تعریف میں نازل ہوئی ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ ان میں اکثر ایسے ہی تھے۔ اور بعض تو اولیاء کاملین سے تھے، مگر کچھ ایسے بھی تھے جو رسول اللہ کی وفات کے بعد اپنے عہد پر قائم نہ رہے۔ اور آل رسولؐ سے بری طرح پیش آئے۔ اور یہ جو بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ چار پانچ کے سوا کوئی اچھا نہ تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جان و مال آبرو عزت کی کچھ بھی پرواہ نہ کر کے

اہل بیت کا ساتھ دینے والے چار پانچ تھے۔ ورنہ بہت
سے لوگ اصحاب رسولؐ سے خوش صفات اور صاحب
ایمان تھے۔ مگر آبرو یا جان و مال یا اولاد کے خوف سے کچھ
بول نہ سکتے تھے اور جب موقعہ خالی پاتے تو بولتے بھی تھے" (ص۲۳۲)
مصنف نے جن "بعض احادیث" کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں اصول
کافی کتاب الروضہ میں ہے:

عن ابی جعفر قال کان الناس	امام ابوجعفر فرماتے ہیں کہ آنحضرت
اهل ردة بعد النبی صلی الله	صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگ
علیه وسلم الا ثلاثة. فقلت،	مرتد ہو گئے تھے۔ سوائے تین آدمیوں
ومن الثلاثه؟ فقال المقداد	کے۔ میں نے پوچھا وہ تین کون تھے؟
بن الاسود وابوذر الغفاری	فرمایا، مقداد بن اسود، ابوذر غفاریؓ،
وسلمان الفارسی رحمة الله	سلمان فارسی پھر کچھ دیر کے بعد کچھ
وبرکاته علیهم ثم عرف	اور لوگوں نے بھی حق پہچانا۔ اور فرمایا
الناس بعد یسیر. وقال هؤلاء	کہ یہ وہ لوگ تھے جن پر چکی چلی اور
الذین دارت علیهم الرحاء	انہوں نے بیعت سے انکار کر دیا۔
وابوا ان یبایعوا حتی جاؤا	یہاں تک کہ لوگ امیر المؤمنین کو زبردستی
بامیر المؤمنین علیه السلام	لائے پس آپ نے بیعت کی۔ (تب
مکرها فبایع (ص۲۴۶ طبع ایران ۱۳۸۹ھ)	ان تین شخصوں نے بیعت کر لی۔)

رجال کشی ص۸ میں ہے:

ارتد الناس الا ثلثة نفر سب لوگ مرتد ہو گئے سوائے تین نفر کے۔
سلمان وابوذر والمقداد سلمان، ابوذر، مقداد۔ اور اگر تم چاہو کہ کوئی

وان اردت الذی لم یشك ولم یدخله شیء فالمقداد — ایسا شخص ہو جس نے بالکل شک نہ کیا ہو اور نہ اس میں کوئی داغ ہو تو وہ صرف مقداد ہیں۔

۳۔ احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران میں ہے:

ما من الامة عن احد بایع مکرھًا غیر علی و اربعتنا۔ — امت میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے ابوبکر کے ہاتھ پر دلی رضامندی کے بغیر بیعت کی ہو سوائے علیؓ کے اور ہمارے چار شخصوں کے۔

۴۔ جناب مصنف لکھتے ہیں:

"دنیا کا سلف سے یہی دستور چلا آتا ہے کہ دین حق کو پہلے بے چارے غرباء ہی نے قبول کیا، حضرت رسولؐ کے واسطے بھی یہی ہوا کہ اپنے اہل بیت کے علاوہ سچے دیندار حضرت مقداد، عمار، سلمان، ابوذر وغیرہ تھے۔" (ص۲۳۸)

مصنف کے عقیدے کے مطابق اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ان چار بزرگوں کے سوا صحابہ کرام "سچے دیندار" ہی نہیں تھے۔ بلکہ نعوذ باللہ منافق اور بے دین تھے۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام مہاجرین و انصار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب مرتد ہو گئے، جو تین چار بزرگ اس ارتداد سے محفوظ رہے، انہوں نے بھی طوعاً وکرہاً سرگروہ مرتدین سے بیعت کر لی۔ اور انہی کے حلقہ بگوش ہو گئے ان حلقہ بگوشان مرتدین میں سرفہرست حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی ہے۔ یہ ہے مصنف کے نزدیک مہاجرین و انصار کی وہ

فضیلت جس کو قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون

ج۔ اصحاب حدیبیہ

سورۂ الفتح پوری غزوۂ حدیبیہ کے بارے میں ہے اس غزوہ میں شریک ہونے والے حضرات کی تعداد ۱۴۔۱۵ سو کے درمیان تھی، جنہوں نے بڑی جانثاری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پر موت اور جہاد کی بیعت کی تھی[1] اس سورہ میں ان کی بلیغ ترین مدح و توصیف فرمائی گئی ہے اور ان سے رضامندی کا اعلان فرمایا گیا ہے۔لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذیبایعونك تحت الشجرۃ جناب مصنف کے لئے قرآن کریم کا یہ اعلان بھی ناقابل قبول ہے۔ اس لئے وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

> "اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان تمام بیعت کرنے والوں سے خدا ہمیشہ کے لئے راضی ہو گیا اور یہ لوگ جنتی بن گئے کیونکہ اول تو خدا نے تمام بیعت کرنے والوں سے خوشنودی کا اظہار

---

[1] اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر فرمایا تھا کہ "ہذہ لعثمان" "یہ بیعت میں عثمانؓ کی طرف سے کر رہا ہوں" (روضہ کافی ص۳۲۵) گویا باقی صحابہ نے خود بیعت کی تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اور یہ حضرت عثمان رضؓ کی وہ فضیلت ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔

نہیں کیا بلکہ صرف مؤمنین سے اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے نہیں
بلکہ صرف وہ اس وقت خوش ہوا جس وقت ان لوگوں نے
بیعت کی اب رہی آئندہ کی حالت تو جیسی کرنی ویسی بھرنی۔
تو خلاصۂ مطلب اس آیت کا یہ ہوا کہ خدا سچے ایمانداروں
کے اس فعل سے ضرور خوش ہوا" (ص۹۲۱)

اگر خدا تعالےٰ کو آئندہ کا علم نہیں تھا کہ یہ لوگ مرتد ہو جائیں گے اس نے وقتی فعل سے خوش ہو کر اپنی رضا مندی کا ایسا اعلان فرما دیا۔ جو قیامت تک منبر و محراب میں تلاوت کیا جاتا رہے گا اور ہاں! وہ سچے مؤمن کون تھے جن کے ایک عظیم کارنامہ پر اللہ تعالےٰ نے ان کو اپنی رضامندی کا تمغہ عطا فرمایا؟ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان "سچے مومنوں" کے زمرہ میں نہیں آتے۔ جن کی طرف سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی تھی۔ قاتلهم الله انی یؤفکون۔

حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین

حضرات خلفائے راشدین خصوصًا حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر و وزیر کی تھی۔ آپؐ کے بعد ان کے ہاتھ سے ایسی اسلامی خدمات ظہور میں آئیں جن کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے اور پھر ان اکابر نے اپنی ان خدمات جلیلہ کے عوض ایک جو کے برابر کوئی مادّی فائدہ نہیں اٹھایا حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا جو روزینہ بیت المال سے مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کا بھی ایک ایک حبہ بیت المال کو واپس کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سرے سے کوئی وظیفہ بیت المال سے قبول ہی نہیں فرمایا۔ گویا ان

تینوں حضرات کی تمام خدمات (جن کی بدولت بعد کی تمام دنیا کو اسلام کی روشنی نصیب ہوئی) سب کی سب بے لوث اور بلا معاوضہ تھیں۔

اور پھر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو وفات کے بعد بھی روضۂ مطہرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و رفاقت کا وہ شرف حاصل ہے۔ جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے مخلص رفقا۔ جن کو حیاتاً و میتاً رفاقت نبوی کا دائمی شرف حاصل ہے اور امت کے ایسے محسن جن کے دم قدم سے بعد کے لوگوں کو دولت ایمان اور نورِ اسلام میسر آیا کسی مسلمان کا ان سے بغض و عداوت رکھنا ناقابل فہم ہے۔ لیکن شیعہ حضرات ان سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہیں۔

بانیانِ مذہب شیعہ نے ان بزرگوں کے خلاف اتنی کثرت سے روایتیں گھڑی ہیں کہ تحریف قرآن کی روایات کے بعد شاید انہی کا نمبر ہوگا۔

ان بے شمار روایات میں روضہ کافی کی مندرجہ ذیل روایت ملاحظہ فرمائیے جس سے اندازہ ہوگا کہ بانیان مذہب شیعہ ان اکابر سے کس قدر بغض رکھتے تھے۔

حنان بن سدیر اپنے باپ سے روایت کرتا کہ میں نے امام ابوجعفر سے ان دونوں کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:

یا ابا الفضل: ماتسأل عنهما	اے ابوالفضل! ان دونوں کے بارے
فواللہ مامات منا میت قط	میں مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ پس اللہ
الاساخطا علیهما۔ ومامنا	کی قسم! ہم میں سے جو مرا ان سے
الیوم الاساخطا علیهما۔	ناراض مرا۔ اور جو آج زندہ ہے وہ
یوصی بذالک الکبیر منا	بھی ان سے ناراض ہے۔ ہمارے بڑے

الصغیر انهما ظلمانا حقنا
ومنعنا فیئنا وکانا اول من
رکب اعناقنا وبثقا بثقا فی
الاسلام لا یسکر ابدًا حتی
یقوم قائمنا او یتکلم متکلمنا
ثم قال اما واللّٰه لو قد
قام قائمنا او تکلم متکلمنا
لابدی من امورهما ما
کان یکتم، ولکتم من امورهما
ما کان یظهر، واللّٰه ما
اسست من بلیة ولا قضیه
تجری علینا اهل البیت الا
هما اسسا اولهما

(روضہ کافی ص ۱۲۵ مطبوعہ ایران)

اپنے چھوٹوں کو اسی کی وصیت کر کے مرتے ہیں ان دونوں نے ظلماً ہمارا حق مارا اور ہماری فے ہم لوگوں سے روک لی یہ دونوں پہلے شخص تھے جو ہماری گردنوں پر سوار ہوئے اور ان دونوں نے اسلام میں ایسا طوفان برپا کر دیا جو کبھی تھمنے کا نام نہیں لے گا۔ جب تک کہ ہمارے مہدی کا ظہور نہیں ہو جاتا یا ہمارا بولنے والا بات نہیں کرنے لگتا پھر فرمایا: اللہ کی قسم! اگر ہمارے مہدی کا ظہور ہو جاتا یا ہمارا بولنے والا بولنے لگتا تو ان دونوں کی وہ باتیں ظاہر کرتا جو چھپائی جاتی تھیں اور ان کی وہ باتیں چھپاتا جو ظاہر کی جاتی تھیں اللہ کی قسم: ہم اہل بیت پر جو آفت و مصیبت بھی گذرتی ہے اس کی بنیاد انہی دونوں نے ڈالی ہے۔

۱۔ سورۂ محمدؐ کی آیات ۲۵ تا ۲۳ میں کفار و مرتدین اور منافقین کا تذکرہ ہے:

ان الذین ارتدوا علیٰ ادبارهم من بعد ما تبین لهم الهدی الشیطٰن سول لهم واملیٰ لهم. ذٰلک بانهم قالوا للذین

بیشک جو لوگ راہِ ہدایت صاف صاف معلوم ہونے کے بعد بھی الٹے پاؤں (کفر کی طرف) پھر گئے۔ شیطان نے انہیں اپنے دے کر ڈھیل دے رکھی ہے۔

کرھوا ما انزل اللہ سنطیعکم فی بعض الامر واللہ یعلم اسرارھم الی قولہ ــــ

اور ان کی تمناؤں کی رسیاں دراز کردی ہیں یہ اس لئے کہ جو لوگ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب سے بے بیزار ہیں یہ ان سے کہتے ہیں کہ بعض کاموں میں ہم تمہاری ہی بات مانیں گے اور خدا ان کے پوشیدہ مشوروں سے واقف ہے

ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ وشاقوا الرسول من بعد ما تبین لھم الھدٰی لن یضروا اللہ شیئا وسیحبط اعمالھم

بے شک جن لوگوں پر (دین کی سیدھی) راہ صاف ظاہر ہو گئی اس کے بعد انکار کر بیٹھے اور (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکا اور پیغمبر کی مخالفت تو وہ خدا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے اور وہ ان کا کیا کرایا اکارت کر دے گا

جناب مصنف کے نزدیک ان آیات کا مصداق خلفائے راشدینؓ اور ان سے بیعت کرنے والے صحابہؓ ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل نہ بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی چنانچہ لکھتے ہیں، "حافظ ابوبکر بن مردویہ نے روایت کی ہے کہ "یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت علی رضؓ کی خلافت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے اور اسی کی مؤید مؤید وہ دونوں روایتیں ہیں جو گذشتہ صفحہ میں مذکور ہو چکیں" (ص۹۱۵)

مصنف کی اس تشریح کے مطابق ان آیات میں کافر اور مرتد خدا اور رسول کی مخالفت کرنے والے تمام صحابہ کرام رضؓ ــــــــ

اللہ عنہم کو قرار دیا گیا ہے۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ـــــــ یہ بانیان مذہب شیعہ کے بُغض صحابہ کا ادنی نمونہ ہے۔

۲۔ سورۂ والشمس کے شروع میں چند قسمیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے چار یہ ہیں (۱) سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔ (۲) چاند کی جب کہ وہ اس کے پیچھے نکلے۔ (۳) دن کی جب اسے چمکا دے۔ (۴) اور رات کی جب اسے ڈھانک لے۔ (ترجمہ فرمان علی)

مصنف ان قسموں کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

"ایک روایت ہے کہ سورج سے مراد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور قمر سے مراد جناب امیر علیہ السلام اور رات سے وہ لوگ مراد ہیں جو اہل بیت کے حقوق کو غصب کر کے حاکم بن بیٹھے"۔ (ص ۱۰۷۲)

اہل بیت کے حقوق غصب کر کے حاکم بن بیٹھنے والوں سے مصنف کی مراد حضرات خلفائے راشدینؓ ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس روایت کے گھڑنے والے دانشمندوں کو اتنی بھی تمیز نہیں تھی کہ یہ سورۃ مکی ہے جس میں اس قسم کی مہمل تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور انہیں یہ بھی تمیز نہ رہی کہ اس تفسیر کے مطابق تو حضرات خلفائے راشدین بہت ہی مقدس تھے کہ ان کے وجود کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ـــــ اور جن لوگوں کے نام کی خدا قسم کھاتا ہو ان کو ظالم و غاصب کہنا کس طرح صحیح ہو گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

سورہ برأت کے آغاز میں مصنف لکھتے ہیں :-

حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورہ کے شروع کی آیتیں حضرت ابوبکر رضؓ کو دیں اور کچھ آدمیوں کے ساتھ کر کے حکم دیا کہ مکہ میں جا کر کفار اور مشرکین کے مجمع عام میں پڑھ کر سنا دو۔ حضرت ابوبکر رضؓ روانہ ہوئے اس کے بعد حضرت جبریل یہ حکم خدا لے کر آئے کہ یہ ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے یا تو تم خود جاؤ یا جو شخص تم سے ہو اس کو بھیجو ، آپ نے فوراً حضرت علی رضؓ کو ناقہ پر سوار کر کے روانہ کیا اور حکم دیا کہ ان آیتوں کو ابوبکر سے لے کر تم خود پڑھ کر سنا دو اور ابوبکر کو واپس کر دو۔ حضرت ابوبکر واپس آئے اور پوچھا کیا میرے بارے میں کوئی حکم آیا، فرمایا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو تفسیر درِّ منثور جلد ۳ صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ مصر ـ اور اس کے تمام شیعہ سنی بالاتفاق قائل ہیں اور کسی کو اختلاف نہیں"۔ چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی تعریضاً جناب امیر کی مدح میں لکھتے ہیں :

وَلَاکان معزولًا غداۃ براءۃ   وَلَافی صلٰوۃ ام فیھا مؤخرًا

(ترجمہ از ناقل) اور نہ حضرت علی کو برأت کی صبح کو معزول کیا گیا اور نہ جس نماز میں وہ امام تھے انہیں اس سے پیچھے ہٹایا گیا"۔ (صـ۳۲۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ ہجری میں حضرت ابوبکر رضؓ صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا۔ اور مرض الوفات میں انہیں اپنی جگہ امام الصلوٰۃ بنایا۔ یہ دونوں واقعے اس کی قطعی دلیل ہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اعلم و افضل اور آپ کی جانشینی وقائمقامی کا مستحق کوئی دوسرا نہیں تھا۔ روافض کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا انکار کرنے کے لئے یہ جھوٹ گھڑنا پڑا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں موقعوں پر حضرت ابوبکرؓ کو معزول کر دیا تھا۔ اسی جھوٹ کو ابن ابی الحدید رافضی معتزلی نے مندرجہ بالا شعر میں نظم کیا ہے۔ چونکہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں غلط بیانی جناب مصنف اور ان کے ہم مسلک حضرات کا دین و ایمان ہے، اس لئے تقیہ کا ثواب حاصل کرنے کے لئے جناب مصنف نے بھی یہ جھوٹ گھڑ دیا کہ:

"اور حکم دیا کہ ان آیتوں کو ابوبکر سے لے کر تم خود پڑھ کر سنا دو۔ اور ابوبکر کو واپس کردو"

حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کو واپس کرنے کا حکم نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت ابوبکرؓ کو واپس ہونے کے لئے کہا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خالص افتراء ہے جس کا گھڑنے والا اس ارشاد نبویؐ کا مصداق ہے:

من کذب علی متعمدًا فلیتبوأ مقعدہٗ من النار (اصول کافی باب اختلاف الحدیث ص۶۲ ج۱)	جس نے جان بوجھ کر میری طرف غلط بات منسوب کر دی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنائے۔

پھر اس جھوٹ پر جھوٹ یہ گھڑتے ہیں کہ تمام شیعہ سنی اس کے قائل ہیں کسی کو اس میں اختلاف نہیں۔ حالانکہ متفق علیہ بات

جس میں کسی کو اختلاف نہیں، یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امیر الحج تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے مامور اور ماتحت تھے۔ چنانچہ ابن اسحاق نے خود امام محمد باقر کی یہ روایت نقل کی ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیج چکے تھے۔ کہ سورہ براۃ نازل ہوئی۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ اگر آپ ان آیات کو ابوبکر کے پاس بھیج دیتے (تو وہ مکہ میں ان کا اعلان کر دیتے) فرمایا (چونکہ یہ مسئلہ عہد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے عرب کے دستور کے مطابق) یہ پیغام وہی شخص پہنچا سکتا ہے جو میرے اہل بیت سے ہو۔ پھر آپ نے حضرت علی کو بلا بھیجا۔ اور ان سے فرمایا کہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات اور ان کے احکام لے کر وہاں جائیں اور قربانی کے روز جب سب لوگ منیٰ میں جمع ہوں یہ اعلان کر دیں کہ جنت میں کوئی کافر نہیں داخل ہو گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکتا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف نہیں کر سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کا معاہدہ ہو تو طے شدہ میعاد تک اس کی پابندی کی جائے گی۔

حضرت علی رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر سوار ہوئے اور راستہ میں حضرت ابوبکر رض سے جا ملے۔ انہوں نے پوچھا کہ امیر ہو یا مامور؟ کہنے لگے، مامور

ہوں۔ پھر دونوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور حضرت ابو بکرؓ حج کے انتظامات میں مشغول ہو گئے جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ہدایت کے مطابق ان سب باتوں کا اعلان کر دیا۔"

(سیرت ابن ہشام برحاشیہ الروض الانف ج ۲ ۳۲۸۳۲)

اسی طرح مرض الوفات میں جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام بنایا گیا تو ایک روایت بھی ایسی نہیں کہ ان کو پیچھے ہٹایا گیا ہو۔

راقم الحروف کی کتاب "عہد نبوت کے ماہ و سال" میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کا واقعہ صحیح روایات کی روشنی میں اس طرح درج کیا گیا ہے:

"۹ ربیع الاول شب جمعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت ہوئی جس کی وجہ سے تین بار بے ہوشی کی نوبت آئی اور نماز عشاء کے لئے مسجد میں تشریف نہیں لے جا سکے اور تین بار فرمایا، "ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ چنانچہ عشاء کی یہ نماز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ اور باقی تین روز بھی وہی امام رہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کل سترہ نمازیں پڑھائیں۔ جن کا سلسلہ شب جمعہ کی نماز عشاء سے شروع ہو کر ۱۲ ربیع

الاول دوشنبہ کی نماز فجر پر ختم ہوتا ہے۔ ان تین ایام میں ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو دو آدمیوں کے سہارے نماز کے لئے مسجد میں تشریف لائے، قدم مبارک سے زمین پر نشان بن رہے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صف تک پہنچے، اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے اور یہ نماز لوگوں کے ساتھ ادا کی۔۔۔۔۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپ اس نماز میں امام تھے۔ یا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں یہ نماز ادا فرمائی تھی۔ دونوں قول مشہور ہیں جو کتب احادیث میں مذکور ہیں۔

ان تین ایام کے آخری دن دوشنبہ کو، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری دن تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نماز فجر کے وقت اپنے حجرے شریفہ کے دروازے کا پردہ اٹھایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نماز کی امامت کرا رہے تھے۔ اور لوگ ان کے پیچھے صف آراء تھے، آپ ؐ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تبسم فرمایا۔ بعد ازاں پردہ چھوڑ دیا۔ اسی روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم فانی سے رخصت ہوئے (طبع اول ص۳۶۶)

الغرض نہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امارت حج سے معزول کیا گیا۔ اور نہ نماز کی امامت سے انہیں ہٹایا گیا۔ بلکہ ان دونوں موقعوں پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امیر و امام تھے اور حضرت علی کرم اللہ

وجہ ماموروِ مقتدی تھے۔ اگر حضرات شیعہ کو نظر انصاف عطا ہوئی ہوتی تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مقدس اور واجب الاحترام ہیں تو جس شخصیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا امیر و امام بنایا وہ ان سے بڑھ کر مقدس و واجب الاحترام ہیں۔ اگر یہ معصوم ہیں تو ان کے امیر و امام عصمت میں بھی ان سے فائق تر ہونے چاہئیں اور اگر یہ خلافت نبوت کے مستحق ہیں تو ان کے امیر و امام ان سے بڑھ کر مستحق خلافت ہیں۔ واقعہ یہ ہے اگر جماعت صحابہؓ میں کوئی شخص علم و فضل، ورع و تقوٰی اور فضیلت و منقبت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بجائے اسی کو امیر حج اور امام صلوٰۃ مقرر فرماتے۔ اگر انصاف کیا جائے تو اپنی جانشینی اور خلافت بلافصل کا مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا مصلیٰ سپرد کر کے حل کر دیا اب اس فیصلۂ نبوی سے جناب مصنف اور ان کے دوست خوش ہوں یا ناخوش۔

ز: حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

آیت حجاب کے تحت مصنف لکھتے ہیں:۔

"مجاہدؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ آپؐ نے کھانے کو پوچھا تو بیٹھ

گئے ۔ اتفاقاً کھانے میں حضرت عمرؓ کی انگلی حضرت عائشہؓ کی انگلی سے لگ گئی ۔ تو آپؐ کو ناگوار گذرا اور اسی وقت یہ آیت حجاب نازل ہوئی (دیکھو تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۲۱۴ سطر ۱۲ (ص ۶۳)

جناب مصنف نے قاری کے ذہن پر اپنا اعتماد جمانے کے لئے کتاب کی جلد اور صفحہ ہی نہیں لکھا، سطر کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن غلط بیانی، جو ان کی فطرت میں داخل ہے اور جو ان کے دین کے دس حصوں میں نو حصے کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے یہاں بھی باز نہ رہے۔ ان کے خط کشیدہ الفاظ کا روایت کے اصل الفاظ سے مقابلہ کیجیے:

فقال عمر اوہ . لو اطاع فیکن ما رأتکن عین فنزلت آیۃ الحجاب ؛	تو حضرت عمرؓ نے کہا ، ہائیں ! اگر آپؐ تمہارے بارے میں میری درخواست قبول فرماتے تو تمہیں کوئی آنکھ نہ دیکھ پاتی اس پر پردہ کی آیت نازل ہوئی ۔

روایت کے مطابق اس واقعہ سے ناگواری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوئی تھی اور انہی کے خواہش و درخواست کے مطابق آیت حجاب نازل ہوئی ۔ اس سے چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت ظاہر ہوتی تھی ۔ اس لئے جناب مصنف کی دیانت و امانت کو گوارا نہ ہوا کہ روایت کو جھوٹ کی آمیزش کے بغیر نقل کر کے تقیہ کے ثواب سے محروم رہیں ۔ اسی طرح جناب مصنف نے جگہ جگہ کذب و افتراء کی بھرمار کر کے ذریت ابن سبا کی نمک خواری کا حق ادا کیا ہے ۔ وسیعلم الذین

ظلموا ایّ منقلب ینقلبون۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

سورۃ النجم کے آخری رکوع افرءیت الّذی الخ کے تحت جناب مصنف لکھتے ہیں:

" حضرت عثمان رضہ اکثر کچھ خیرات دیا کرتے تھے ایک دفعہ ان کے عزیز عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح نے ان سے کہا کہ تم اتنا خرچ کرتے ہو کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم فقیر نہ ہو جاؤ۔ حضرت عثمان رضہ نے جواب دیا کہ میں نے بہت بڑے گناہ کئے ہیں اس لئے خیرات کرتا ہوں کہ شاید خدا ان کو معاف کر دے۔ عبد اللہ بولا یہ اونٹ جو بار سے لدا ہوا ہے مجھے دے دے، تو میں تیرے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لے لیتا ہوں حضرت عثمان نے فوراً دے دیا اور دو گواہ بھی کر لئے۔ اس کے بعد خیرات تصدق سب یکدم موقوف کر دی تو انہی کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اور روگردانی کرنے سے جنگ احد میں بھاگنا مراد ہے۔ دیکھو تفسیر کشاف جلد ۲ صفحہ ۴۸۱ مطبوعہ مصر" (صـ۹۴۷)

یہاں جناب مصنف نے کمال تقیہ کا دو طرح مظاہرہ فرمایا ہے، ایک یہ جو روایت انہوں نے کشاف سے نقل کی ہے وہ قطعاً جھوٹی اور کسی رافضی کی گھڑی ہوئی ہے چنانچہ روح المعانی صـ۶۵ جلد ۲۷ میں ہے:

واما ما فی الکشاف انها نزلت فی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ .... فباطل کما قال ابن عطیۃ لا اصل لہ۔	اور یہ جو کشاف میں ہے کہ یہ آیات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئیں تو یہ قطعاً باطل ہے جیسا کہ ابن عطیہ نے کہا ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔

چونکہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں جھوٹ گھڑنا اور جھوٹ کو پھیلانا ہی جناب مصنف کا مسلک ہے اس لئے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس جھوٹی روایت کو نقل کر کے حق تقیہ ادا کیا ہے۔ پھر دوسرا کمال یہ دکھایا کہ روایت کا آخری حصہ حذف کر دیا چنانچہ کشاف میں ہے:

فعاد عثمان الی احسن من ذالك واجمل (ص ۲۷م ۔ ج ۴)	ان آیات کے نزول کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہلے سے بڑھ چڑھ کر صدقہ و خیرات کرنے لگے۔

چونکہ ان آخری الفاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت کا حسین ترین پہلو قاری کے سامنے آجاتا ہے اور یہ جناب مصنف کے مسلک تقیہ کو قطعاً گوارا نہیں۔ اس لئے وہ روایت کے آخری حصہ کو شربتِ محرّم سمجھ کر پی گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جناب مصنف کا تصنیف کردہ ایک اور جھوٹ ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک روز حضرت رسولؐ کے پاس آپ کے اصحاب بیٹھے

ہوئے تھے۔ عبداللہ بن مکتوم[1] جو خاص صحابی مؤذن اور نابینا تھے
کچھ احکام پوچھنے کے واسطے آپ کے پاس حاضر ہوئے
آپؐ نے منتہائے اخلاق اور ان کی نابینائی کی وجہ سے
حضرت عثمان سے جو آپ کے پاس بیٹھے تھے، آگے
بٹھایا، یہ امر حضرت عثمان کو ناگوار گذرا، عبداللہ کی طرف
پشت کر کے بیٹھ گئے یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف
تھی حضرت جبرائیل یہ آیت لے کر نازل ہوئے جس سے
عبداللہ کی مدح اور حضرت عثمان کی تنبیہ مقصود تھی۔"

یہ کہانی جناب مصنف کی طبعزاد ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حیاء اور تواضع کا اس قدر غلبہ تھا۔ کہ فرشتے ان سے حیا کرتے تھے۔ کیا وہ یہ بے تمیزی کر سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پشت کر کے بیٹھ جائیں؟ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو اور صحابہ رض کو ناگوار ہو؟ غالبًا جناب مصنف نے صحابہ کرام کو بھی کوفے کے شیعان حسن پر قیاس کر لیا!

ط: امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن

جناب مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ازواج مطہرات اور مسلمانوں کی ماؤں کے بارے میں بھی دریدہ دہنی سے دریغ نہیں کیا۔

۱۔ سورہ النور کی آیات افک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت

---

[1] نقل مطابق اصل

وطہارت کے بارے میں نازل ہوئیں۔ لیکن جناب مصنف لکھتے ہیں:

"بعض روایات میں ہے کہ یہ آیات ام المؤمنین جناب ماریہ قبطیہ والدۂ ابراہیم بن محمد مصطفےٰ صلعم کی صفائی میں نازل ہوئی ہیں انہیں بعض ازواج نبی نے جریح قبطی سے سوتا پہ کی وجہ سے متہم کر دیا تھا۔ تفصیل کے لئے (دیکھو تفسیر قمی۔ برہان۔ صافی" (صفحہ ۶۳)

جناب مصنف اس رافضی جھوٹ کے ذریعہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ازواج مطہرات (نعوذ باللہ) اس قدر بدکردار تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکدامن حرم کو دنیا کی سب سے بدترین بدکاری کی تہمت لگا دیتی تھیں ــــــ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

۲ سورۂ النور کی ایک آیت "الخبیثات للخبیثین" جو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طہارت و نزاہت کے سلسلہ میں ہے اس کے ذیل میں مصنف لکھتے ہیں:

"یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت رسول کریم جیسے نبی آخر الزمان کی سب بیویاں پاک طینت نہ تھیں۔ جیسا کہ کتب تواریخ واحادیث سے قطع نظر خود قرآن مجید کے پارہ ۲۸ رکوع ۱۹ سورہ تحریم کی آیت ۴ سے واضح ہے، ارشاد ہوتا ہے: "فقد صغت قلوبکما" تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہیں" (ملخصاً ص ۶۳)

یہ گستاخی ازواج مطہراتؓ کے حق میں نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے کہ آپ کے اہل بیت کو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ بدطینت کہا جائے۔ اور مصنف نے سورۂ تحریم

کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما۔ — اگر تم دونوں اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرو تو (یہ مناسب موقع ہے کیونکہ) تمہارے دل توبہ کی طرف مائل ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ان ازواج مطہرات رض کو توبہ اور رجوع الی اللہ کی ترغیب دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ کی ضرورت اعلیٰ درجہ کے کاملین کو بھی ہے، لیکن جناب مصنف کو اپنے دل کی کجی مقدسین کے آئینہ میں نظر آرہی ہے۔

۲۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۸ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"جب حضرت رسول ص فتح خیبر سے واپس آئے تو حضرت ص کی بعض بیویوں نے کہا کہ جو کچھ آپ کو ملا ہے ہم لوگوں کو دیجئیے۔ آپ نے فرمایا، میں نے تو اسے مسلمانوں پر حکم خدا کے مطابق تقسیم کر دیا۔ اس پر وہ غصہ سے بولیں کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر ہم کو طلاق دو گے تو ہم کو کوئی دوسرا شوہر نہ ملے گا؟ اس کا حضرت کو بہت رنج ہوا حتیٰ کہ آپ ص کنارہ کش ہو کر انیس روز تک مشربہ ابراہیم میں رہے یہاں تک کہ حضرت کی بیویوں کو حیض ہوا اور یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔" (ص ۷۵٦)

جناب مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات رض کا جو مکالمہ درج کیا ہے وہ بھی موصوف کے گھر کا طبع زاد ہے۔ اور گندے جھوٹ کے یہ الفاظ کہ:

• کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر ہم کو طلاق دو گے تو ہم کو کوئی دوسرا شوہر نہ ملے گا۔"

اس قدر تکلیف دہ ہیں کہ جبین حیاء کو پسینہ آجاتا ہے،

اختصار کے پیش نظر اس باب میں حضرات صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور ازواج مطہرات امہات المؤمنین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے بارے میں مصنف کی کذب بیانی اور افتراء پردازی کی چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ مصنف کا قلم اس سلسلہ میں بہت ہی بے باک اور گستاخ ہے اور اس نے ان مقدسین کے بارے میں جگہ جگہ گندگی اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ حیف ہے اس دعوائے ایمان پر جو یاران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتد اور بے ایمان قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی کا مرتکب ہو، اور تُف ہے اس دعوائے اسلام پر جو ازواج مطہرات رض کی عزت وحرمت کے ساتھ کھیلنے سے باز نہ رہے جو قرآن کریم کی نص سے اہل ایمان کی مائیں ہیں۔ اور کوئی شریف آدمی اپنی ماں سے بے ہودہ گفتاری اور بدگوئی نہیں کیا کرتا اگر مصنف کا تعلق بھی اہل ایمان کی برادری سے ہوتا تو وہ قرآن کریم کے حواشی کو اس گندگی سے ملوث نہ کرتے۔

باب سوم

حضرت علی رضی اللہ عنہ

شانِ علی میں غلو

جناب مصنف لکھتے ہیں :

حضرت علی رض فرماتے ہیں کہ دو شخص میرے بارے میں گمراہ اور داخل جہنم ہوں ۔ ایک وہ جو میری دوستی میں افراط کر کے مجھے میرے مرتبہ سے بڑھا دیتا ہے اور دوسرا وہ جو مجھے میرے مرتبہ سے گھٹا دیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ آپ کے فضائل کی خواہ مخواہ تاویلیں کرتے ہیں یا کسی امام کو نبوت یا خدائی کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں ، خارج از ایمان ہیں" (صـ ۱۰۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

حضرت نے جناب امیر کی طرف خطاب کر کے فرمایا یا علی تمہاری مثال بھی عیسیٰ کی ہے کہ کچھ لوگ تو ان کی دوستی میں گمراہ ہوئے اور کچھ دشمنی میں " (صـ ۸۸۵)

مصنف کی نقل کردہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رض کے بارے میں لوگوں کے تین فریق ہوں گے ایک آپ کی عداوت و دشمنی کی وجہ سے گمراہ اور جہنمی ہوگا ۔ یہ خوارج کا گروہ ہے دوسرا

آپ کی محبت میں غلو کر کے گمراہ اور خارج از ایمان ہوگا۔ یہ شیعوں کا گروہ ہے۔ اور ایک فریق وہ ہوگا۔ جو آپ کی شان میں نہ تو افراط کرے گا نہ تفریط، بلکہ نقطۂ اعتدال پر قائم رہے گا۔ یہ سوادِ اعظم اہلسنت ہیں۔ چنانچہ اہل سنت آپ کی محبت کو جزو ایمان سمجھتے ہیں، آپ سے بغض و عداوت کو نشانِ نفاق وطغیان تصور کرتے ہیں، آپ کے اعلیٰ ترین فضائل و مناقب کے دل وجان سے قائل ہیں۔ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین عزیز، خلیفۂ راشد اور مبشر بالجنۃ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ ان کی مدح میں غلو نہیں کرتے۔ نہ انہیں انبیاء کرامؑ کے ہمسر کہتے ہیں۔ نہ ان کے لئے لوازم نبوت (عصمت وغیرہ) ثابت کرتے ہیں۔ نہ انہیں شیخین رضہ سے افضل مانتے ہیں۔ چنانچہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے کہ انہیں اطلاع پہنچی کہ بعض لوگ انہیں حضرات شیخین پر فضیلت دیتے ہیں تو ممبر پر تشریف لے گئے اور حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا:

یاایھاالناس انہ قد بلغنی ان	لوگو! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ کچھ لوگ
قومًا یفضلونی علی ابی بکر و	مجھے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت
عمر۔ ولوکنت تقدمت فیہ	دیتے ہیں۔ اگر میں نے اس سلسلہ
لعاقبت فیہ فمن سمعتہ بعد	میں پہلے تنبیہہ کر دی ہوتی تو میں ان
ھذا الیوم یقول ھذا فھو	لوگوں پر سزا جاری کرتا۔ پس آج کے
مفتر، علیہ حد المفتری۔ ثم	بعد میں نے کسی کو یہ بات کہتے سُنا
قال ان خیر ھٰذہ الامۃ بعد	تو وہ مفتری ہے اور اس پر مفتری کی
نبیّھا ابو بکر وعمر۔ ثم	حد جاری ہوگی۔ پھر فرمایا آنحضرت

الله اعلم بالخير بعد. قال
وفي المجلس الحسن بن علی
فقال والله لو سمّٰی الثالث
لسمّٰی عثمان (ازالۃ الخفاء ص۶۸ ج۱)

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ ان کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون افضل ہے راوی کہتے ہیں کہ مجلس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم اگر آپ کسی تیسرے کا نام لیتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیتے۔

ازالۃ الخفاء مسند علی رض (ص۶۶ تا ص۷۱ ج۱) میں وہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرات شیخین کی فضیلت ومنقبت میں مروی ہیں۔ اسی سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے:

عن قيس بن عباد قال قال لی
علی ابن ابی طالب ان رسول الله
صلی الله عليه وسلم مرض
ليالی واياما ينادی بالصلوٰة
فيقول مروا ابابكر يصلی
بالناس: فلما قبض رسول
الله صلی الله عليه وسلم
نظرت فاذا الصلوٰة علم

قیس بن عباد کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کئی دن رات تک بیمار رہے، نماز کی اذان ہوتی تو ارشاد فرماتے کہ ابوبکر کو کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو میں نے غور کیا کہ نماز اسلام کا سب سے بڑا

الاسلام وقوام الدین، فرضینا لدنیانا۔ من رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا، فبایعنا ابا بکر (ص۶۸)

شعار اور دین کا سب سے بڑا مدار ہے پس جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کے لئے پسند کیا ہم نے اس کو اپنی دنیا کے لئے پسند کر لیا۔ اس لئے ہم نے ابوبکر رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

پونکہ حضرت ابوبکر رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام اور باقی صحابہؓ کو بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہم مقتدی بنایا تھا۔ اور چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضؓ کی اقتدا کی۔ ان کو اپنا امام اور خلیفہ تسلیم کیا اس لئے حضرات اہل سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اقتدا کرتے ہوئے ان تینوں اکابر کو، جو حضرت علی رضؓ کے امام تھے۔ ان سے افضل سمجھتے ہیں اور ان تین کے بعد آپؓ کو تمام صحابہ سے افضل مانتے ہیں۔ الغرض اہل سنت آپ کے حق میں افراط و تفریط کے قائل نہیں، بلکہ جادۂ اعتدال پر قائم ہیں۔ اس جادہ اعتدال سے ہٹ کر شیعوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کس طرح غلو کیا ہے؟ اس کے چند نمونے جناب مصنف کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۶۱، جو آیت مباہلہ کے نام سے مشہور ہے۔ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

" یہ حضرت علی رضؓ کی اعلیٰ فضیلت ہے کہ نفس رسول، خدا

کے حکم سے قرار پائے اور تمام انبیاء سے افضل ٹھہرے"۔ (ص۱۰۴)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ ہی سے افضل نہیں بلکہ نعوذ باللہ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ مصنف نے یہ عقدہ حل نہیں کیا کہ جب ان کے بقول علیؓ نفس رسولؐ ہیں تو حضرت فاطمہؓ سے ان کا نکاح کیسے جائز ہوا۔

۲۔ سورہ زخرف کی آیت ۴۵ میں ہے:

"اور ہم نے تم سے پہلے اپنے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں ان سب سے دریافت کر دیکھو کیا ہم نے خدا کے سوا اور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے"۔ (ترجمہ فرمان علی)

اس کے ذیل میں جناب مصنف لکھتے ہیں:

ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ شب معراج میں میرے پاس ایک فرشتہ آیا۔ اور اس نے کہا کہ اپنے قبل کے انبیاء سے پوچھئے کہ وہ لوگ کس بات پر پیغمبرؑ بنا کر بھیجے گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں نے ان پیغمبروں سے پوچھا۔ تو ان لوگوں نے جواب دیا۔ کہ آپ کی رسالت اور علی بن ابی طالب کی ولایت پر بھیجے گئے۔

(دیکھو تفسیر نیشاپوری جلد ۳ صفحہ ۲۲۹ مطبوعہ طہران و (ص۸۸۴)

کیوں نہ ہو جب علیؓ تمام انبیاء سے افضل ہیں تو ان سے علی کی ولایت کا عہد بھی ضرور لیا گیا ہوگا ـــ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۳۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۲ میں "عہد الست" کا ذکر ہے ۱۲،

کے ذیل میں جناب مصنف لکھتے ہیں :

" یہ اقرار عہد الست کا ہے جب دنیا میں کوئی موجود نہ تھا اور خدا نے محض اپنی خدائی کا اقرار نہ لیا تھا۔ بلکہ حضرت رسول ؐ کی رسالت اور حضرت علی رضؓ کی امارت و ولایت کا بھی۔ اور وہ بھی محض انسانوں سے نہیں بلکہ فرشتوں سے بھی۔ چنانچہ یہ حدیث اسی آیت کی تائید یا تفسیر میں وارد ہوئی ہے۔

حضرت رسول ؐ نے فرمایا کہ لوگ اگر جانتے کہ علی رضؓ کا نام امیر المؤمنین کب رکھا گیا۔ تو ان کی فضیلت سے انکار نہ کرتے۔ علی رضؓ امیر المؤمنین اس وقت کہلائے جب آدم کا روح وجسد درست نہ ہوا تھا۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے واذ اخذ الآیۃ الست بربکم تو فرشتوں نے کہا ہاں! تب خدا نے فرمایا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے نبی ہیں اور علی تمہارے امیر ہیں " (صـ۲۰۸ـ)

یعنے خدا نے اس موقعہ پر کسی نبی کی رسالت ونبوت کا تو عہد نہیں لیا۔ مگر علی رضؓ کی امارت و ولایت کا عہد لینا (اور وہ بھی انسانوں سے نہیں بلکہ فرشتوں سے) ضروری سمجھا کیونکہ علی رضؓ کی امارت و ولایت کے مقابلہ انبیاء کی رسالت ونبوت کی کیا حیثیت ہے ـــــــــ مگر قرآن کریم میں صرف عہد ربوبیت کا ذکر ہے کیا خدا ـــ نعوذ باللہ ـــ بھول گیا تھا کہ اس رافضی روایت کے ذریعہ اسے یاد دہانی کی ضرورت پیش آئی۔؟

۴۔ سورہ الاحزاب کی آیت ۵۶، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم ہے، کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ایک روایت میں ہے کہ شجر اسلام کی شادابی کے قبل ملائکہ نے حضرت علی رضؓ پر مدتوں درود بھیجا۔ مناقب مرتضوی میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسولؐ سے سنا کہ آپ فرماتے تھے مجھ پر اور علی پر ملائکہ نے سات بار درود بھیجا" (ص۶۴)

جب علی رضؓ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ اور خدا کی خدائی کے ساتھ ان کی امارت و ولایت کا عہد لیا گیا ہے تو فرشتے کسی اور پر درود بھیجیں نہ بھیجیں مگر علی رضؓ پر ضرور بھیجتے ہوں گے مگر اس روایت کے گھڑنے والوں کو یہ یاد نہیں رہا کہ شیعہ اصول کے مطابق شجر اسلام شاداب ہی کب ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ محنت کے نتیجہ میں ۳-۴ سچے مسلمان ہوئے، باقی سب ایسے ویسے ہی تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سب کے سب یا تو مرتد ہو گئے۔ یا مرتدین کے حلقہ بگوش ـــــ کیا یہی شجر اسلام کی شادابی ہے؟

۵ ۔ سورۃ البقرہ کی آیت میں ذکر ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لئے۔ جن کی برکت سے اللہ تعالٰے نے ان کی توبہ قبول فرمائی ۔ مصنف لکھتے ہیں،

"وہ کلمات جن کی برکت سے خدا نے حضرت آدم کی توبہ قبول فرمائی، اسمائے پنجتن یعنے محمد۔ علی۔ فاطمہ۔ حسن حسین علیہم السلام ہیں" (ص۱۵)

۹۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۳۳ کے تحت لکھتے ہیں:

"ابن عباس رضؓ سے منقول ہے کہ حضرت رسول آل ابراہیم سے ہیں ان کا یہ بھی قول ہے کہ محمد و آل محمدؐ حضرت ابراہیم کے اہل بیت ہیں۔ پس اس آیت سے صاف صریحی طور پر ثابت ہوا کہ خدا نے حضرت رسول اور ان کے اہل بیت کو سارے جہان سے افضل بنایا ہے فرشتے ہوں یا جنات آدمی ہوں یا غیر، حتیٰ کہ پیغمبروں پر بھی فضیلت ثابت ہو گئی" (ص ۹۴)

چشم بد دور، صرف حضرت علی رضؓ ہی نہیں بلکہ تمام اہل بیت انبیاء کرامؑ سے افضل ہو گئے۔ یہ ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعی غلو کے چند نمونے، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح معصوم اور مفترض الطاعۃ ہیں بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل ہیں عہد الست میں شریک ہیں۔ ہر نبی سے ان کا عہد لیا گیا ہے اور تمام انبیاء کرام تقرب الی اللہ کے لئے ان کے طفیلی ہیں نعوذ باللہ من الغوایۃ والغباوۃ:

ب: وصایت علی رضؓ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں شیعوں کے بے جا غلو کی ایک مثال ان کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی، جانشین اور خلیفہ بلافصل تھے چنانچہ

اس غلو کو اپنے کلمہ واذان تک میں داخل کر لیا ہے۔ حالانکہ اس غلو پر نہ تو وہ قرآن کریم کی کوئی نص پیش کر سکتے ہیں۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد گرامی ــــــــــ اس لئے شیعوں کو اس مقصد کے لئے جھوٹی روایات کا ایک طومار تیار کرنا پڑا۔ لیکن وہ روایات خود ہی " دروغ گورا حافظ نباشد " کی شہادت دے رہی ہیں اور ان میں ایسا اختلاف و تناقض ہے کہ کسی شیعہ کے لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنا خلیفہ اور وصی کب مقرر کیا تھا۔ جناب مصنف نے بھی موقعہ بے موقعہ ان روایات کو اپنے حواشی قرآن کی زینت بنایا ہے یہاں بطور نمونہ ان کے چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ اوپر مصنف کی ذکر کردہ روایت نقل کی جا چکی ہیں کہ عہدالست میں اللہ تعالےٰ نے اپنی خدائی کے اقرار کے ساتھ حضرت علیؓ کی امارت وولایت کا عہد لیا تھا۔

۲۔ سورۃ الشعراء کی آیت ۲۱۴ وانذر عشیرتك الاقربین کے ذیل میں جناب مصنف نے مندرجہ ذیل روایت درج کی ہے:

" صاحب تفسیر معالم التنزیل نے اس آیت کی شان نزول میں یہ روایت ابن عباسؓ سے ذکر کی ہے وہ کہتے ہیں مجھ سے حضرت علی نے بیان کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت نے مجھ سے فرمایا خدا کا ایسا حکم ہے۔ مگر چونکہ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کو اس حکم کے سنانے سے رنج کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس وجہ سے ساکت

تھا مگر پھر دوبارہ باعتاب حکم آیا ہے۔ اب کوئی چارہ نہیں تو تم کچھ روٹی، بکرے کی ایک ران اور تھوڑے دودھ کا سامان کر رکھو۔ جب شام ہوئی تو آپ نے قریش میں عباس، حمزہ، ابولہب، ابو طالب ایسے چالیس آدمیوں کو بلا بھیجا اور وہ کھانا ان کے سامنے رکھا گیا۔ آپ نے پہلے اپنا ہاتھ لگا دیا۔ اس کے بعد ان سے کھانے کو فرمایا سب کے سب کھا کر سیر ہو گئے حالانکہ وہ کھانا بظاہر ایک آدمی سے زیادہ کھانے کا نہ تھا۔ اب آپ نے چاہا کہ کچھ بات کریں کہ ابولہب مردود نے بات کاٹ کر کہا کہ تمہارے صاحب نے بڑا سخت جادو کیا ہے یہ سننا تھا کہ سب کے سب چل دیئے۔ دوسرے دن حضرت نے اسی سامان کا حکم دیا اور کھانے کے بعد فرمایا۔ اے فرزندان عبد مناف! میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی نیکی لے کر آیا ہوں اور ایسی اچھی خبر لایا ہوں۔ کہ اس سے قبل کوئی تمہارے پاس نہیں لایا، اور مجھے خدا نے تمہیں اس کی طرف دعوت کا حکم دیا ہے تو تم میں سے کون ایسا ہے جو میرا وزیر بنے اور میرے کام میں میری مدد کرے تاکہ وہ میرا بھائی۔ میرا وصی اور میرا خلیفہ تمہارے درمیان ہو۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا مگر حضرت علی رض نے عرض کی "میں یا رسول اللہ"، اسی طرح حضرت نے تین مرتبہ فرمایا اور بجز حضرت علی رض کے

سُنو کسی نے جواب نہ دیا تب آپ نے فرمایا تو ہی میرا وزیر، میرا وصی، میرا بھائی، میرا خلیفہ ہے — اور یہ روایت باختلاف الفاظ تفسیر درّ منثور، مسند احمد بن حنبل، ریاض النضرہ وغیرہ کتب اہل سنت[1] میں بھی مذکور ہے" (ص۱۶۴ تا ۱۶۵)

اس روایت سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

اول یہ کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت علانیہ کا آغاز فرمایا ہے۔ اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ کو اپنے اہل قرابت کو دعوت دینے کا حکم ہوا تھا۔ روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فریضہ سے متعلق حکم خداوندی کی اس وقت تک تعمیل نہیں فرمائی۔ جب تک آپ پر عتاب الٰہی نازل نہیں ہوا۔

دوم یہ کہ اس موقعہ پر آپ نے بحکم خداوندی صرف اپنے اہل قرابت کو بلایا تھا جن میں آپ کے چچاؤں کا نام سرفہرست تھا۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی آپ کی دعوت قبول نہیں کی بلکہ کھا پی کر ٹکا سا جواب دیدیا۔ بعد میں حضرت عباس رضہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کو تو اسلام کی سعادت نصیب ہوئی مگر ابولہب اور ابو طالب بدستور اپنی حالت پر رہے۔

سوم یہ کہ اس موقعہ پر آپ کے عزیزوں میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی دعوت قبول کی۔ جن کی عمر اس وقت غالباً تیرہ سال تھی۔ اور آپ نے اپنے اہل قرابت کے درمیان (اس وقت جو سب کے سب غیر مسلم تھے) ان کو اپنا وزیر

[1] نقل مطابق اصل

اور خلیفہ مقرر فرمایا۔

رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امت کے خلیفہ بھی حضرت علیؓ ہی ہوں گے؟ اس کا تصور اس وقت دور دور بھی نہیں تھا۔ کیونکہ آغاز دعوت کے وقت ابھی امت ہی کہاں وجود میں آئی تھی۔ جس کی خلافت وامارت کا سوال پیدا ہوتا۔

چہارم: جناب مصنف نے اس روایت کو مستند باور کرانے کے لئے اہل سنت کی کتابوں کے حوالے دئیے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اہل سنت کے نزدیک یہ روایت کس پائے کی ہے؟ حافظ ابن کثیرؒ نے اس روایت کو اپنی تفسیر میں نقل کر کے لکھا ہے:

تفرد بهذا السياق عبد الغفار بن القاسم بن ابی مریم وهو متروك كذاب شيعی اتهمه علی بن المدينی وغيره بوضع الحديث وضعفه الائمة رحمهم الله (ص۳ ج۲)	اس روایت کو تنہا عبد الغفار بن قاسم بن ابی مریم نقل کرتا ہے اور وہ متروک کذاب رافضی ہے۔ علی بن مدینی وغیرہ نے کہا کہ یہ شخص روایتیں گھڑا کرتا تھا اور ائمہ نے اس کی تضعیف کی ہے۔

۳۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ (یایها الرسول بلّغ ما انزل الیك من ربك) کے تحت مصنف لکھتے ہیں:

۱۰۔ ابن ابی حاتم نے ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں حضرت علیؓ کے بارے میں نازل

ہوئی۔ اسی وجہ سے ابن مردویہ نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس آیت کو یوں پڑھتے تھے۔" یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیاً مولی المؤمنین۔ وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ واللہ یعصمک من الناس"! (اے رسول جو حکم" اس بات کا کہ علی تمام مؤمنین کے حاکم ہیں"! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ (دیکھو تفسیر درمنثور ملا جلال الدین سیوطی۔ جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ سطر ۸ مطبوعہ مصر۔ سچ یوں ہے کہ جناب رسالت مآب ایک عرصہ سے چاہتے تھے کہ علی ابن ابی طالب کو اپنا خلیفہ نامزد کردیں مگر کچھ اپنے ساتھیوں کی مخالفت کے خوف سے اس پر اقدام نہ کرتے تھے۔ آخر خدا نے آخری حج کے بعد راستہ میں یہ تاکیدی حکم نازل کیا۔ تب تو حضرت مجبور ہوگئے۔ اور ایک مقام پر جس کا نام غدیرخم تھا ایک لاکھ آدمیوں کے سامنے اپنا خلیفہ نامزد کیا"۔ (ص ۲۱۲)

مصنف کی ان عبارات سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ ایک یہ کہ غدیرخم سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا۔ اس لئے شیعہ صاحبان کی وہ تمام روایات ازخود غلط ثابت ہوتی ہیں

جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا وصی بنایا تھا۔

دوم یہ کہ اس واقعہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نامزدگی تب ثابت ہوتی ہے جب کہ اس آیت کریمہ میں تحریف کی جائے۔ کیونکہ قرآن کریم میں یہ آیت جس شکل میں موجود ہے اس کا ولایت علیؓ سے کوئی تعلق نہیں، اور راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں " ان علیا مولی المؤمنین "، کے الفاظ بھی اس آیت میں پڑھے جاتے تھے۔ پس اگر یہ روایت صحیح تسلیم کی جائے تو قرآن کریم غلط ہوتا ہے۔ اور اگر قرآن کریم کو صحیح اور درست تسلیم کیا جائے تو اس روایت کے بموجب ولایت علیؓ بھی غلط ہوجاتی ہے ہمیں معلوم ہے کہ شیعہ کو قرآن سے کوئی دلچسپی نہیں ان کا اصرار غالباً یہی ہوگا کہ یہ جھوٹی روایت بالکل سچی ہے اور قرآن نعوذ باللہ غلط ہے۔ بہرحال شیعہ جب تک قرآن کو غلط نہ کہیں ولایت علی ثابت نہیں ہوتی۔

سوم: یہ کہ جناب مصنف نے مولیٰ کے معنیٰ حاکم کے کئے ہیں، حالانکہ مولیٰ کا لفظ کثیر المعانی ہے۔ قرآن کریم میں ہے" فان الله هو مولاه وجبريل وصالح المؤمنين " کیا یہاں یہ معنیٰ کئے جائیں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ۔ جبریل اور نیک مؤمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حاکم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے تھے" انت مولانا "، (تم ہمارے مولیٰ ہو) کیا اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تم ہم سب کے حاکم اور خلیفہ

ہو ؟ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو کسی موقعہ پر مولی المومنین فرمایا تو اس کے معنے خلیفہ بلا فصل کہاں سے نکل آئے۔

چہارم: مصنف کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی نعوذ باللہ سیاسی لیڈروں کی طرح اپنے لوگوں سے خائف رہتے تھے کہ کہیں آمادۂ مخالفت ہو کر ساتھ نہ چھوڑ دیں

پنجم: علی رض کی خلافت و نامزدگی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عرفات و منیٰ کے عظیم الشان اجتماعات کو چھوڑ کر ایک گمنام دیرانے کا انتخاب فرمایا۔ جسے غدیر خم کہا جاتا ہے حجۃ الوداع میں اس کا اعلان نہ کرنے میں بھی شاید یہی حکمت ہو گی کہ لوگ برگشتہ ہو کر نہ چلے جائیں۔

ششم: بقول شیعہ غدیر خم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رض کو خلیفہ نامزد کرتے ہیں۔ لیکن اس کے دو ماہ بعد حضرت علی رض کے بجائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے مصلی پر کھڑا کر دیتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رض کو ان کا مقتدی بنا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر غدیر خم میں ان کو خلیفہ نامزد کیا تھا تو مرض الوفات میں ان کو اس منصب سے معزول کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین کر دیا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

بانیان مذہب شیعہ نے آفتاب نصف النہار پر خاک ڈالنے کے لئے "وصایت علی" کا جو عقیدہ تصنیف کیا اس کے مقاصد

حسب ذیل تھے ۔

۱- قرآن کریم کو تحریف شدہ ٹھہرانا. کیونکہ تحریف قرآن کے بغیر "ولایت علی" ثابت نہیں ہوتی۔

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ناکام ثابت کرنا. کہ آپ کی ۲۳ سالہ محنت کا نتیجہ چند منافقوں کی بھیڑ جمع کرنے کے علاوہ کچھ ظاہر نہیں ہوا۔

۳- پوری امت اسلامیہ کو گمراہ قرار دینا. کیونکہ جب " وصی رسول" کا حق دبا کر لوگ مرتد ہو گئے ۔ اور سب نے (نعوذ باللہ) ایک ظالم اور مرتد کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو ایک فرد بھی اسلام پر قائم نہ رہا ۔

۴- یہ ثابت کرنا کہ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ۔ ایک دن بھی آگے نہیں چلا ــــــــ امام غائب کے زمانے میں حقیقی اسلام رونما ہوگا ۔ مگر نہ وہ آئیں اور نہ اسلام آئے ۔ گویا "وصایت علی" کا عقیدہ عداوت قرآن، عداوت رسول، عداوت اسلام اور عداوت امت اسلامیہ کے لئے تصنیف کیا گیا ۔ اسی لئے حضرت علی رض نے اپنی محبت میں غلو کرنے والوں کو گمراہ اور خارج از اسلام فرمایا۔

ج ۔ افسانہ نگاری

اسلامی تاریخ میں افسانہ نویسی کا فن شاید سب سے پہلے شیعوں کی ایجاد ہے، واقعات کی فرضی و افسانوی تصویریں مرتب کرنا اور ان

پر عقائد و نظریات کی بنیادیں استوار کرنا شیعوں کا طرۂ امتیاز ہے چونکہ ان کی افسانہ طرازی کا اصل ہدف "ائمۂ[1] علی رضؓ" کی تنقیص ہے اس لئے ان کے نزدیک مدح علی رضؓ کی تکمیل نہیں ہوتی جب تک کہ باقی سب کی نفی نہ کی جائے ۔ جناب مصنف نے اس افسانہ نگاری کے نمونے اپنے حواشی، قرآن میں جگہ جگہ پیش کئے ہیں چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

۱- سورۃ الانفال کی آیات ۶۱ تا ۶۴ میں ارشاد ہے :

"اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو۔ اور خدا پر بھروسہ رکھو (کیونکہ) وہ بیشک سب کچھ سنتا جانتا ہے اور اگر وہ لوگ تمہیں فریب دینا چاہیں تو (کچھ پرواہ نہیں) خدا تمہارے واسطے یقینی کافی ہے، (اے رسول) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے اپنی خاص مدد اور مومنین سے تمہاری تائید کی اور اسی نے ان (مسلمانوں) کے دلوں میں باہم ایسی الفت پیدا کر دی کہ اگر تم جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر ڈالتے ۔ تو بھی ان کے دلوں میں ایسی الفت پیدا نہ کر

---

[1] شیعہ حضرات دوازدہ امام کے قائل ہیں، لیکن افسوس کہ ان تین ائمہ کو نہیں مانتے جن کے ہاتھ پر مولائے علی رضؓ نے بیعت کی۔ جن کے نام پر اپنی اولاد کے نام رکھے اور جن کو رشتے دیئے ۔ میں نے انکو "ائمہ علی" کے لقب سے بے محل تعبیر نہیں کیا۔ امام اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے، باقی دو حضرت علی رضؓ کے پسندیدہ ۔

سکتے۔ مگر خدا ہی تھا جس نے ان میں باہم الفت پیدا
کی، بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے (۶۳) اے
رسولؐ، تم کو بس خدا اور جو مؤمنین تمہارے تابع فرمان
ہیں۔ کافی ہیں (۶۴) (ترجمہ فرمان علی)

ان آیات میں جن مومنین کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کا ذکر کیا گیا ہے مصنف کے نزدیک اس سے صرف حضرت علی رض مراد ہیں؛ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"ابن عساکر نے ابوہریرہ رض سے روایت کی ہے۔۔۔۔
کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ عرش پر لکھا ہوا ہے کہ میرے
سوا کوئی معبود نہیں۔ میں یکتا ہوں، میرا کوئی شریک نہیں۔
محمدؐ میرا بندہ اور میرا رسول ہے، میں نے اس کی علی رض سے
مدد کی ہے اور یہی مطلب ھو الذی ایدك الآیۃ
کا ہے" (ص۲۳)

لیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار صرف علی رض تھے اور وہی "مومنین کی جماعت" ہیں۔ باقی صفر۔

۲۔ قیدیانِ بدر کا واقعہ مشہور ہے، جس کے بارے میں سورۂ الانفال کی آیت ۶۷ ما کان لنبی ان یکون لہ اسرٰی الآیۃ نازل ہوئی۔ جناب مصنف لکھتے ہیں:

"جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں رسولؐ نے اصحاب سے
مشورہ کیا، حضرت ابوبکر رض نے کہا کہ یہ لوگ آپ کی قوم
کے ہیں اور رشتہ دار ہیں ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیجئے۔

حضرت حمزہ رض نے کہا یہ لوگ مشرکوں کے پیشوا ہیں انہوں نے آپ کو شہر بدر کیا ہے ان پر رحم کھانا مناسب نہیں حکم دیجیئے کہ سب کی گردن مار دی جائے، عباس رض کو میرے حوالے کیجیئے۔ عقیل کو علی رض کے، علی ہٰذا القیاس۔ اللہ رے جوشش ایمان۔ سعد بن معاذ نے کہا کہ ان سب کو ایک گڑھے میں ڈال کر اوپر سے کوڑا رکھ کر آگ لگا دیجیئے۔ حضرت رسولؐ نے فرمایا۔ تین حال سے خالی نہیں۔ یا یہ لوگ فدیہ دیں، یا اسلام قبول کریں یا قتل کیئے جاویں۔ مگر کچھ اصحابؓ نے فدیہ لے کر سب کو چھوڑ دیا۔ اور کسی کو قتل نہ کیا دوسرے روز حضرت رسولؐ کو دیکھا کہ وہ بہت رنجیدہ بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکر رض نے سبب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی طمع میں فدیہ لینے سے عذاب اتنا قریب تھا جیسے یہ درخت۔ اسی بناء پر خدا نے یہ آیت نازل فرمائی " (ص۲۳۱)

اسی کے ساتھ مصنف یہ بھی لکھتے ہیں:

"ملا عبدالرزاق محدث حنبلی نے اپنی کتاب عزالدین میں روایت کی ہے کہ یہ آیت خاص حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی"

اس واقعہ میں مصنف نے جو افسانہ نگاری کی ہے اس کے چند نکتے ملاحظہ فرمائیے:-

الف: قیدیان بدر کے قتل کا مشورہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا

لیکن مصنف کو " داماد علی " اور " امام علی " کا نام لینا گوارا نہیں مصنف نے ان کی جگہ حضرت حمزہ رضؓ کا نام جڑ دیا اور " اللہ رے جوش ایمان " کہہ کر ان کو داد بھی دے دی۔

ب : حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موافقت فرمائی تھی اس لئے وہ عتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک حال تھے۔ اور یہ ایسی منقبت ہے جو کسی دوسرے کو میسّر نہیں آئی ۔ مگر مصنف ان پر " طمع " کی تہمت لگاتے ہیں۔

ج : مصنف بتاتے ہیں کہ " اصحاب نے سب کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا "——— حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ تین آدمیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کیا گیا۔

د : اس آیت کریمہ میں حضرت علی رضؓ کا دور و نزدیک کوئی ذکر نہیں مگر مصنف بتاتے ہیں کہ یہ آیت خاص حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی۔

۳۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۵ کے تحت جنگ احد کا واقعہ لکھتے ہیں:

" اس جنگ میں لشکر اسلام کے علمبردار حضرت علی رضؓ تھے اور کفار کا طلحہ بن ابوطلحہ دارمی۔ سب سے پہلے انہی دونوں میں مٹھ بھیڑ ہوئی۔ حضرت علی رضؓ نے ایک ہی وار میں اس کو واصل جہنم کیا اس کے بعد ابوسعید بن ابوطلحہ نے علم اٹھایا اور اسکو بھی آپ نے قتل کیا اس کے بعد باری باری نو آدمیوں نے اسے اٹھایا اور آپ کے ہاتھ سے فی النار ہوئے آخر صواب نامی ایک حبشی غلام نے ہمت کی اور آپ کے سامنے آیا اور علمبرداری کے عہدے پر فائز ہوا آخر وہ بھی ٹھنڈا ہوگیا تب ایک عورت عزہ بنت علقمہ نے

اس نشان کو بلند کیا اور ایک طرف انصار نے قریش پر حملہ کیا اس کے
بعد پھر سب کے سب مہاجر و انصار بھاگتے نظر آئے ایک طرف
حضرت امیر حمزہ نے کشتوں کے پشتے لگائے استنے میں ہندہ زوجہ
ابوسفیان نے ایک حبشی غلام کو اپنے وصل کے وعدہ پر ابھارا کہ تو
محمدؐ یا علیؓ یا حمزہ کا سر کاٹ لا وہ بولا محمدؐ تک تو میری رسائی نہیں ہو سکتی
اور علیؓ سے خوف معلوم ہوتا ہے، مگر حمزہ کو قتل کرتا ہوں" (صلا۱۲۴)

ذرا واقعہ کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ مہاجرین و انصار سب بھاگتے
نظر آئے۔ حضرت حمزہ شہید ہو گئے۔ میدان تنہا حضرت علیؓ نے
جیت لیا۔ اور "ہندہ زوجہ ابوسفیان نے حبشی غلام کو اپنے وعدۂ
وصل پر ابھارا" ایسی گندی گالی ہے جو ارباب متعہ ہی کے قلم
سے نکل سکتی ہے۔

۴ ــــــ جنگ احزاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خندق کے تیار ہونے کے تین روز بعد کفار کا لشکر بھی
آگیا۔ اور مسلمانوں کے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ کفار
کا لشکر مدینہ سے پچھم میدان میں خیمہ زن ہوا۔ مسلمان تو
خندق کے قلعہ میں تھے اور کفار محاصرہ کئے ہوئے
یہاں تک کہ ستائیس روز گذر گئے۔ فریقین سے پتھراؤ
اور تیر چلتے رہے اور موقعہ پاکر شب خون بھی ہوتے
اور حضرت ان کا دفعیہ کرتے مگر جب سختی انتہا کو پہنچی
اور مسلمانوں کی حالت وہ تھی جس کو خدا نے خود بیان
فرما دیا ہے تو آپ نے سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ

سے مشورہ کیا۔ کہ آیا ان لوگوں کو کچھ دے لیکر واپس کر دیں۔ دونوں نے نہایت دلیری اور جوش کے ساتھ جواب دیا کہ اگر اس بارے میں وحی آئی ہو تو جائے دم زدن نہیں۔ ورنہ ہم ہرگز اس کو پسند نہیں کرتے، ان کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ دیں گے۔ اس وقت آپ کو بھی ان کی طرف سے اطمینان ہوا (گویا پہلے آپ ان کی طرف مطمئن نہیں تھے۔ ناقل)

اب ادھر کا حال سنیئے۔ عمرو بن ود نے اپنے ساتھیوں سے کہا ہم کہاں تک محاصرہ کئے رہیں گے۔ ہم میں اب تاب ضبط باقی نہیں۔ چلو خندق پھاندکر حملہ کریں۔ غرض چند آدمیوں کو لے کر اچانک ایک دروازے سے اس پار پہنچا اور اپنا نیزہ گاڑکر جوش شجاعت میں گھوڑا کدانے لگا۔ اور مقابل طلب ہوا۔ حضرت نے اپنے اصحاب سے پوچھا سب نے اپنے سر جھکا لیئے مگر حضرت علی اٹھ کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ اور دوبارہ آواز دی پھر سب کے سب چپ ہو رہے۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے عرض کی یا حضرت کس کو اپنی جان دوبھر ہے کہ اس کے مقابلے کو جائے، میں ایک دفعہ اس کے ساتھ سفر میں تھا اور یہ خالی ہاتھ تھا۔ کہ ایک ہزار آدمیوں نے ہم پر حملہ کیا تو اس نے اپنے اونٹ کی سپر بنائی۔

اور ایک کھجور کے درخت کا حربہ بنا کر ان پر حملہ آور ہوا اور سب کو مار بھگایا اور ان کو لوٹ بھی لیا یہ سن کر اصحاب پر جو اثر پڑا وہ ظاہر ہے۔ غرض سوائے حضرت علیؓ کے اور کوئی تیار نہ ہوا، آپؐ نے فرمایا اے علیؓ! یہ عمرو بن ود ہے۔ عرض کی اگر وہ عمرو ہے تو میں بھی علی ہوں۔ غرض تین دفعہ پوچھنے کے بعد اپنی زرہ حضرت علی کو پہنائی، اپنا عمامہ باندھا۔ اور اپنی تلوار دی اور رخصت کر کے دعا کی۔ خداوندا تو اس کا ہر طرف سے نگہبان رہنا، خدایا! میرے تین مددگار تھے عبیدہؓ کو تو نے جنگ بدر میں اٹھا لیا اور حمزہ کو احد میں اب یہی ایک باقی رہ گیا ہے تو ہی اس کا محافظ ہے۔

غرض جناب امیر اس کے پاس پہنچے تو پہلے اس نے آپ کے مقابلہ سے انکار کیا بعد اصرار وہ مقابل ہوا تو دونوں میں حملے پر حملے ہوتے رہے اور اس قدر غبار بلند ہوا کہ دونوں چھپ گئے۔ آخر اس نے ایک وار کیا جو آپ نے سپر پر روکا۔ مگر اس پر بھی کچھ سر زخمی ہو گیا۔ پھر آپ نے زخم باندھ کر ایک وار کیا۔ تو اس کا پاؤں کٹا۔ اور گرا۔ آپ نے فوراً اس کے سینہ پر سوار ہو کر اس کا سر کاٹا۔ اور نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اس کا سر لئے حضرت رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی حملہ کے بارے

میں رسالتمآب ؐ نے فرمایا تھا۔ "ضربة علی یوم الخندق افضل من عبادة الثقلين الی یوم القيمة"۔ خندق کے روز علی کی ضربت جن وانس کی عبادت سے قیامت تک افضل ہے۔ عمرو بن ودّ کے قتل ہونے کے بعد اس کے ساتھی تتر بتر ہوگئے۔" (صـ۵۳)

لیجیئے جنگ خندق بھی صرف حضرت علیؓ نے لڑی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکلوتے مددگار تھے۔ ان کے سوا آپ کا کوئی مددگار نہ تھا اور یہ بھی کہ سارے جن وانس کی عبادت ایک ضربت علیؓ کا پاسنگ نہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

۵۔ سورہ التوبہ کی آیت ۱۰۰ (والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار۔ الاٰیۃ) میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تین جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سابقین اولین مہاجرین وانصار۔ اور ان کے متبعین بالاحسان۔ اور ان تینوں جماعتوں کے لئے دنیا میں رضی الله عنهم ورضوا عنه ؕ کی بشارت کا اور آخرت میں دائمی جنت کا اعلان فرمایا ہے۔ لیکن جناب مصنف کے نزدیک یہ ساری فضیلت صرف علیؓ کے ساتھ مخصوص ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"خلاصہ یہ کہ ان صفات کے مستحق اصلی طور پر حضرت علیؑ ہی ہیں۔" (صـ۲۶۲)

چونکہ مصنف کو قرآن کریم کی تفسیر میں بھی افسانہ نگاری مقصود ہے اس لئے انہیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں ذکر تین

جماعتوں کا ہے تین جماعتوں کی صفات کسی فرد واحد کے ساتھ کیسے مخصوص ہوگئیں ۔

۲۔ سورہ مائدہ کی آیت ۵۴ میں فرمایا گیا ہے :۔

یاایھاالذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین۔ اعزۃ علی الکافرین۔ یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ۔ واللہ واسع علیم۔

اے ایماندارو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا۔ تو (کچھ پرواہ نہیں پھر جائے) عنقریب ہی خدا ایسے لوگوں کو ظاہر کر دے گا۔ جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا۔ اور وہ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ ایمانداروں کے ساتھ منکسر اور کافروں کے ساتھ کڑے ۔ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پرواہ نہ کریں گے۔ یہ خدا کا فضل وکرم وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا تو بڑی گنجائش والا واقف کار ہے (ترجمہ فرمان علی)

اس آیت کریمہ میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ جب فتنۂ ارتداد رُونما ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان مرتدین کے مقابلے میں ایک ایسی قوم کو ظاہر فرمائیں گے۔ جو اللہ تعالیٰ کے محبوب اور محب ہوں گے اہل ایمان کے ساتھ نرم خُو اور متواضع اور کافروں کے مقابلہ میں

سخت گیر اور غالب ہوں گے ۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرتدین سے جہاد کریں گے اور کسی کی ملامت کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے۔

یہ فتنۂ ارتداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں رونما ہوا جب بنو حنیفہ میں مسیلمۂ کذاب نے، بنو اسد میں طلیحہ اسدی نے اور یمن میں اسود عنسی نے دعوی نبوت کیا اور بہت سی مخلوق کو اپنے ساتھ ملا لیا پھر وصال نبویؐ کے بعد عرب کے بہت سے قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، یہ اسلامی تاریخ میں پہلا فتنۂ ارتداد تھا۔ جس کا مقابلہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت نے نہایت پامردی سے کیا جس سے سفیدۂ صبح کی طرح واضح ہو گیا کہ آیت بالا میں اسی جماعت کے بروئے کار لانے کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اور یہ کہ اس سے اگلی دو آیتیں بھی حضرت ابوبکرؓ اور انکی جماعت سے متعلق ہیں:

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلٰوۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون ۔ ومن یتول اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون	تمہارے دوست تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور ایمان دار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا اور جو شخص اللہ تعالےٰ سے دوستی رکھے گا۔ اور اس کے رسول سے اور ایمان دار لوگوں سے، سو اللہ کا گروہ بلاشک غالب ہے۔

پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جماعت " حزب اللہ

ہے جو سب پر غالب آکر رہی اسی جماعت کے ایک فرد حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی ہیں۔ لیکن جناب مصنف ان آیات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں چنانچہ پہلی آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ اس آیت کے شان نزول میں اختلاف ہے۔ اور بعض اقوال کے موافق حضرت علی رض ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جو صفات خداوند عالم نے اس آیت میں بیان کئے ہیں اس کا سچا مصداق آپ کے سوا اصحاب رسولؐ میں دوسرا نہیں ہو سکتا" (ص ۲۰۸)

اور دوسری آیت کے تحت لکھتے ہیں:۔

"یہ آیت باتفاق مفسرین شیعہ و سنی موافق و مخالف حضرت علی رض کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس سے تصریحی طور پر حضرت علی رض کا خلیفہ بلافصل ہونا ثابت و واضح ہوتا ہے جب آپ نے حالت رکوع میں سائل کو انگشتری دی" (ص ۲۰۹)

یہ روایت تو رافضیوں کی تصنیف ہے جس کے سہارے جناب مصنف اس آیت کو حضرت علی رض کی خلافت بلافصل پر نص صریح فرمارہے ہیں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان آیات میں جس فتنۂ ارتداد کی خبر دی گئی ہے اور جس کے مقابلہ میں ایک قوم کو لانے کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اور جسے "حزب اللہ" کہہ کر ان کے غلبہ کی بشارت دی گئی ہے۔ وہ فتنۂ ارتداد کونسا تھا؟ کس نے ان مرتدین

کا مقابلہ کیا؟ اور "حزب اللہ" کی حیثیت سے کون غالب آیا؟ یہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کی جماعت تھی۔ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

۷۔ سورۂ فتح کی آخری آیت (محمد رسول اللہ والذین معہ الآیۃ) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ رسالت کے ثبوت میں آپ کے رفقاء کی صفات خیر کا تذکرہ کر کے آخر میں فرمایا گیا ہے لیغیظ بھم الکفار اور انہیں (جلد ترقی اس لئے دی) تاکہ ان کے ذریعہ کافروں کا جی جلائے۔

(ترجمہ فرمان علی)

جناب مصنف کے نزدیک اس آیت کے مصداق صرف حضرت علیؓ ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"یہ تمام صفتیں جس میں پائی جاتی ہیں وہی اس کا مستحق ہے۔ چونکہ بقول رسولؐ اس کے بعد کی آیت (بعد کی آیت سے مراد شاید آیت کا آخری حصہ ہے ناقل) علی بن ابی طالب کی شان میں ہے لہٰذا قرینہ یہ کہتا ہے کہ یہ بھی انہی کے یا ان کے مثل جو ان تمام صفات سے متصف ہوں۔ ان کی شان میں ہے۔ اللہ بس، باقی ہوس" (ص ۹۳۲)

قرآن کریم نے تو "والذین معہ" کی تعریفیں فرمائی ہیں اس لئے حضرت علیؓ بھی یقیناً ان کا مصداق ہیں اور جن اکابر کو آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت نصیب ہے

وہ حضرت علی رض سے بڑھ کر اس کا مصداق ہیں۔ اور جو لوگ "والذین معہ" سے جلتے ہیں وہ ارشاد خداوندی لیغیظ بھم الکفار " (تاکہ ان کے ذریعہ کافروں کا جی جلائے) کے زمرے میں آتے ہیں۔

۸۔ (۳) آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا ہے:۔

وعد اللہ الذین آمنوا جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے وعملوا الصّٰلحٰت منھم رہے خدا نے ان سے بخشش اور اجر مغفرۃ واجرًا عظیمًا۔ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

جناب مصنف نے اس آیت کے لئے مندرجہ ذیل افسانہ تصنیف کیا ہے:۔

"ابن عباس رض سے روایت ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر کچھ لوگوں نے حضرت رسول ص سے پوچھا کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے آپ نے فرمایا۔ قیامت کے دن نور کا ایک علم (لواء حمد) تیار ہوگا۔ اور ایک منادی آواز دے گا۔ کہ سید المؤمنین اور مؤمنین کھڑے ہو جائیں۔ یہ سن کر علی ابن ابی طالب کھڑے ہو جائیں گے تو ان کے ہاتھ میں وہ علم دیا جائے گا۔ اس کے نیچے مہاجرین وانصار میں سے وہ مؤمنین جو سابقین اولین ہیں سب کے سب جمع ہو جائیں گے اور ان میں ان کے سوا کوئی اور نہ ہوگا۔ پھر علی رض ایک نور کے ممبر پر بیٹھیں گے اور ایک ایک کر کے سب لوگ ان کے سامنے پیش کئے جائیں

گے اور یہ ہر ایک کو ان کا اجر اور نور عطا کریں گے جب آخر شخص کی نوبت عطا آئے گی۔ تو ان لوگوں سے کہا جائے گا تم لوگوں نے اپنے اپنے مقام منزلت کو جنت میں دیکھا۔ تمہارے پروردگار نے تو تم سے یہ کہدیا تھا۔ کہ میری بارگاہ تمہارے لئے مغفرت اور اجر عظیم یعنے بہشت ہے۔ پھر علی رضہ اٹھیں گے۔ اور یہ سب مومنین ان کے علم کے نیچے ہوں گے پھر ان سب کو جنت میں جا پہنچائیں گے۔ پھر اپنے منبر کی طرف پلٹیں گے۔ اور برابر مؤمنین ان کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اور ان کے ہاتھ سے بہشت کا اپنا اپنا حصہ لیں گے اس کے بعد کچھ لوگوں کو جہنم میں ڈال دیں گے۔ یہی مطلب ہے خدا کے قول الذین آمنوا الآیۃ اور الذین کفروا وکذبوا بآیتنا اولئک اصحٰب الجحیم کا، یعنی علی رضہ کے حق کی ولایت کی وجہ سے لوگ جنت و جہنم کے مستحق ہوں گے اور ان کا حق سارے جہاں پر واجب ہے (دیکھو شواہد التنزیل حاکم ابو القاسم حسکانی؛ (صـ۹۲))

یعنے اجر و نور اور جنت و دوزخ سب علی رضہ کے قبضہ میں ہے جس کو جو چاہیں عطا فرمائیں۔ صد شکر سابقین اولین مہاجرین وانصار (جن میں حضرات ابوبکر رضہ و عمر سب سے پہلے شامل ہیں) سید المؤمنین کے ساتھ سب سے پہلے جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ اور ان کے دشمن وہاں بھی "لیغیظ بہم الکفار" کا منظر پیش کریں گے۔

د: شیعہ اور آلِ رسول

شیعہ جو حُبِّ علیؓ میں غلو کرتے اور ان کی مدح میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں اس کا منشاء، جیساکہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن کریم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور اسلام کے خلاف اپنی نفرت و بُغض کا اظہار ہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کی مظلومیت کی جو فرضی تصویر شیعہ کھینچتے ہیں اس سے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے اور ان کے کمالات پر پانی پھر جاتا ہے۔ مثلاً:۔

○ ۔انہوں نے ۲۵ برس تک منافقوں اور مرتدوں کی امامت میں نمازیں پڑھیں اور تمام دینی و دنیوی معاملات میں ان کے ساتھ شریک رہے

○ ۔ان کی گردن میں رسّی ڈال کر انہیں بیعت کے لئے گھسیٹا گیا۔ اور ان سے بہ جبر بیعت لی گئی۔

○ ۔ان کی زوجہ مطہرہ خاتون جنت پر کوڑے برسائے گئے۔ ان کا حمل ساقط کر دیا گیا اور ان کا گھر جلا دیا گیا۔

○ ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خلیفہ بلافصل نامزد کیا تھا مگر کسی نے ان کو خلیفہ بنانا پسند نہ کیا۔

○ ۔وہ اپنی زوجہ مطہرہ خاتون جنت کو گدھے پر سوار کر کے مہاجرین و انصار کے ایک ایک دروازے پر لئے پھرے مگر سوائے

تین کے کسی نے ان کی بات نہ مانی۔

○۔ قرآن کریم میں ان کے سامنے تحریف کی گئی۔ اسے پارہ پارہ کیا گیا۔ اسے جلایا گیا مگر وہ ردائے تقیہ اوڑھے رہے۔

○۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت کو کفر اور نفاق کی طرف پلٹتے دیکھا۔ مگر ان کی ہدایت کے لئے کچھ نہ کہا

○۔ ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پر ظلم وجور کے پہاڑ ڈھائے گئے، ان کا حق چھینا گیا، مگر آپ کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ تاآنکہ ملا باقر مجلسی کے بقول حضرت خاتون جنت نے انہیں یہ کہہ کر غیرت دلانا چاہی۔

مانند جنین در رحم پردہ نشین شدہ و مثل خائنان در خانہ گریختہ و بعد ازاں کہ شجاعانِ دہر را بخاک ہلاک افگندی مغلوب ایں نامرداں گردیدہ۔ (حق الیقین ص۲۰۳ ۔ مطبوعہ ایران)	تو پیٹ کے بچے کی طرح پردہ نشین ہوگیا ہے اور خائنوں کی طرح گھر میں بھاگ آیا ہے اور بعد اس کے کہ زمانے کے سورماؤں کو خاک ہلاک میں ڈالا، ان نامردوں سے مغلوب ہوگیا ہے۔

مگر آپ کو پھر بھی انگیخت نہ ہوئی اور حد یہ کہ خود اپنے دورِ خلافت میں بھی آل رسول کا حق ان کو نہ دلایا۔ شیعوں نے آل رسول کو مظلوم ثابت کرنے کے لئے جو فرضی واقعات تصنیف کئے ہیں ان سے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو شخصیت سامنے آتی ہے، اسے کوئی شخص بھی اپنے لئے پسند نہیں کرسکتا چہ جائیکہ اسد اللہ الغالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس گھناؤنی تصویر

کو پسندیدہ کہا جائے۔ اس کے برعکس حضرت ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہما سے بظاہر شیعہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کے باطنی کمالات اور ان کی پرکشش شخصیت کے ایسے قائل ہیں کہ باید و شاید مثلاً:۔

○ ۔اہل عرب جو کسی کے مطیع اور فرمانبردار بن کر رہنا جانتے ہی نہ تھے۔ ان حضرات نے ان کو ایسا مسخر کیا کہ بس انہی کے ہو کر رہ گئے اور ۲۵ برس کے عرصہ میں ساری دنیا پر چھا گئے،

○ ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے تیار کرنے میں تئیس سال لگے تھے، مگر ان حضرات نے چشم زدن میں اہل اسلام کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ کہ مسلمان ان حضرات کے مقابلہ میں کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔

○ ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ کے مجمع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر نص کی تھی، مگر حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے ان کو خلیفہ نہ بننے دیا، ان کا یہ کارنامہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ مختلف قبائل اور مختلف عادات کے ایک لاکھ انسانوں کو اس نص سے ٹکرا دیا۔ اور لاکھ انسانوں کے مجمع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو چار ہزار حمایتوں کا میسر آنا بھی ناممکن بنا دیا۔

○ ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن کے مقابلہ میں نیا قرآن بھی تصنیف کر لیا، اور تمام لوگ حتیٰ کہ خود حضرت علیؓ اور ان کے بعد آئمہ معصومین بھی بڑے ذوق و

و شوق سے اس نئے تصنیف شدہ قرآن کی تلاوت کر کے ثواب کمانے لگے اور حضرت علی رضہ نے جو "اصلی تے وڈا قرآن" مرتب کیا تھا۔ وہ دنیا کی نظر سے روپوش کرا دیا۔

○ ان حضرات کا ایک بڑا ہی حیرت انگیز کارنامہ یہ ہے کہ وہ آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ رحمت میں آسودہ ہیں۔ وہ "صاحب غار" بھی تھے اور آج تک "صاحب مزار" بھی ہیں

○ ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ ان حضرات نے جو منہاج خلافت قائم کر دیا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اپنے دورِ خلافت میں اس منہاج سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں جا سکے، فدک کی جو کیفیت ان حضرات کے زمانے میں تھی وہی رہی۔ جو اذان ان کے زمانے میں دی جاتی تھی۔ وہی حضرت علی رضہ کے زمانے میں دی جاتی رہی۔ (شیعوں کی اذان جاری نہ کر سکے) تراویح پر پابندی عائد نہ کر سکے۔ اور متعہ شریف جیسی پاک اور مقدس چیز کو رواج نہ دے سکے۔ الغرض شیخین کے زمانے کا منہاج و دستور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے زمانے میں بھی جاری رہا۔

اب شیعی عقائد کی روشنی میں حضرات شیخین رضہ کا مقابلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اگر حضرت علی رضہ امام تھے تو شیخین رضہ امام الائمہ تھے۔ اگر حضرت علی رضہ معصوم تھے تو شیخین کو شاید عصمت سے بھی بڑھ کر کوئی مقام حاصل تھا۔ اور اگر حضرت علی صاحب معجزہ تھے۔ تو شیخین کی معجزہ نمائی ان

سے کہیں بڑھ کر تھی۔

واقعۃً حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نہ معصوم تھے۔ نہ خلیفہ بلا فصل تھے، نہ صاحب معجزہ تھے۔ نہ ان کے اور حضرات شیخین رضکے درمیان کوئی منافرت تھی، سب باہم شیر و شکر تھے۔ شیخین رض کے زمانے میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کے تمام معاملات میں مشیر و وزیر تھے۔ شیعوں نے شیخین رض کو بدنام کرنے کے لئے جو فرضی کہانیاں تصنیف کی ہیں۔ وہ درحقیقت حضرات شیخین رض کو نہیں بلکہ خود حضرت علی کرم وجہہٗ کو بدنام کرنے کے لئے ہیں۔

۲۔ حضرت علی رض نے اپنے زمانہ خلافت میں شیعوں کے ہاتھوں جو دکھ اٹھائے۔ وہ نہج البلاغۃ کے خطبات سے واضح ہیں۔ آپ بار بار ان کی خیانت و بے وفائی کی شکائیتیں فرماتے ہیں اور ان کے حق میں بد دعائیں دیتے ہیں۔ نہج البلاغۃ مطبوعہ مصر قسم اول ص۲۷ میں ہے:

"مجھے خبر ملی ہے کہ بُسر نے یمن پر چڑھائی کی ہے، اور میں خدا کی قسم گمان کرتا ہوں کہ یہ لوگ تم سے بازی لے جائیں گے۔ کیونکہ وہ اپنے باطل پر متفق ہیں اور تم اپنے حق پر متفرق ہو تم اپنے امام کی نافرمانی کرتے ہو اور وہ اپنے امام کی باطل میں بھی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ اپنے صاحب کے ساتھ امانت داری کرتے ہیں اور تم خیانت کرتے ہو اگر میں تم میں سے کسی کے پاس ایک قعب امانت رکھواؤں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ اس کی

دستی لے جائے۔ اے اللہ! میں نے ان کو عاجز و رنجیدہ کر دیا اور انہوں نے مجھے۔ لہٰذا مجھے ان کے عوض ان سے اچھے لوگ دے اور ان کو میرے عوض میں مجھ سے براحاکم دے۔ اے اللہ! ان کو گھلا دے جیسے پانی میں نمک گھلا دیا جاتا ہے۔ اللہ کی قسم! میں یہ آرزو کرتا ہوں کہ کاش مجھے تمہارے عوض میں ایک ہزار سوار قبیلۂ بنی فراس بن غنم کے ملجائے۔"

اس قسم کی بہت سی شکائتیں اور بد دعائیں شیعوں کے حق میں فرمائیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلاف شیعہ، جو خود حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے مصاحب و رفیق تھے ان کے دل میں حضرت کا ذرا بھی احترام نہیں تھا۔ حضرت امیرؓ ان کو نافرمان بے وفا، بزدل، خائن، مفسد، حیلہ باز، بدعہد، ناقابل اعتماد، بےغیرت وغیرہ وغیرہ کے خطابات دیتے تھے، ان شیعوں کی بدولت اپنی زندگی سے تنگ آ گئے تھے۔ اور شیعوں کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کے لوگوں کو لائق رشک فرماتے تھے ــــــ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عزت و حرمت اسلافِ شیعہ کے دلوں میں ہوتی تو حضرت ان کے رویّے سے نالاں و شکوہ کناں نہ ہوتے اور جب اسلاف شیعہ کا یہ حال تھا تو اخلاف شیعہ کا کیا حال ہو گا۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے بعد سبط اکبر ریحانۃ الرسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کے جانشین ہوئے، شیعوں نے ان کو

"اس قدر ستایا کہ آپ نے تنگ آکر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرلی۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران ص۱۴۸ میں ہے:

"زید بن وہب جہنی سے روایت ہے کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ کو مدائن میں نیزہ مارا گیا تو میں ان کے پاس گیا اس وقت ان کو زخم کی تکلیف تھی۔ میں نے کہا اے فرزند رسول! آپ کی کیا رائے ہے۔ لوگ بہت متحیر ہو رہے ہیں۔ امام نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں معاویہ رض کو اپنے لئے ان لوگوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ جو اپنے کو میرا شیعہ کہتے ہیں انہوں نے میرے قتل کا ارادہ کیا، میرا اسباب لوٹا اور میرا مال لے لیا۔ اللہ کی قسم! میں معاویہ سے کوئی معاہدہ کر لوں جس سے میری جان اور میرے متعلقین کی حفاظت ہو جائے یہ بہتر ہے اس سے کہ شیعہ مجھے قتل کر دیں اور میرے متعلقین ضائع ہو جائیں۔ واللہ! اگر میں معاویہ رض سے لڑتا تو شیعہ میری گردن پکڑ کر مجھے معاویہ کے حوالے کر دیتے۔ واللہ عزت کے ساتھ معاویہ رض سے صلح کر لینا اس سے بہتر ہے کہ مجھے گرفتار کر کے قتل کریں یا احسان رکھ کر آزاد کریں۔ یہ احسان ان کا بنو ہاشم پر قیامت تک رہے گا۔ اور معاویہ رض برابر اس احسان کا اظہار ہمارے زندہ و مردہ پر کرتے رہیں گے۔"

اس سے واضح ہے کہ حضرت حسن رضؓ کے حق میں حضرت معاویہ رضؓ شیعوں سے بہتر تھے۔ شیعہ حضرت امام کے قتل کے در پے تھے اور پکڑ کر حضرت معاویہ رضؓ کے حوالے کر دینے پر آمادہ تھے۔ آپ کو مارنا پیٹنا۔ مال و اسباب لوٹ لینا اور خواتین اہل بیت کی بے حرمتی کرنا تو شیعوں کے معمولی کارنامے تھے۔

۴۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بعد سبط اصغر ریحانۃ الرسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کربلا کے ساتھ تو شیعوں کی بے وفائی و بے عہدی شہرۂ آفاق ہے کہ ان کو خطوط کے انبار بھیج کر کوفہ بلوایا اور ان کے کوفہ پہنچنے سے پہلے ان غداروں نے بیعت توڑ کر ان کو شہید کر دیا۔ ملا باقر مجلسی جلاء العیون میں حضرت امام باقر رحؒ سے نقل کرتے ہیں :۔

"پھر لوگوں نے ان کے فرزند امام حسن رضؓ سے بیعت کی۔ اور بیعت کے بعد بد عہدی کی اور مکر کیا اور چاہا کہ ان کو دشمن کے حوالے کر دیں اور اہل عراق ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے پہلو میں خنجر مارا اور ان کا خیمہ لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ آپؑ کی لونڈیوں کے پاؤں سے خلخال (پازیب) اتار لیں اور آپ کو مجبور کر دیا حتیٰ کہ آپ نے معاویہ رضؓ سے صلح کر لی۔ اور اپنی اور اپنے اہل بیت کی جانوں کی حفاظت کر لی۔ اہل بیت ان کے بہت تھوڑے تھے پھر بیس ہزار اہل عراق نے امام حسین رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کی

اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی انہوں نے ان پر تلوار چلائی اور آنحضرت ﷺ کی بیعت ان کی گردن میں تھی کہ آپ کو شہید کر دیا" (بحوالہ قاتلان حسین کی خانہ تلاشی ص۲۹)

۵۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے شیعوں کی غداری نے بعد کے ائمہ کو ایسا شکستہ دل کر دیا کہ انہوں نے خلافت کے خیال ہی سے دستبرداری حاصل کر لی۔ احتجاج طبرسی ص۱۵۷ میں ہے کہ جب حضرت امام حسین کے قتل کے بعد شیعوں نے امام زین العابدین رح کو فریب دینا چاہا اور ان سے اپنی اطاعت و جانثاری کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا:۔

"ہیہات! ہیہات!! اے غدارو! مکّارو! تمہاری مرادیں پوری نہ ہوں، کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے بھی فریب دو۔ جیسے تم نے میرے باپ دادا کو اس سے قبل فریب دیا۔ ہرگز نہیں! قسم ہے گردش والے آسمان کے رب کی، ابھی تک میرے والد کی شہادت کا زخم مندمل نہیں ہوا۔"

ان حوالہ جات سے چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں:۔

اوّل: شیعوں کے ان بزرگوں سے، جن کو وہ آئمہ معصومین کہتے ہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ کوئی عقیدت ہے بلکہ یہ ہمیشہ ان بزرگوں کی بے حرمتی کرتے اور ان کی بد دعاؤں کے انبار جمع کرتے رہے ہیں۔ یہ ہر مجلس میں رونا چلّانا، بین کرنا انہی اکابر کی بد دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ جو شیعوں کو نصیب ہیں۔

دوم: یہ بزرگان دین شیعوں پر قطعًا اعتماد نہ کرتے تھے بلکہ ان کو

مفسد و مکار اور اپنے اہل بیت کے قاتل جانتے تھے۔

سوم: حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بہت ہی بڑا احسان کیا۔ کہ شروع ہی سے خلافت ان کے حوالے نہیں کی۔ اور ان کے ۲۵ برس عافیت سے گذر گئے۔ ورنہ شیعوں کی بے وفائی و غداری ان کو شروع سے مبتلائے عذاب رکھی۔ اور وہ بہت پہلے شیعوں کے ہاتھوں موت کی تمنائیں کرنے لگتے۔

چہارم: حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اگر شیعوں کے امام اول کے امام تھے۔ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے امام دوم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے امام ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ نے حضرت معاویہ رضؓ سے بطوع و رغبت بیعت کی۔

۵: خوش فہمیاں

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کے ساتھ شیعوں نے جو حسن سلوک کیا اور ان بزرگوں نے اس کے صلہ میں شیعوں کو جو خطابات دیئے اور جن دعاؤں سے نوازا وہ اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن شیعوں کو خوش فہمی ہے کہ قرآن کریم کو غلط اور تحریف شدہ کہنا، اکابر صحابہ کو گالیاں دینا، ائمہ کو ستانا اور ان کی بد دعائیں لینا بڑا کار ثواب ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صرف شیعوں کی نجات ہوگی۔ جناب مصنف نے بھی ان خوش فہمیوں کا جابجا ذکر کیا ہے۔ بطور نمونہ چند حوالے

ملاحظہ ہوں:

۱- سورۃ الفجر کی آخری آیتوں (یاایتھاالنفس المطمئنہ الیٰ اخرہ) کے تحت مصنف لکھتے ہیں:-

"اصول کافی سے مستفاد ہوتا ہے کہ شیعان علی بن ابی طالب کا اس سے گہرا تعلق ہے ان کا نفس احتضار کے وقت مطمئن ہوتا ہے۔ کیونکہ اس موقعہ پر ان کے زیر نظر حضرات چہاردہ معصومین کی نورانی شکلیں ہوتی ہیں۔ قبض روح کے موقع پر ان کی روح سے کہا جاتا ہے کہ خوش وخرم باہر آجا۔ اور اے عبد خدا محمد وال محمد کی صف میں شامل ہو جا" (ص۱۰۰۱)

سبحان اللہ! کیا بشارت ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو سراپا حیا وعفت تھیں، شیعہ (نامحرم ہونے کے باوجود) ان کی بھی زیارت کریں گے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شیعوں کو اطمینان کی یہ دولت کس نیک عمل کی بدولت نصیب ہوگی۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ائمہ کو ساری عمر بے چین رکھا۔ اور ان سے بد دعائیں لیں۔

۲- "علامہ ابن حجر عسقلانی نے حضرت رسول سے روایت کی ہے کہ آپ نے جناب امیر سے فرمایا کہ اے علیؓ تم اور تمہارے شیعہ حوض کوثر پر سیرو سیراب نورانی صورت ہوں گے۔ اور دشمن پیاسے زرد رُو دہاں سے نکالے جائیں گے" (ص۱۰۵۸)

اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت علی رضؓ کے دوستوں سے مراد مہاجرین و انصار اور ان کے متبعین ہیں اور دشمنوں سے مراد وہ لوگ ہو سکتے ہیں۔ جن کو حضرت علی رضؓ نے خائن و مکار فرما کر بد دعائیں دی تھیں۔

۳۔۔۔۔۔۔۔" ایک حدیث میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا واللہ شفاعت کے واسطے خدا نے ہمیں اجازت دی ہے اور ہم اہل بیت اور خاص لوگوں کے سوا کوئی بغیر اذن سفارش نہ کر سکے گا۔ اور ہم ہی حق بات کہنے والے ہیں کسی نے پوچھا، فرزند رسول! اس وقت آپ کیا بات فرمائیں گے۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کی تسبیح۔ اپنے رسول پر صلوٰۃ، اپنے شیعوں کی سفارش"۔ (صنہ ۱۰۵)

سبحان اللہ! شیعوں کے کیا مراتب ہیں کہ شیعوں کی شفاعت کے لئے اماموں کو خدا سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں، شاید اس لئے کہ جنت و دوزخ اماموں کے اپنے قبضہ میں ہو گی۔ جیسا کہ "القیا فی جھنم کل کفار عنید" کے ذیل میں مصنف نے لکھا ہے:

۴۔ ملا باقر مجلسی نے حق الیقین میں امام جعفر صادق کی طرف منسوب تیرہ صفحے کی ایک طویل روایت نقل کی ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"مفضل نے پوچھا کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کا

کیا گناہ تھا جس کے بارے میں حق تعالےٰ فرماتے ہیں:" لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر" کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے لئے بخش دئے آپ کے پہلے اور پچھلے گناہ ؟

حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا اے مفضل! رسول خدا نے دعا کی تھی کہ اے خداوندا! میرے بھائی علی بن ابی طالب کے شیعوں کے اور میرے فرزندوں جو کہ میرے اوصیاء ہیں۔ ان کے شیعوں کے سارے اگلے پچھلے گناہ، جو قیامت تک ہوں گے، مجھ پر ڈال دے۔ اور مجھے پیغمبروں کے درمیان شیعوں کے گناہوں کی وجہ سے رسوا نہ فرما۔ پس اللہ تعالےٰ نے شیعوں کے سارے گناہ آنحضرتؐ پر لاد دئے اور وہ سارے گناہ آنحضرتؐ کے لئے بخش دئے۔" (ص۲۶)

آگے روایت میں ذکر کیا گیا کہ اے مفضل! یہ بشارت صرف تمہارے جیسے خالص شیعوں کے لئے ہے، ان لوگوں کے لئے نہیں جو شیعہ کہلا کر گناہوں پر اقدام کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے " ولا تزر وازرۃ وزر اُخرٰی " کا اصول پیش کیا تھا چونکہ شیعوں کو ہر چیز میں قرآن کریم کی مخالفت مقصود ہے اس لئے ناممکن تھا کہ وہ بھی عیسائیوں کی طرح کفارے کا عقیدہ ایجاد نہ کرتے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

باب چہارم

عقیدۂ رجعت

جناب مصنف نے قرآن کریم کی متعدد آیات کو عقیدۂ رجعت پر چسپاں کیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں صرف ایک حوالے پر اکتفا جاتا ہے۔ سورہ النمل کی آیت ۸۳۔ "ویوم نحشر من کل امۃ فوجًا" الآیۃ کے تحت لکھتے ہیں:

"اس آیت سے رجعت کا ثبوت واضح طور پر نکلتا ہے۔ جس کا ذکر احادیث میں مجملاً یوں ہے کہ امام آخر الزمان کے ظہور کے بعد قیامت کے قبل خدا کچھ لوگوں، جو ان کے سچے دوست یا پکے دشمن تھے۔ زندہ کرے گا تاکہ وہ لوگ ثواب و عذاب اخروی اپنی اپنی کارگزاریوں یا کارستانیوں کا عوض دنیا میں بھی دیکھ لیں" (ص ۶۸۹)

مصنف نے "رجعت" کی تفصیلات کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کے لئے کتب کلامیہ کا حوالہ دیدیا ہے (ص ۲۹) اس لئے مناسب ہے کہ ملا باقر مجلسی کی کتاب حق الیقین سے اس کا

خلاصہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ موصوف لکھتے ہیں :-

"شیعہ کے اجماعیات بلکہ ضروریاتِ مذہب میں سے رجعت کا حق ہونا ہے۔ یعنی قیامت سے پہلے امام مہدی کے زمانے میں کچھ لوگوں کو، جو بہت ہی نیک تھے، یا بہت ہی بُرے تھے، دوبارہ زندہ کیا جائیگا، نیک لوگوں کو اس لئے کہ تاکہ ائمہ کی حکومت دیکھ کر خوش ہوں۔ اور ان کی نیکیوں کا کچھ بدلہ دنیا میں مل جائے اور بُروں کو اس لئے تاکہ انہیں سزا دی جائے اور آئمہ کی وہ حکومت، جس کو روکنے کے لئے انہوں نے کوششیں کی تھیں، اسے دیکھ کر جلیں اور شیعہ لوگ ان سے انتقام لیں۔ جو لوگ نہ زیادہ نیک تھے نہ بد وہ اپنی قبروں میں رہیں گے" (ص۳۲۵)

- "دابۃ الارض سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ قیامت سے پہلے ان کی رجعت ہو گی" (ص۳۲۶)
- " حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء کرام دنیا میں بھیجے ان سب سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے اور وصیِ رسولؐ کی مدد کریں گے۔ چنانچہ رجعت کے زمانے میں سب کے سب دنیا میں دوبارہ لائے جائیں گے، تاکہ حضرت امیرؓ کے سامنے جدال و قتال کریں (ص۳۲۸)
- " اس امت کے فرعون و ہامان یعنے ابوبکرؓ و عمرؓ

اور ان کے لشکروں کو۔ جنہوں نے آل محمد کا حق غصب کیا تھا، لایا جائے گا اور ان سے انتقام لیا جائے گا۔" (ص۳۴۲)

○ "نعمانی نے امام محمد باقرؒ سے روایت کی ہے کہ جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ ان کی مدد کرے گا اور پہلا شخص جو ان کے ہاتھ پر بیعت کرے گا وہ محمد ہوں گے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے بعد حضرت علی رضؓ" (ص۳۴۷)

○ ——— "علل الشرائع میں امام محمد باقرؒ سے روایت کی ہے کہ جب ہمارا مہدی ظاہر ہوگا تو (ام المؤمنین حضرت) عائشہ (صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا) کو زندہ کیا جائے گا۔ تاکہ ان پر حد جاری کیجائے اور (حضرت) فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کا انتقام ان سے لیا جائے۔" (ص۳۴۷)

سب سے پہلے حضرت امام حسین کی رجعت ہوگی اور وہ دنیا میں اتنی طویل مدت تک حکومت کریں گے کہ بوڑھے آدمی کی ابروؤں کے بال اس کی آنکھوں پر لٹک آئیں گے۔"

(ص ۳۴۱)

ان حوالہ جات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ شیعوں کو عقیدہ رجعت کے تصنیف کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ چند نکات اس کی مختصر وضاحت ضروری ہے۔

○ شیعوں کا بنیادی عقیدہ ——— جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ——— قرآن کریم کا غلط ہونا ہے۔ لیکن شیعوں کی بدقسمتی کہ وہ منافقوں کی طرح مسلمانوں کو دکھانے کے لئے اسی قرآن کو پڑھنے پر مجبور ہیں جسے وہ غلط اور تحریف شدہ مانتے ہیں اس کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور نسخے کا کوئی وجود نہیں، شیعہ مذہب کے بانیوں نے اپنے حواریوں کو مطمئن کرنے کے لئے۔ رجعت کا عقیدہ ایجاد کیا؟ اور شیعوں کو بتایا کہ رجعت کے زمانے میں "اصلی قرآن" پڑھا جائے گا۔

○ شیعوں کا ایک بنیادی اور اصل الاصول عقیدہ یہ تھا کہ خلیفہ خدا بناتا ہے اور اس نے حضرت علیؓ کو اور ان کی اولاد میں سے یکے بعد دیگرے گیارہ حضرات کو خلیفہ بنایا۔ مگر واقعات کی دنیا میں شیعوں کا یہ عقیدہ بالکل غلط نکلا، اس لئے کہ ان بارہ حضرات، میں سے صرف دو کو خلافت ملی، ایک حضرت علیؓ اور دوسرے حضرت حسن رضی اللہ عنہما، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف ساڑھے چار سال خلافت کی، اور اس دوران وہ شیعوں کے ہاتھوں ایسے تنگ آگئے کہ اپنے پورے دور خلافت میں شیعوں کو بد دعائیں دیتے اور اپنے لئے موت کی تمنائیں کرتے رہے، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے شیعوں کی غداری و مکاری سے تنگ آکر خلافت ہی حضرت معاویہ کے سپرد کر دی۔ ——— دیگر دس حضرات جن کو شیعہ نے امام اور خلیفہ بنایا۔ ان میں سے کسی کو خلافت نہیں ملی۔ پس اگر یہ حضرات خدا کے مقرر کردہ خلیفہ ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں خلافت و تمکین عطا نہ فرماتے یہ ایک ایسی کھلی بات ہے کہ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی اس پر غور کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ شیعوں کا "نظریۂ امامت"

قطعًا باطل اور فیصلۂ خداوندی کے خلاف ہے۔ بانیانِ مذہب شیعہ نے سادہ لوح شیعوں کو رام کرنے کے لئے عقیدۂ رجعت گھڑا، کہ اگر واقعات کی دنیا میں ان بزرگوں کو خلافت نہیں ملی تو کیا ہوا۔ قیامت سے پہلے ان سب کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور وہ خلافت کی کسر نکالیں گے مگر شیعوں کی یہ طفل تسلی فارسی مثل "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد" کی مصداق ہے۔

○ شیعۂ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو ظالم و غاصب مشہور کرتے ہیں مگر دنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آیت تمکین "وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض" (النور) کے تحت ایسی خلافت و تمکین عطا فرمائی کہ انہوں نے یہود و مجوس کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے اور قلیل مدت میں اسلام کا پرچم مشرق و مغرب میں لہرا دیا

— بانیانِ مذہب شیعہ (یہود و مجوس) کو ان حضرات سے اسی اسلامی شوکت کی بناء پر عداوت تھی۔ اس لئے رجعت کا عقیدہ گھڑا گیا، تاکہ یہود و مجوس کا انتقام ان اکابر سے لیا جا سکے۔

○ شیعوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت کی وجہ سے اہل بیت نبوی سے بھی عداوت ہے، اس عداوت کے اظہار کے لئے عقیدۂ رجعت ایجاد کیا گیا۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امام مہدی کے ہاتھ پر بیعت کرا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی جائے گی۔ اور آپؐ کو مزید رسوا کرنے کے لئے شیعہ آپؐ کی بیویوں کو آپ کے سامنے کوڑے لگائیں گے ——— نعوذ باللہ

اہل تشیع اگر عقل و فہم کی نعمت سے بہرہ ور رہیں تو انہیں سوچنا چاہیئے کہ جو لوگ ایسے عقائد رکھتے ہوں کیا ان کے کفر و نفاق اور الحاد و زندقہ میں کوئی شک ہے ؟

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سید محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

۳۰ / ۵ / ۱۴۰۲ھ

سوادِ اعظم اہل سنت کا ساتھ دیجئے

حضرت علیؓ کی وصیت

نہج البلاغہ جلد دوم صـ۱۱ میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔

سيهلك فيّ صنفان محب مفرط يذهب به الحب الى غير الحق ومبغض مفرط يذهب به البغض الى غير الحق وخير الناس فيّ حالاً النمط الاوسط فالزموه والزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة واياكم والفرقة فان الشاذ من الناس للشيطان كما ان الشاذ من الغنم للذئب الا من دعا الى هذا الشعار فاقتلوه ولو كان تحت عمامتي هذه۔ (نہج البلاغہ جلد دوم صـ۱۱)

عنقریب میرے متعلق دو قسم کے لوگ ہلاک ہونگے ایک محبت کرنے والا، حد سے بڑھ جانے والا جس کو محبت خلاف حق کی طرف لیجائے۔ دوسرا بغض رکھنے والا، حد سے کم کرنیوالا۔ جس کو بغض خلاف حق کیطرف لیجائے اور سب سے بہتر حال میرے متعلق درمیانے گروہ کا ہے جو نہ زیادہ محبت کرے نہ بغض رکھے پس اس درمیانی حالت کو اپنے لئے ضروری سمجھو اور سواد اعظم یعنے بڑی جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور خبردار جماعت سے علیحدگی نہ اختیار کرنا کیونکہ جو انسان جماعت سے الگ ہو جاتا ہے وہ شیطان کے حصہ میں جاتا ہے جیسے کہ گلہ سے الگ ہونے والی بکری بھیڑیئے کا حصہ بنتی ہے آگاہ ہو جاؤ جو شخص تم کو جماعت سے الگ ہونے کی تعلیم دے اس کو قتل کر دینا اگرچہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہو۔

اِبتلاءُ المُؤمنین

ایک شیعی مغالطے کا حل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد:

مشکوٰۃ شریف ص۵۶۷ باب مناقب العشرہ فصل ثالث میں مسند احمد کے حوالے سے درج ذیل حدیث منقول ہے:۔

عن علی رضی اللہ تعالی عنه قال قیل یا رسول اللہ! من نؤمر بعدك؟ قال إن تؤمروا أبا بكر تجدوه أمينا زاهدا فی الدنيا راغبا فی الآخرة، وإن تؤمروا عمر تجدوه قويا أمينا لا يخاف فی اللہ لومة لائم، وإن تؤمروا عليا –ولا أراكم فاعلين– تجدوه هاديا مهديا يأخذ بكم الطريق المستقيم. (رواه أحمد)

"حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، یا رسول اللہ! آپؐ کے بعد ہم کس کو امیر بنائیں؟ فرمایا "اگر ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو ان کو امین، دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی رغبت رکھنے والے پاؤ گے، اور اگر عمر کو امیر بناؤ گے تو ان کو ایسا قوی امانت دار پاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے، اور اگر علی کو امیر بناؤ گے...... اور میں تم کو نہیں دیکھتا کہ تم ایسا کرو گے...... تو ان کو ہدایت کرنے والا ہدایت یافتہ پاؤ گے کہ تم کو سیدھے راستہ پر لے چلیں گے۔"

کسی شیعہ نے اعتراض کے طور پر اس حدیث پاک کے معنی جناب مولانا الٰہی بخشؒ سے دریافت کئے۔ غالبًا اعتراض یہ ہو گا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، مگر صحابہؓ سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ان کو خلیفہ بنائیں گے۔ مولانا الٰہی بخشؒ موصوف نے یہ سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ، بانی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بھیج دیا۔ پیش نظر رسالہ "انتباہ المومنین" حضرت نانوتویؒ کی جانب سے اس سوال کا جواب ہے، جس میں اس حدیث کی شرح میں ایسے علوم و معارف بیان فرمائے گئے ہیں جو صدیقین کے قلوب پر بطور علم لدنی القاء ہوا کرتے ہیں۔ یہ رسالہ جناب مولانا حبیب الرحمان (سابق) نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے صاحبزادہ گرامی جناب مولانا عبدالرحمان مرحوم کی فرمائش پر شائع کیا تھا۔ شاید اس کی دوبارہ طباعت نہیں ہوئی۔ چالیس برس پہلے اس رسالہ کی زیارت ہوئی تو بے ساختہ جی چاہا کہ اس گنجینہ معارف کو اردو میں منتقل کردیا جائے، لیکن اس خیال سے کہ اپنی کم سوادی و نافہمی کی وجہ سے اصل مطلب ہی خبط نہ ہوجائے، اس کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ خیال ترجمہ سے دامن کشاں رہا، بعد میں یہ رسالہ کسی صاحب نے لے کر واپس نہیں لوٹایا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد اس رسالہ کا دوسرا نسخہ میسر آیا تو ترجمہ کا ولولہ پھر تازہ ہوا، اور تحریف مطالب سے بچنے کی یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ ترجمہ کو اصل متن کے ساتھ شائع کیا جائے تاکہ اگر کہیں ترجمانی میں گڑبڑ ہوجائے تو اہل علم اصل متن سے مقابلہ کرکے اس کی اصلاح فرمادیں۔ چنانچہ یہ بضاعت مزجاۃ قدر شناسان علوم قاسمی کی خدمت میں بطور ارمغان پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے لطف و احسان سے اس ناچیز خدمت کو قبول فرماکر اسے اپنے بندوں کے لئے نافع بنائیں اور اس ناکارہ و نابکار کے لئے اپنی رحمت و مغفرت اور اپنے مقبول بندوں کی معیت کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

چونکہ اردو ترجمہ اور فارسی متن دونوں کو یکجا (مگر الگ الگ) شائع کیا جارہا

ہے، اس لئے متن اور ترجمہ کے درمیان تطبیق کی سہولت کے لئے رسالہ کو فقروں پر تقسیم کردیا گیا ہے، تاکہ اردو ترجمہ کے جس فقرہ کا متن دیکھنا ہو، آسانی سے اسکی طرف رجوع کیا جاسکے۔ رسالہ میں جو چند آیات و احادیث آئی تھیں ان کی تخریج بھی کردی گئی ہے۔

وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين.

محمد یوسف عفا اللہ عنہ لدھیانوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی رسولہ

سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین.

۱۔ بعد از حمد و صلوٰۃ بندۂ کمترین گمنام محمد قاسم نام' جناب مخدومی و مطاعی مولوی الٰہی بخش دام فیوضہ کی خدمت میں سلام مسنون عرض کرتے ہوئے قبول کا امیدوار ہے' بعد ازیں عرض کرتا ہے کہ والا نامہ کیا پہنچا کہ اس ناکارہ کو ایک ہی احسان کے ساتھ اپنا مرہون اور بن دیکھے اپنا نیاز مند بنا لیا۔ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس گمنامی کے باوجود اس ناکارہ کا نام اس انداز میں سمع عالی تک پہنچے گا' شاید یہ کسی سادہ لوح آدمی کا کام ہوگا' ورنہ میں کہاں؟ اور یہ عنایات بے پایاں کہاں؟ اور وہ بھی اس درجہ کی کہ "خاتمۃ المفسرین" جیسے القاب کے ساتھ یاد فرمایا جائے۔ جناب من! مردی اور چیز ہے اور مردم شناسی دوسری چیز ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت غلط ہے' جس نے کہا اپنے اندازۂ ادراک کے مطابق کہا۔ مجھ بے چارہ ہیچمدان کو مسائل ضروریہ کا یاد ہونا تو درکنار؟ ان پر عبور بھی میسر نہیں' اہل علم کے اشکالات حل کرنے کی نوبت کہاں آسکتی ہے؟ اگر کوئی دل نشین بات میری زبان پر جاری ہوئی ہوگی تو محض حسن اتفاق ہے۔

گاہ باشد کہ کودک نادان

بغلط بر ہدف زند تیرے

(کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ نادان بچہ غلطی سے نشانے پر تیر لگا دیتا ہے۔)

لیکن (اپنی بے بضاعتی کے باوصف) امر سامی کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں کہ

جناب کی پہلی عنایت ہی میری حد قدر سے زیادہ ہے' ناچار جو کچھ بھی ہوں بنام خدائے کریم قلم لے کر اپنا ذہنِ نارسا جہاں تک پہنچتا ہے' اسے صفحۂ قرطاس پر رقم کرکے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ مگر پہلے چند امور بطور مقدمہ گزارش کرتا ہوں' جو اصل مطلب کی تقریر کے وقت ملحوظ خاطر رہیں گے۔

پہلا مقدمہ

۲۔ طالب حق کو لازم ہے کہ نصوص کے معنی مطابقی اور اصل مدلول کو اپنا مستند بنائے اور بعض اطلاقات عرف کے اعتبار سے جو زائد معانی ذہن میں آتے ہیں ان کو لائق التفات نہ سمجھے۔ پس اگر وہ کلام چند محمل رکھتا ہو تو بغیر دلیل عقل و نقل کے اس کے محمل کی تعیین کے درپے نہ ہو کہ یہ روش اکثر راہ مستقیم سے دور ڈال دیتی ہے۔ ہرچند کہ یہ بات عقل کے نزدیک معقول ہے' تاہم اس بات پر کہ اس امر کا لحاظ رکھنا واجب ہے' نقل سے بھی اشارہ لانا چاہئے۔ (اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑھیا سے گفتگو کرتے ہوئے بطور مزاح فرمایا کہ **لا تدخل الجنتہ عجوز** یعنی۔ کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ اس خاتون نے معنی مطابقی سے زائد ایک قید اپنی طرف سے بڑھا کر ارشاد نبویؐ کو اس پر محمول کیا کہ جو عورت اس وقت بڑھیا ہے وہ جنت میں نہیں جائے گی' اس لئے وہ خوف زدہ ہوئی اور دریافت کیا کہ حضورؐ! بوڑھی عورتیں اس نعمت سے کیوں محروم رہیں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

أما تقرئين القرآن: ﴿إِنَّا أَنشَأْنَـٰهُنَّ إِنشَآءً فَجَعَلْنَـٰهُنَّ أَبْكَارًا﴾ (سورة الواقعة: ٣٥ - ٣٦)

(مشکوۃ ص ۴۱۶)

"کیا تم قرآن نہیں پڑھتی ہو؟ (حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) ہم نے پیدا کیا ان کو ایک اچھی پیدائش پر' پس ہم نے بنایا ان کو کنواریاں۔"

پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی حقیقت تک رسائی حاصل کریں تو وہ یہ ہے کہ "بڑھیا" کے لفظ کا صرف یہی ایک محمل نہیں کہ جو عورت اس وقت بڑھیا ہو صرف وہی مراد لی جائے' بلکہ اس کا ایک دوسرا محمل بھی ہے' یعنی جنت میں داخل ہونے کے وقت بڑھیا ہونا۔ ایک محمل کو لے کر دوسرے کو چھوڑنا معنی مطابقی سے خارج ہے۔ اس لئے سامع کے لائق حال یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک محمل کی تعیین کراتا' یہ نہیں کہ معنی مطابقی سے زائد ایک محمل کو اپنی طرف سے طے کر کے اس پر سوال کی بنیاد اٹھاتا۔

دوسرا مقدمہ

۲۔ اگر عالم اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر اسباب و مسببات کے درمیان عموم و خصوص کی نسبت ہے کہ سبب عام اور مسبب خاص نظر آتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ بعض اسباب کو اپنے مسبب کے ساتھ' دوسرے اسباب کی بہ نسبت' خصوصیت زائدہ ہوا کرتی ہے' جس کی وجہ سے اکثر اس مسبب کا تحقق اسی سبب سے ہوتا ہے' اور یہ چیز اکثر ان لوگوں کے لئے راہزن ثابت ہوتی ہے اور انہیں غلطی میں ڈال دیتی ہے جو معلول سے علت کو' مسبب سے سبب کو اور لازم سے ملزوم کو ثابت کرنا چاہتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ جب تک علت و معلول کی مساوات تحقیق کو نہ پہنچ جائے "استدلال انی" ناتمام رہتا ہے' اور رفع مقدم رفع تالی کا اور وضع تالی وضع مقدم کا نتیجہ نہیں دیتا' چونکہ علم طب میں اکثر و بیشتر مسبب سے سبب کا اور اثر سے موثر کا سراغ لگایا کرتے ہیں' اس لئے قدر شناسان علوم' علم طب کو ظنیات میں شمار کرتے ہیں۔

۴۔ اور یہ قاعدہ نہ صرف یہ کہ اہل معقول کے نزدیک معقول ہے بلکہ منقولات میں بھی معمول بہا ہے۔ کلام ربانی و کلام نبویؐ دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت خضرؑ کا قصہ جو حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی رفاقت میں پیش آیا اس میں حضرت خضر علیہ السلام کے فعل کی تصویب فرمانا اس پر شاہد ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کشتی کے توڑنے اور بچے کو قتل کرنے میں حضرت موسیٰ کا حضرت خضر (علیہما السلام) پر نکیر کرنا اور یہ فرمانا کہ "آپ نے بڑی بھاری بات کی ہے' آپ نے بڑی بے جا حرکت کی ہے۔" محض اس وجہ سے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کشتی کے توڑنے اور بچے کے قتل کرنے کو بادی النظر میں ظلم و فساد پر محمول کیا' کیونکہ ایسی صورتوں میں قتل کا سبب اکثر و بیشتر یہی ہوا کرتا ہے' اور اپنے خیال میں حضرت خضر علیہ السلام کو ظالم سمجھا اور جو کہنا تھا' کہا۔ اور اس سبب کے اکثری ہونے کی وجہ سے حقیقت الامر کی طرف نظر مبارک نہیں گئی۔ آخر کار جب ان کاموں کی حقیقت معلوم ہوئی' تب معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام حق و صواب پر تھے' نہ کہ خطا کار' اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ عین احسان و انصاف تھا' نہ کہ ظلم و جفا۔ اور اس غلطی کا منشا اسی قاعدہ کی رعایت نہ کرنا تھا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا تجلیات ربانی میں مستغرق اور ازالہ منکرات کی صفت میں محو ہونے اور بغض للہ کے غلبہ کی وجہ سے تھا' بہر حال اس امر کا التزام ہر مستدل کو لازم ٹھہرا۔

۵۔ اور (مشہور قول ہے' جو قرآن کریم کی آیت سے ماخوذ ہے کہ) **ظنوا المؤمنین خیرا** (اہل ایمان کے بارے میں اچھا گمان رکھو) اس کے معنی بھی اس ہیچمدان کے نزدیک یہی ہیں کہ اگر اہل ایمان سے۔۔۔ جن کے حالات و قرائن ان کے ایمان کے شاہد ہوں۔۔۔ کوئی ایسا امر سرزد ہو جائے جو بظاہر منکر ہو تو اسے محض اسباب معروفہ پر محمول نہ کیا جائے' ہو سکتا ہے کہ ان کے اس فعل کا کوئی اور غیر

معروف سبب ہو' اور اس کے پیش نظران کا یہ فعل معروف (یعنی نیک) ہو' منکر (یعنی برا) نہ ہو۔ ورنہ کار خیر میں ظن خیر کا حکم دینے کی کوئی حاجت نہ تھی کہ یہ خود طبائع بشری کا مقتضا ہے۔

۶۔ اور حدیث میں جو قصہ آتا ہے کہ ایک شخص نے عین لڑائی کے موقع پر کلمہ پڑھا' بعض صحابہ کرامؓ نے یہ سمجھ کر اسے قتل کردیا کہ یہ کلمہ پڑھنا ایمان کی وجہ سے نہیں' بلکہ خوف جان کی وجہ سے ہے۔ اور جب یہ واقعہ بارگاہ نبویؐ میں پیش کیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرنے والے صاحب سے فرمایا:

"افلا شققت قلبہ" (صحیح مسلم ص۶۸ ج۱)

یعنی۔ "تونے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ یہ اخلاص سے کلمہ پڑھتا ہے یا محض جان بچانے کے لئے۔"

یہ ارشاد نبویؐ اس دعوئی پر دلیل کامل ہے کہ جس مسبب کے اسباب متعدد ہوں' اس کو (بغیر کسی قطعی دلیل کے) کسی ایک سبب پر محمول کرکے اس کے مطابق کارروائی کرنا سخت نامناسب ہے۔

تیسرا مقدمہ

۷۔ انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظامؒ اولاد و اقارب کی محبت اور نفس کی دیگر خواہشوں سے یکسر خالی اور معرا نہیں ہوتے' کہ یہ چیز دین و دنیا کے بہت سے نقصانات کی موجب ہے۔

ہرچند کہ یہ بات بظاہر نہایت گراں ہے کہ محبت دنیا و اہل دنیا کے مرادف نظر آتی ہے' اور بہت سے اکابر اولیاء اللہ کے اقوال اس کے خلاف مشعر ہیں' اور میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی شخص اول وہلہ میں اس کو قبول کرلے گا' اور ان حضرات

کی نسبت محبت دنیا و اہل دنیا کا معترف ہو گا۔ لیکن اگر اس کی حقیقت پر نظر ڈالیں تو ارباب فہم سے امید ہے کہ بے دریغ اس کو سر آنکھوں پر رکھیں گے۔ اس اجمال کی تفصیل اور اس مقال کی توضیح' باندازۂ وقت اور اپنے ذہن نارسا کے مطابق کرتے ہوئے اس کا اتمام و تکمیل آنجناب کے ذہن ثاقب پر چھوڑتا ہوں۔

۸- پس یہ بات خوب ذہن نشین رہنی چاہئے کہ صبر کی خصلت' کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے ساتھ مامور ہیں' اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو فقدان نعمت' دوسرے نعمت کی رغبت و محبت کا پایا جانا۔ کیونکہ مصیبت و ابتلاء' جو صبر کے ضروریات میں سے ہے' انہی دو عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ ورنہ اگر محض نعمت کے فقدان کا اعتبار کیا جائے (اور اس کے ساتھ اس نعمت کی رغبت و محبت کو ملحوظ نہ رکھا جائے) تو لازم آئے گا کہ (نعوذ باللہ) ابو جہل مقام صبر میں سید الصابرین و سرور مرسلین صلی اللہ علیہ وسلم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین سے بڑھ کر ہو' اور نمرود و فرعون حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) سے اس راہ میں گوئے سبقت لے جائیں۔ کیونکہ اگرچہ ان انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اکثر دنیوی نعمتوں سے محروم رکھا گیا' تاہم کسی قدر یہ نعمتیں ان کو عطا بھی کی گئیں۔ مگر (ابو جہل اور نمرود و فرعون وغیرہ) ان اشقیاء کو اخروی نعمتوں اور فضائل نبوی میں سے ایک حبہ بھی نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں نعمائے آخرت کے ایک ذرہ کے مقابلہ میں کیا قیمت رکھتی ہیں؟ اتنی قیمت بھی نہیں رکھتیں جو آسمان و زمین کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی ہو سکتی ہے' پس اگر صبر اسی کا نام ہے کہ آدمی نعمت سے محروم ہو تو لازم آئے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا صبر اور ان کی ساری جانفشانیاں ان اشقیاء کے صبر تک نہ پہنچ سکیں' اور یہ لازم قطعاً باطل ہے' جیسا کہ ظاہر ہے۔ اور جب صبر کا تحقق نعمائے مفقودہ کی محبت پر مبنی قرار دیا جائے تو لامحالہ صبر کا زیادہ ہونا محبت کی زیادتی

پر مبنی ہوگا۔ یعنی کسی چیز سے جتنی زیادہ محبت ہوگی اس کے فقدان پر اسی قدر صبر بھی زیادہ ہوگا۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو مدۃ العمر بے سروسامان رہے اور بظاہر بہت سی تکلیفوں میں زندگی بسر کی، ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ ان کا صبر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے صبر کے ہم سنگ ہوسکتا ہے۔ یہیں سے ارشاد نبویؐ ما أوذی نبی ما آوذیت (کنز العمال، حدیث:۵۸۱۷۔ ۳۲۱۴۰۔)(یعنی کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں دی گئیں جس قدر کہ مجھے دی گئیں) کی تفسیر معلوم کرنی چاہئے۔

۹۔ الغرض اولاد و اقارب کی محبت کاملین کے دل میں بوجہ اکمل ہوا کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت، جو اپنی جہت و مقتضا میں محبت مذکورہ کے معارض ہے، ان حضرات کے قلوب پر اوپر نیچے سے اس طرح محیط ہوتی ہے کہ دوسروں کی محبت اس کے سامنے مغلوب اور مضمحل ہوجاتی ہے، اور وہ کسی موقع پر اس انداز میں ظہور پذیر نہیں ہوتی کہ اپنا کام کرسکے۔ جس طرح بھائی کی محبت بیٹے کی محبت کے نیچے چھپ جاتی ہے، اسی طرح دنیا اور اہل دنیا کی محبت بھی محبت خداوندی کے دامن میں روپوش ہوجاتی ہے۔ اور تزکیہ و تصفیہ درحقیقت اسی سے عبارت ہے کہ غیراللہ کی محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت میں محو ہوجائے۔ اور یہ جو بعض اکابر اولیاءؒ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کے دلوں سے دنیا کی محبت نکل جاتی ہے، ان کی مراد۔ واللہ اعلم۔ یہی ہے (کہ دنیا کی محبت، محبت خداوندی میں محو اور فانی ہوجاتی ہے) یہ نہیں کہ مرد مجاہد غیراللہ کی محبت کو، اسی طرح دوسرے رذائل کو، جو درحقیقت اسی (غیراللہ کی محبت) سے جنم لیتے ہیں، بیخ و بن سے نکال کر پھینک دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیز انفکاک ذاتیات اور اس کے لوازم کے قبیل سے ہے (جو عقلاً محال ہے)۔

مع ہذا اولاً: حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: لا تبدیل لخلق اللہ (الروم:۳۰)
(یعنی: اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی)۔

ثانیاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إذا سمعتم بجبل زال عن مكانه فصدقوه، وإذا سمعتم برجل تغير عن خلقه فلا تصدقوه فإنه يصير إلى ما جبل عليه. (مشکوٰۃ ص ۲۴)'(مسند احمد ص ۴۴۳ ج ۶)

"جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے اس کو تو مان لو' اور جب تم کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی طبیعت سے بدل گیا ہے تو اس کو نہ مانو' کیونکہ وہ اسی چیز کی طرف لوٹے گا جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔"

اور عزیز و اقارب کی محبت اور نعمتوں کی رغبت کا طبعی ہونا ایسا ظاہر ہے کہ اس کے ثابت کرنے کے درپے ہونا محض عبارت کا دراز کرنا ہے۔ مگر چونکہ محبت خداوندی اور محبت اغیار دونوں متعارض اور متنافی ہیں' اس لئے جس وقت محبت خداوندی کا غلبہ و شدت جس قدر کم ہوگی لامحالہ محبت اغیار اسی قدر ظہور پذیر ہوگی' اور یہ بات اپنی جگہ معروف و معلوم ہے کہ محبت خواہ کسی قسم کی ہو' اس کا جوش اور ہیجان ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا کرتا' کبھی محبت الٰہی جوش میں آتی ہے تو بظاہر محبت غیر کا نام و نشان نہیں چھوڑتی' جیسا کہ ارشاد نبوی ؐ ہے:

لی مع الله وقت لا يسعني فيه ملك مقرب ولا نبي مرسل. (ذکرہ القاری فی الموضوعات الکبیر ص ۱۰۲ وقال: یذکرہ الصوفیۃ کثیراً' وھو فی رسالۃ القشیری)

"میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جس میں نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہے' نہ کسی نبی مرسل کی۔"

اور کسی وقت اس کی آگ ٹھنڈی ہوجاتی ہے اور دوسروں کی محبت کو سر اٹھانے کی فرصت دیتی ہے۔ اسی قسم کے اوقات میں یہ ہوا ہوگا کہ سبط اکبر

(حضرت حسن) رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

اللهم إني أحبه فأحبه.

(متفق علیہ من حدیث البراء۔ مشکوۃ ص ۵۶۸)

"یا اللہ! میں ان سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ بھی انہیں اپنا محبوب بنا لیجئے۔"

اسی طرح کے دوسرے واقعات جو حضرات حسنین اور حضرت حمیراء رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت کے معاملات میں مشعر ہیں۔

۱۰۔ الغرض اس شکستہ خاطر کی نظر قاصر میں یوں آتا ہے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اقارب کے ساتھ محبت سب سے زیادہ تھی' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كل نسب وصهر وينقطع يوم القيامة إلا نسبي وصهري. (درمنثور ص ۱۵ ج ۵۔ کنز العمال ص ۴۰۹ ج ۱۱۔ حدیث: ۳۱۹۱۵)

"تمام نسبی اور دامادی رشتے قیامت کے دن ٹوٹ جائیں گے' سوائے میرے نسبی و دامادی رشتے کے۔"

یہ ارشاد بھی اسی کی خبر دیتا ہے' یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رابطہ محبت و علاقہ یگانگت اپنے اقارب کے ساتھ ایسا مضبوط و مستحکم ہے کہ ایسے دن کے ہول کی شدت کے صدمہ سے بھی نہیں ٹوٹے گا' جبکہ سب لوگ نفسی نفسی پکارتے ہوئے ایک دوسرے کو بھول جائیں گے' اور ہر شخص اپنے عزیز و اقارب سے بیگانہ وار منہ پھیر لے گا۔ پس (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنے اقارب سے سب سے بڑھ کر ہے تو) لامحالہ کسی نہ کسی وقت اس کا کوئی نہ کوئی اثر

ضرور ظاہر ہوگا۔ کیونکہ مشہور مقولہ ہے' الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ (یعنی جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازمات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اگرچہ محبت خداوندی' محبت اقارب کو اپنے مقتضا کے اندازے سے باہر پاؤں رکھنے نہیں دیتی۔

چوتھا مقدمہ

۱۱۔ کسی چیز کی خبر نہ دینا' اس چیز کے عدم کی خبر دینے کے ہم معنی نہیں' جیسا کہ ظاہر ہے' اور آیت شریفہ **ولا تقف ما لیس لک بہ علم** (بنی اسرائیل:۳۶) اس کی موید ہے۔ (یعنی ایسی چیز کے درپے نہ ہو جس کا تجھ کو علم نہیں)

(شرح اس کی یہ ہے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی چیز کے نہ ہونے کی خبر دی جائے کہ فلاں چیز وقوع میں نہیں آئے گی' اور ایک صورت یہ ہے کہ کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں خبر نہ دی جائے' بلکہ اس معاملہ میں خاموشی اختیار کی جائے' پہلی صورت میں اس چیز کا وقوع میں آنا ممکن نہیں' ورنہ خبر کا کاذب ہونا لازم آئے گا' اور دوسری صورت میں چونکہ اس شے کے وقوع یا عدم وقوع کی خبر نہیں دی گئی' بلکہ اس کے معاملے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے' لہٰذا اس چیز کا وقوع میں آنا اور نہ آنا دونوں ممکن ہیں' اس سے واضح ہوا کہ کسی چیز کی خبر نہ دینا اس چیز کے عدم کی خبر دینے کے ہم معنی نہیں۔)

۱۲۔ ان مقدمات کے بعد گزارش ہے کہ حدیث شریف کے جملہ **ولا اراکم فاعلین** میں نفی مفعول ثانی سے فعل "اریٰ" کی طرف محول ہے' جو کہ افعال قلوب میں سے ہے۔ (یعنی اس جملہ میں بظاہر نفی فعل "اریٰ" پر داخل ہے' لیکن درحقیقت یہ نفی اس کے مفعول ثانی یعنی فاعلین کی طرف راجع ہے۔) کیونکہ

بظاہر اس کلام سے مقصود عدم فعل کی خبر دینا ہے بطور انکشاف' نہ کہ عدم انکشاف فعل کے جزم و یقین کا اظہار کرنا۔ (یعنی بظاہر اس جملہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کو امیر نہیں بنائیں گے' گویا ان کے عدم فعل کے انکشاف کی خبر دینا مقصود ہے' یہ بتلانا مقصود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا انکشاف نہیں ہوا کہ صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کو امیر بنائیں گے یا نہیں بنائیں گے؟ گویا اپنے عدم انکشاف کے جزم و یقین کا اظہار مقصود نہیں) ورنہ (اگر عدم انکشاف کو مقصود کلام قرار دیا جائے تو اندریں صورت) سنیوں کے دامن کو شیعوں کی کشمکش اور عبداللہ بن سبا کے مقتدیوں کی دارو گیر سے' جو اس مقام میں ہوسکتی ہے' کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؟ کیونکہ اس توجیہ کی بنا پر جملہ ولا أراکم فاعلین صحابہ کرامؓ پر تعریض کا ماخذ ہی نہیں ہوسکتا (اس لئے کہ اس جملہ میں رؤیت سے رؤیت قلبی یعنی علم مراد ہے' تو نفی رؤیت کے معنی نفی علم کے ہوئے' اور مطلب یہ ہوا کہ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ تم اس کام کو کرو گے یا نہیں کرو گے؟ اس صورت میں صحابہؓ پر تعریض کی کیا گنجائش رہی؟)

(اور یہ جو عرض کیا گیا کہ اس جملہ سے مقصود عدم فعل کی بطور انکشاف خبر دینا ہے) اس توجیہ کی تعیین کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ آنجناب نے بھی اسی معنی کو مسلم رکھا' ورنہ آنجناب نے جو فرمایا کہ اس فقرہ کی مراد تحریر کی جائے' اس کی کیا حاجت تھی؟

۱۳- اور یہ قلب و تحویل فقط میری تراشیدہ نہیں' بلکہ کلام ربانی اور احادیث نبوی..... علی مصدرہا الصلوۃ والسلام..... میں باقرار جمیع اہل فہم بہت سی جگہ واقع ہے۔ ایک ایک جملہ کلام خداوندی اور کلام نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

جو جواز تحویل و استعمال قلب پر دلالت کرتا ہے' بطور نمونہ ذکر کرتا ہوں۔ ارشاد ربانی: لا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (المنافقون:۹) میں نہی مخاطبین کے بجائے اموال و اولاد کی جانب پھیر دی گئی ہے۔ (یعنی بظاہر اموال و اولاد کو منع کیا جا رہا ہے کہ وہ تمہیں ذکر الٰہی سے غافل نہ کردیں) لیکن مقصود (خود مخاطبین کو منع کرنا ہے' اور کہنا) یہ ہے کہ تم لوگ اموال و اولاد میں مشغول ہو کر ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے۔

إنكم معروضون على أعمالكم. (مشکوۃ ص ۴۴۵)

"تم پیش کیے جاؤ گے اپنے عملوں پر۔"

بظاہر مراد یہ ہے کہ "تمہارے اعمال تم پر پیش کیے جائیں گے۔"

زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہاں تحویل اور طرح کی ہے' اور وہاں دوسری قسم کی۔ لیکن زیر بحث تحویل میں ایک تو عدم فعل کی نسبت کی تاکید ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل کو نہ دیکھنا' دراں حالیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر تمام نظروں سے وسیع تر ہے' اور اس نوع کے پیش آنے والے واقعات کو محیط ہے' عدم فعل کی دلیل ہے۔ اور اسی تحویل کے سبب یہ جملہ **قضایا قیاساتہا معہا** کے قبیل سے ہو گیا۔ ("**قضایا قیاساتہا معہا**" ایسے جملوں کو کہا جاتا ہے کہ اگر ان کے موضوع و محمول اور نسبت کا مفہوم ٹھیک سے سمجھ لیا جائے تو ان کی صداقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے' ان پر کسی الگ دلیل کے قائم کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔) علاوہ ازیں اس میں لطیف اشارہ ان لوگوں کے جواب کی طرف ہے جنہوں نے جملہ **ولا اراکم الخ** کو صحابہ کرامؓ کی تعریض کی طرف کھینچا اور اسے اپنے عقیدۂ فاسدہ کی سند اور صحابہ کرامؓ کی جانب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دربارۂ خلافت ظلم و تعدی کے صدور کی دلیل ٹھہرایا۔

۱۴۔ توضیح اس کلام کی یہ ہے کہ (جملہ ولا اراکم میں فعل کے دیکھنے کی نفی ہے اور) فعل کو نہ دیکھنا عدم فعل کو دیکھنے سے عام ہے کیونکہ (عدم فعل کو دیکھنا تو صرف اسی صورت ہو گا جب کہ فعل کو نہ ہوتے ہوئے دیکھا ہو اور) فعل کو نہ دیکھنا (صورت مذکورہ کے علاوہ) اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے جب کہ فعل تو ہوا ہو لیکن دیکھنے والے نے اس کو نہ دیکھا ہو' پس اگر اس جملہ کو اپنی اصل پر رکھیں اور تحویل کا اعتبار نہ کریں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ظلم کو ثابت کرنے والوں کے لئے یہ جملہ حجت نہیں بن سکتا۔ پس مقصود کو اس پیرائے میں ادا کرکے دشمنان صحابہؓ کو دوسرے خیال میں ڈال دیا گیا' تاکہ بے ادبوں کا ہاتھ ان کے پاک دامن کی طرف دراز نہ ہو۔ لیکن جو حضرات کہ طبع سلیم و فہم مستقیم رکھتے ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ اس کلام کے معنی مطابقی اس سے زیادہ نہیں کہ "میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر نہیں بناؤ گے۔" رہا یہ مضمون کہ "ان کے فضائل و کمالات سے آنکھیں بند کرکے محض ہوائے نفسانی کے تقاضا سے دیدہ و دانستہ ان سے اعراض کرو گے۔" میں گمان نہیں رکھتا کہ اربابِ فہم اس مضمون پر اس جملہ کی دلالت کے مدعی ہوں گے۔ علاوہ ازیں ان کو امیر نہ بنانا محض کینہ و عناد میں منحصر نہیں کہ یہ دلالت عقلی سے ثابت ہو جاتا۔ ہاں! یہ جملہ اس کا بھی احتمال رکھتا ہے اور ایک دوسرا محمل بھی رکھتا ہے۔ یعنی حدیث نبویؐ:

ویأبی اللہ والمؤمنون إلا أبا بکر.

(ابو داؤد ص ۲۸۵' کتاب السنۃ' باب استخلاف ابی بکر رضی اللہ عنہ)

ترجمہ۔ "اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا سب کا انکار کرتے ہیں۔"

کے مضمون کی طرف اشارہ ہو' اور پہلا احتمال محض احتمال ہی احتمال ہے (جس

پر کوئی قرینہ نہیں) جبکہ دوسرے احتمال کی تائید حدیث مذکورسے' نیز دیگر نصوص سے مہیا ہو رہی ہے' نیز بلاحظہ مناقب صحابہؓ عقل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ پس حیف ہے کہ بغیر دلیل کے محض احتمال سے چمٹے رہیں اور جو قرائن کہ تعیین مراد پر دلالت کرتے ہیں ان سے دیدہ و دانستہ آنکھیں بند کرلیں۔

۱۵۔ مگر شاید اس مقام میں کسی کے دل میں ایک اور وسوسہ آئے اور یہ کہے کہ وجدان کی شہادت یہ ہے کہ ایسا کلام اظہار حسرت و تمنا کے موقع پر سرزد ہوا کرتا ہے' پس دیدۂ انصاف کھول کر دیکھنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار حسرت اور آپؐ کی آرزو کلام کو کس محمل پر پھینکتی ہے اور سیاق کو کس جانب کھینچتی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ اول تو وجدان کی شہادت مسلم نہیں' کیونکہ ممکن ہے کہ حسرت و افسوس کے بغیر' مطلق اخبار بالغیب مد نظر ہو' اور اگر بپاس خاطر شیعہ اس کو قبول بھی کرلیں' اور اس احتمال سے بھی قطع نظر کرلیں کہ یہ ارشاد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولیت کے انکشاف سے پہلے کا ہو' تب بھی اس جملہ سے ان کی مطلب براری ناممکن ہے' کیونکہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے بشری تقاضے ناگزیر ہیں' جیسا کہ مذکور ہوا' اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تمنا رکھتے ہوں تو کون سا محذور لازم آتا ہے کہ اہل سنت و جماعت اس کی جواب دہی کی فکر میں جگر کو خون کریں۔

۱۶۔ اور اگر اس تقریر سے بھی سینہ وسوسے سے پاک نہ ہو تو لیجئے! یہ روایت بھی موجود ہے:۔

حافظ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں' ان آیات و احادیث کے ذکر میں' جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف مشیر ہیں' لکھتے ہیں:

أخرج الدار قطني في الأفراد والخطيب وابن عساكر عن علي رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ سألت الله أن يقدمك ثلاثا فأبى علي إلا تقديم أبي بكر رضي الله تعالى عنه. (تاریخ الخلفاء، ص٥٤)

ترجمہ۔ "دار قطنی نے افراد میں اور خطیب اور ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تین مرتبہ بارگاہ الٰہی میں تمہارے مقدم کرنے کی درخواست کی، مگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو مقدم کرنے سے انکار کردیا۔"

مان لیجئے کہ اس حدیث کی تخریج کرنے والوں کے سنی ہونے کی وجہ سے شیعوں کو تسکین نہیں ہوگی، مگر اس بارے میں کیا کہیں گے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر و انور پر کیا کچھ قلق نہ گزرے؟ آخر یہ ساری بے تابیاں کس وجہ سے تھیں؟ بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی محبت نے نوبت یہاں تک پہنچائی، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہاں! اگر ابوجہل کی بیٹی سے نکاح حرام ہوتا تو اس سے منع کرنے کے لئے یہ اہتمام فرمانا اور خطبہ ارشاد فرمانا مقتضائے نبوت پر منطبق ہوسکتا تھا۔ اس قصہ کا سیاق حدیث میں دیکھ لیا جائے، معلوم ہوجائے گا کہ یہ تمام تر رنج والم حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی محبت کی بنا پر تھا، ورنہ اس ارشاد کا کیا محل تھا کہ "میں حلال کو حرام نہیں کرتا۔"

۱۷۔ الغرض کچھ عجب نہیں کہ زیر بحث واقعہ میں بھی کم و بیش طبیعت بشری و محبت نسبتی کی بنا پر خاطر انور کا میلان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی جانب ہو، مگر

ابو جہل کی بیٹی حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی زوجیت کا استحقاق نہیں رکھتی تھی اور اس نکاح کا منعقد ہونا ضروریات شرع میں سے نہیں تھا کہ اس کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے قلب مبارک کے رنج کو' جو فی الواقع اپنا رنج تھا' گوارا کرلیا جاتا اور اقارب کی غم خواری وصلہ رحمی کی خوبی سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بارے میں اہتمام نہ فرمایا جاتا۔ بخلاف زیر بحث واقعہ کے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کمالات سابقہ کی بنا پر اور ان کی اول سے آخر تک کی جانفشانیوں کے مدنظر' جن کو شیعہ بھی جانتے ہیں' اگرچہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں' لازم ہوا کہ تقاضائے محبت طبعی سے برطرف رہیں' اور حقدار کو اس کا حق پہنچائیں' چنانچہ وقتاً فوقتاً مناسب مواقع پر اس بارے میں اس قدر ارشادات فرمائے کہ جو حضرات فہم سخن کی مشق رکھتے ہیں وہ دلالت نصوص کو بھی ان کے ہم سنگ قرار نہیں دیتے' مگر اندھے کی آنکھ کو آفتاب بھی سیاہ دکھائی دیتا ہے' اور زکام کے مریض کی قوت شامہ کو تیز گلاب بھی ماؤف کردیتا ہے۔

۱۸۔ حاصل یہ کہ جملہ **"ولا اراکم فاعلین"** سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان خاطر سمجھنا اور پھر اس رجحان طبیعت اور میلان خاطر نبوی (علیہ وعلی الہ الف الف تحیۃ وسلام) سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاق کا سراغ لگانا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان کو امیر نہ بنانے کو کینہ وفساد اور ظلم وعناد پر مبنی سمجھنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس قسم کے فرقوں کی خبر نہیں رکھتے۔ نہ ان کی معنی مطابقی پر نظر ہے' نہ سبب ومسبب کے عموم وخصوص کی خبر ہے' ان تمام امور کے ساتھ ساتھ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے طبعی مقتضیات کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں' اس لئے ناگفتنی باتیں کہتے ہیں۔ معانی سنجان اہل انصاف کی روش یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کلام کے اصل مدلول پر نظر ڈالتے ہیں' پھر عموم مسبب پر نظر رکھتے ہیں' اس کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام کو بشر جان کر اس جملہ کے معنی پر غور کرتے

ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر اس کلام سے اہل سنت کے مذہب پر کوئی طعن نکلتا ہو تو اس حدیث سے استناد کرتے ہوئے شیعہ کا شور و غوغا البتہ بجا ہو گا۔

۱۹۔ یہ تمام تقریر تو اس صورت میں ہے کہ "من نومر بعدک" میں بعدیت سے بعدیت متصلہ مراد لی جائے' اور رؤیت سے رؤیت انکشافی مراد ہو' اور اگر رؤیت سے رؤیت استدلالی مراد لی جائے تو جواب کی حاجت تو ایک طرف' اعتراض کے وارد ہونے میں بھی کلام ہے۔ کیونکہ استدلال کا راستہ پیچ در پیچ ہے' اور اس میں خطا کا واقع ہونا ممکن ہے' خواہ نبی سے ہو خصوصاً شیعہ کے نزدیک کہ ان کا تو خدا بھی خطا کر جاتا ہے' یہاں تک کہ اس کو بدأ واقع ہو جاتا ہے' انبیاء کرام علیہم السلام کی تو کیا بات ہے؟ قیدیان بدر کے رہا کرنے کا قصہ مشہور ہے۔ دوسرے استدلات کو بھی اسی پر قیاس کرلیا جائے۔ اس صورت مین خود حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا امیر ہونا ہی اس پر دلالت کرتا ہے۔

اور اگر بعدیت مطلقہ مراد ہو تو تعریض مذکور کا ثابت ہونا تو کجا؟ الٹا اس امر کے جواب کی فکر لازم ہوگی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بے ساختہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا' اور کچھ نہ سوچا کہ اس سے (نعوذ باللہ) حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خلاف واقعہ ہونا لازم آئے گا۔

۲۰۔ مگر حق یہ ہے کہ رؤیت سے رؤیت انکشافی مراد ہے اور "من نومر بعدک" میں بعدیت سے بعدیت مطلقہ مراد ہے' اور سوال سے مقصود اشخاص کی تعیین ہے' نہ کہ اوصاف کا معلوم کرنا۔ اور اگر بعدیت کو بشہادت عرف' اور اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ قیامت تک کے تمام خلفاء کی تعیین کرانا مقصود نہیں تھا' بعدیت متصلہ میں منحصر رکھیں تب بھی جواب تو مطلق ہے۔ اور سوال کے مقید ہونے کے باوجود جواب کو مطلق رکھنا اگرچہ تنگ نظر' بے بصیرت لوگوں کی

آنکھوں میں نہیں سمائے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ سوال کچھ اور ہو' اور جواب کچھ اور؟ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے تمام خلفاء کی خبر نہیں دی' فقط اصحاب ثلثہؓ کے احوال کو ذکر فرمایا' جس سے بظاہر بطور تخمیر ان اکابر میں سے کسی ایک کے استخلاف کا اشارہ فرمایا۔ مگر اہل بلاغت سے پوچھئے کہ اطلاق و تقیید کی اس مخالفت نے اور اصحاب ثلثہ کے اوصاف کے بیان نے کلام کو بلاغت سے گزار کر حد اعجاز تک پہنچا دیا۔ گو مجھ کم فہم کو حق نہیں کہ اس کلام کی خوبی کے دعویٰ اور اس کے اشارات کے بیان میں لب کشائی کروں' کہ یہ در حقیقت اپنے فہم کی مدح و ستائش ہوگی (مولانا رومیؒ نے کیا خوب فرمایا!)

مادح خورشید مداح خود است
کہ دو چشمم روشن و نامرمد است

(آفتاب کی تعریف کرنے والا در حقیقت اپنی مدح کرتا ہے کہ میری دونوں آنکھیں روشن ہیں' اندھی نہیں)۔

۲۱۔ لیکن بات زبان پر آگئی تو کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا' امید ہے کہ میرے بیان کے سقم پر قہقہہ نہیں لگائیں گے' عنایت فرما کر غور سے نظر کریں گے کہ اس کلام میں' جو سراسر اعجاز ہے' سب سے پہلے آیت کریمہ: **و یسئلونک عن الاہلۃ' قل ہی مواقیت للناس الایۃ** (البقرۃ: ۱۸۹) کے مطابق انداز سوال سے ہٹ کر جواب مرحمت فرمایا' جس سے سائل کے سوال کے نقص پر تنبیہہ فرمائی گئی۔ بعد ازاں جملہ خلفاء کے بیان کی طرف متوجہ ہوئے' مگر چونکہ ان کے اشخاص کی تعیین میں کلام طول پکڑتا اور منفعت قلیل ہوتی۔ اس لئے سائل کی تسکین خاطر کے لئے چند اوصاف بیان فرمائے' جن سے سائل کے سوال کا جواب بھی نکل آئے اور قیامت تک خلفاء کے تقرر کے سلسلہ میں امتیوں کے ہاتھ میں ایک دستور العمل

بھی موجود رہے' واقعی دریا کو کوزے میں بند کردیا اور ایک بڑے مضمون کو چند الفاظ میں بیان فرمادیا۔

چونکہ اس معما کی شرح اس پر موقوف ہے کہ حقیقت خلافت اور لوازم نبوت کو بیان کیا جائے' اس لئے اپنے فہم ناقص کے مطابق ذرا سا اشارہ اس کی طرف کرتا ہوں۔

۲۲۔ جناب من! کسی کا خلیفہ وہ شخص ہوا کرتا ہے جو اس کا کام کرے' پھر اگر وہ کام کسی منشائے کمال اور ملکہ پر موقوف ہو تو لامحالہ اس ملکہ سے بھی اس خلیفہ کو کم و بیش کچھ نہ کچھ حصہ نصیب ہو گا' ورنہ اس مصرعہ کا مصداق ہو گا۔

ے ایں رہ کہ تو میروی بترکستانست

مگر چونکہ گفتگو خلافت نبوت میں ہے' اس لئے پہلے ضروریات نبوت کی شناخت کرنی چاہئے تاکہ خلافت نبوت میں بھی ان ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے۔ پس اس شکستہ خاطر کی نظر قاصر میں یوں آتا ہے کہ نبی کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ کمال قرب کو پہنچا ہوا اور نہایت برگزیدہ ہو' کہ ایک عالم کی افسری اور بنی نوع کی رہبری ہر کس و ناکس کو نہیں دیا کرتے۔ اب چونکہ اس کی قوت نظری کا جمال اور قوت عملی کا کمال معرض امتحان میں ہے کہ کہاں سے کہاں تک پہنچا ہوا ہے' لہٰذا اسے اسرار احکام اور قواعد تدبیر ہدایت سکھا کر گرفتاران ضلالت کی جانب روانہ کرتے ہیں' پس اگر وہ لوگ اس کے کہنے پر قیود رسوم توڑ ڈالیں تو ٹھیک' ورنہ جو شخص اس کے ساتھ دست و گریباں ہوا سے زور ہمت کے ساتھ زیر و زبر کر ڈالے' یا اپنی جان پر کھیل جائے۔

۲۳۔ پس اس تقریر سے تین امر ہاتھ آئے' جو جدا جدا اصحاب ثلثہ کے عنوان سے حدیث میں مذکور ہیں' اور سب کی اصل اس حد تک کمال قرب ہے جس میں بعد کے نام کے دخل کی بھی گنجائش نہ رہے' مگر چونکہ ایسا قرب اس ذات عالی کے

ساتھ' جو استغنا کی بلندیوں میں وراء الوراء ہے' ان لوگوں کے لئے جو ہوا وہوس کی پستی میں گرے ہوئے ہیں' زہد عن الدنیا اور رغبت فی الآخرہ کے دو شہپروں کے بغیر محالات میں سے ہے' اس لئے سب سے پہلے تو نبی کے لئے یہ لازم ہوا کہ وہ ان دو کمالوں میں کمال رکھتا ہو۔ دوسرے اس کے لئے ہمت قوی اور عزم بلند درکار ہے کہ اپنے کام میں ننگ و ناموس کی بھی پرواہ نہ رکھتا ہو' جو کہ' جیسا کہ تم جانتے ہو' جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تیسرے اس کے لئے لوگوں کے حال کی نگہداشت ضروری ہوئی' تاکہ نیک و بد کو پہچان کر نیک کام کی ہدایت فرمائے' اور برے کام سے منع کرے۔ یہ تین چیزیں ہیں جو نبی کے لئے ضروری ہیں' اور یہیں سے ان اوصاف ثلثہ کی' جو اصحاب ثلثہ کے لئے نامزد کئے گئے' وجہ تخصیص معلوم ہو گئی۔

۲۴۔ مگر ان اوصاف ثلثہ کا اگر ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے دیکھیں تو ان کے درمیان ایسا فرق مراتب محسوس ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو نہیں پہنچتا۔ توضیح اس راز کی یہ ہے کہ نبوت کی اصل اور اس کا مصداق صرف کمال قرب ہے اور بس' اور ہدایت خلق اس کے آثار و مقتضیات سے ہے' اور ہمت قوی اس کے آلات میں سے ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہدایت کے لئے ضلال اور اہل ضلال کی ضرورت ہے' اور ہمت قوی کو اپنا کام کرنے کے لئے مخالفوں کی مخالفت درکار ہے' ورنہ اگر مخالفت نہ ہو تو ہمت کس سے مقابلہ کرے گی؟ اور گمراہی نہ ہو تو ہدایت کس سے لڑے گی؟ ادھر کمال قرب کو دیکھئے تو اس کو سوائے ذات ربانی کے کسی چیز کی ضرورت نہیں' اور ظاہر ہے کہ آلات کی ضرورت ہمہ وقت نہیں ہوا کرتی' اور آثار کے لئے لزوم ضروری نہیں کہ وہ ہمہ دم مرتب ہوا کریں' البتہ نبوت کی اصل اور مصداق کہ کمال قرب کا نام ہے' وہ ہر لحہ ناگزیر ہے' نیز ہدایت کی توجہ غیر کی طرف ہے اور زہد فی الدنیا و رغبت فی الآخرہ' جو کہ

قرب کے ملزومات ہیں' ان کا رخ تمام تر حق تعالیٰ شانہ کی ذات محض کی طرف ہے' اور قوت ہمت کا رخ دونوں طرف ہے کہ مقام قرب کے علوم و معارف سے احکامات وصول کرتی ہے' اس کے بعد قوت عاقلہ و عاملہ کو ہدایت کے کام میں استعمال کرتی ہے۔ جب یہ ایسا ہے تو اول یعنی زہد کا مرتبہ اول ہوا' اور دوم یعنی ہمت بلند اور عزم قوی کا مرتبہ دوسرا ٹھہرا۔ علیٰ ہٰذا القیاس نگہداشت تیسرے مرتبہ پر ہوئی۔

پس اگر ان اوصاف ثلٰثہ میں کسی کا قدم اس طرح آگے ہو کہ دوسرے اس کے گرد نہ پہنچ سکیں تو اگر وصف اول یعنی زہد ہے تو علی الاطلاق اس کا استحقاق سب سے پہلے ہوگا' ورنہ دیکھنا چاہئے کہ اگر مہمات عظیمہ رونما ہوں تو امانت خلافت' صاحب ہمت بلند اور قوی دل کے سپرد کرنی چاہئے' اور اگر حوادث ضلال اور شیوع بدعات دین قدیم میں رخنہ انداز ہوں یا ان کا خطرہ دل میں کھٹکے تو ہادی و مہدی کو مسند خلافت پر لایا جائے' کیونکہ مثل مشہور ہے کہ "ہر کارے و ہر مردے۔"

۲۵۔ اب سننا چاہئے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قاعدۂ استخلاف ضبط فرمایا' جیسا کہ اوپر مذکور ہوا' اس کے بعد اصحاب ثلٰثہ میں سے ہر ایک کے مراتب' بیان اوصاف کے ضمن میں' بیان فرما کر ترتیب ذکری کی مکرر تاکید فرمائی۔ نیز اشارہ فرمایا کہ ان اصحاب ثلٰثہ میں سے ہر ایک کو ایک الگ کام کے لئے بنایا گیا ہے' اور انہیں الگ الگ کمال کے ساتھ نوازا گیا ہے۔ چنانچہ اگر طلب ربانی کا درد عارض حال ہو اور اس کے لئے رہبر کی ضرورت پیش آئے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دامن پکڑنا چاہئے کہ اس راہ میں ان کا قدم سب سے آگے ہے' اور اگر مہمات عظیمہ اور معاملات بزرگ پیش آئیں اور عام و خاص کی تربیت کی ضرورت آن پڑے تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے اس کام کے

اہتمام کی التماس کی جائے کہ وہ اس کام کے آدمی ہیں' ہمت قوی اور عزم مصمم رکھتے ہیں اور احکام الٰہی کے نافذ کرنے میں نہ کسی کا لحاظ رکھتے ہیں' نہ کسی کا خوف۔ وہ کسی سے اندیشہ ملامت نہیں رکھتے' نہ حق ان کو چھوڑتا ہے اور نہ وہ حق کو چھوڑتے ہیں۔ اور اگر بدعات واہوا کے ظہور کی وجہ سے حق و باطل کے گڈمڈ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زیر سایہ پناہ لی جائے کہ ان کا سینہ' جو اسرارِ الٰہی کا گنجینہ ہے' ہدایت مطلق کے آفتاب کا مطلع و مشرق ہوگا۔

۲۶۔ یہیں سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے فہم و فراست کا اندازہ کیا جائے کہ انہوں نے اس قسم کی احادیث نبویؐ پر کیسی گہری نظر ڈالی اور ان کی تعمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یعنی جب جاذبۂ الٰہی نے حبیب رب العالمین سید المرسلین علیہ افضل التسلیمات و اکمل التحیات کو دار دنیا سے اپنے جوار رحمت میں کھینچ لیا تو آپؐ کے پسماندگان وہی حضرات تھے جنہوں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے ماسوا کو دل سے نکال پھینکا تھا' جان و دل سے طلب حق میں مصروف ہو گئے تھے' اور ہر دم ہل من مزید پکارتے تھے۔ اس لئے مناسب یوں ہوا کہ ایسے باکمال حضرات کی سرداری و سربراہی کے لئے ایک ایسا شخص سامنے لایا جائے جو اس راستہ کے نشیب و فراز سے آشنا ہو' جو اس درد کی دوا جانتا ہو' اور زہد فی الدنیا و رغبت فی الآخرہ کا راستہ جس کا پامال راستہ ہو' تاکہ ان حضرات کی تربیت کر سکے اور ان کے ظاہر و باطن کی اصلاح کرے۔ چنانچہ بہت سے نصوص سے قطع نظر اور اس باب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت سے بھی قطع نظر خود اسی حدیث کی عبارت سے صحابہ کرامؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارے پا کر دست بیعت ان کی طرف بڑھایا اور انہیں سجادہ نبویؐ پر بٹھایا' چونکہ اس زمانے میں جہاد بھی شریعت و

طریقت کے ارکان میں سے تھا کہ مشقت و منفعت میں کوئی مجاہدہ اس کے ہم سنگ نہیں' اور دیگر مصلحتیں جیسے ترقی اسلام و تکثیر غنائم وغیرہ بھی اسی پر موقوف تھیں' اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سامان جہاد فراہم کیا اور شام و عراق کی طرف لشکر پر لشکر بھیجنا شروع کئے۔ بہت سے علاقے اسلام کے زیر نگین آئے' بہت سے گروہ مسلمان ہوگئے' اور اکثر لوگوں نے جزیہ ادا کرکے جان کا امان حاصل کیا' اور بے شمار اموال دار الخلافہ میں پہنچنے لگے' اسی دوران حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو داعیہ اجل پیش آیا اور وہ بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے رحمت حق سے جا ملے۔

۲۷- چوں کہ اس عرصہ میں جہاد کی یہ مہم بہت بڑھ چکی تھی' اور اس کے بڑھاؤ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا' ایک عظیم الشان مملکت کے امور کی انجام دہی کی فکر دل و دماغ پر سوار تھی' دشمن قوی سر پر موجود تھا' دور و نزدیک کے اہل حقوق کے حق کا ان تک پہنچانا واجب و لازم ہو چکا تھا' اس لئے مصلحت وقت یہ ہوئی کہ مسند خلافت پر ایک ایسا مرد قوی دل' بلند ہمت لایا جائے جو ان جھمیلوں اور بکھیڑوں سے گھبرائے اور اکتائے نہیں' جو ملامت گروں کی ملامت سے' جو ایسی ریاست گیری کے لوازم میں سے ہے' خصوصاً ایسے زمانے میں کہ ہر کس و ناکس کو بات کرنے کی مجال ہو' کمر ہمت نہ کھول دے' اور اس کار خلافت کے انتظام اور کارزار جنگ و جہاد کے اہتمام کیلئے پوری مستعدی سے کھڑا ہو' صحابہ کرامؓ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کمال کے ساتھ بدرجہ کمال موصوف دیکھا' اس کے ساتھ ساتھ دوسرے دلائل نقل بھی ان کی افضلیت پر گواہ تھے' اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی نصوص کی فرمانبرداری کی بنا پر' نیز خود اپنی فراست سے ان کی ولی عہدی کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ ان وجوہ سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے بیعت کی طرف ہاتھ بڑھایا' اور سر ان کے حلقہ اطاعت میں دے دیا'

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تو جیسا کہ چاہئے تھا' اس کام کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

۲۸۔ زمانہ ابھی تک اسی روش پر تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت پوری ہو گئی' اور شام و فارس کے سرکشوں کی سرکوبی کی مہم ناتمام رہ گئی' چونکہ کوئی نیا سانحہ' کہ جس کی رعایت کمال مرتضوی کی محتاج ہو' ابھی پیش نہیں آیا تھا' بلکہ اسی کار فاروقی کا اہتمام کارکنان خلافت کے پیش نظر تھا' اور اس طرف انتظام مہمات میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی روش ہر عام و خاص کے اس طرح ذہن نشین تھی کہ ان میں سے ہر شخص اس کام کے کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لئے صحابہؓ نے سب کو امر خلافت میں مساوی دیکھا' الغرض اس موقع پر مسند خلافت پر کسی خلیفہ کے بٹھانے میں سخت تحیر پیش آیا' مگر دانش فاروقی کا کمال دیکھو کہ کس طرح اشارہ نبویؐ پر چلے' اور کس طرح قاعدۂ استخلاف کی رعایت فرمائی یعنی اسی کمال قرب کو مرجح قرار دیا' اور ان چھ حضرات میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے کی وصیت فرمائی جو بارگاہ نبویؐ کے پسندیدہ اور درگاہ الٰہی کے نہایت مقرب تھے' آخر کار ان چھ حضرات میں سے باقیوں کے انکار کی وجہ سے امر خلافت حضرت ذوالنورین اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان دائر ہوا' بعض اکابر صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کو سمجھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعین میں بھی اسی فاروقی روش پر چلے' اور ان کی افضلیت و اقربیت کا لحاظ کرتے ہوئے' جو خصوصی قرب کو مستلزم ہے' اور جو اکثر نصوص اور زمانہ نبویؐ کے معاملات سے مستنبط ہوتی ہے' نیز اکثر حضرات کے میلان خاطر کا لحاظ کرتے ہوئے' جو کہ بعض احادیث قدسیہ کے موافق افضلیت کی ایک دلیل ہے' صحابہؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت امیر رضی اللہ عنہ پر ترجیح دی۔ یہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد

کے معنی معلوم ہوجاتے ہیں جو حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو خطاب کرکے فرمایا تھا کہ:

إن قمصك الله قميصا فلا تخلعه.

(مشکوۃ ص ۵۶۲۔ بروایت ترمذی عن عائشہؓ بلفظ متقارب)

"اگر اللہ تعالیٰ تمہیں قمیص پہنائیں تو اس کو اتارنا نہیں۔"

اور اس "قمیص پہنانے" کو حق تعالیٰ شانہ کی جانب منسوب کرنے کی وجہ بھی معلوم ہوئی' کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کا پہنچنا محض عطائے خداوندی ہے' جو بغیر خیال و گمان کے پہنچی۔ باقی خلفائے ثلثہ کی خلافتوں کی طرح کمال مخصوص کا اس میں دخل نہیں' اور جو نعمت کہ کسی سابقہ عمل و کمال کے بغیر پہنچے دستور یہ ہے کہ اسے حق تعالیٰ شانہ کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں' اور کہا کرتے ہیں کہ یہ عطیۂ خداوندی ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو خلیفہ مقرر کیا اس کی کیا وجہ تھی؟ اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد کسی کو مقرر نہیں کیا اس کا کیا سبب تھا؟ اور ارشاد نبوی **ولا اراکم فاعلین** کے معنی بھی اس واقعہ پر خوب منطبق ہوگئے۔ اس لئے کہ پہلی دو بار میں تو خلیفہ اول و ثانی کے استحقاق میں کسی کو کلام نہیں تھا کہ خلافت نبوت کی ضروریات میں خود یکتائے زمانہ تھے' اور ان کمالات کے سبب' جو ان کی خلافت کے مناسب تھے' کوئی شخص ان کے ہم سنگ نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر خلیفہ ثانی کی وفات کے بعد' خصوصاً جبکہ امر خلافت حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان دائر ہوا' ان دونوں اکابر میں ہر ایک کے تقرر کا احتمال تھا' اور یہ دونوں بزرگ بظاہر ایک دوسرے کے ہم سنگ تھے' اگر دونوں کے درمیان فرق بھی تھا تو اس قدر خفی تھا کہ اکابر صحابہؓ بھی' باوجود اس قدر فہم و فراست کے' دیر کے بعد اسے سمجھے' جیسا کہ معلوم ہے۔

پس گویا خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچ کر واپس لوٹ گئی۔

۲۹۔ نیز متذکرہ بالا دو کمالات کی رعایت خلیفہ اول و ثانی کے استخلاف سے عمل میں آچکی تھی' اور اس سے فراغت ہو چکی تھی' اب صرف کمال مرتضوی کی رعایت باقی تھی' تاکہ اول و ثانی کے کمال کی رعایت سے مل کر تمثال نبوت محمدی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام) کا نقش ظہور پذیر ہو' مگر چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حیا میں سب سے زیادہ قدم راسخ رکھتے تھے' اور حیا کی نیرنگیوں میں سے یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ایک کمزور آدمی سے بڑے بڑے کام ایسی چستی و چالاکی سے ظہور میں آتے ہیں کہ مرد قوی ہمت بھی ان پر رشک کرتا ہے۔ اس جہت سے کمالات عثمانی' کمالات فاروقی کے ساتھ ملحق ہو گئے تھے' اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تقرر بمنزلہ جبر نقصان و تکمیل ناتمام ہوا' یہ نہیں کہ ان کی خلافت باقی تین خلافتوں کی طرح جداگانہ شان رکھتی ہو' پس اس جہت سے' نیز اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ غضب اور حیا' ہمت کے عظیم ترین مددگار ہیں' حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں اگرچہ غضب فی اللہ بدرجہ کمال تھا' مگر حیا میں سبقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے' لہٰذا اگر ان کی خلافت کو خلافتِ فاروقی کا تتمہ قرار دیا جائے تو بالکل بجا ہو گا۔

۳۰۔ حدیث مذکور میں حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا ذکر نہ آنے کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا جو خدشہ بعض سنّیوں کے اوہام کو لاحق ہو سکتا تھا اس مقام میں اس خدشہ سے بھی سینہ پاک ہو گیا' اور تین حضرات کو بطور خاص ذکر کرنے اور حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے ذکر کو ترک کرنے کا خلجان بھی رفع ہو گیا۔ اگرچہ یہ خلجان پہلے بھی بحکم مقدمۂ رابعہ مرتفع تھا۔ وجہ اس کی' جیسا کہ پہلے گزرا' یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کمالات نبوت میں سے ان کے کسی ایسے کمال پر مبنی نہیں

تھی جو زمانہ کے مناسب حال ہو' بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے افضل تھے' اور کمال حیا کے سبب ان کی قوت عزیمت فی الجملہ قوت ہمت فاروقی کے ساتھ مستلحق تھی' اس بنا پر وہ دیگر اقران و امثال سے مقدم ہو گئے تھے' پھر خلافت کے بعد جو کارنامے ان سے ظہور پذیر ہوئے ان کے ملاحظہ سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جیسی امید تھی واقعی انہوں نے بلادِ فارس اور اطراف شام میں جھاڑو دے کر نامور سرکشوں کے خس و خاشاک سے ان علاقوں کو پاک کر دیا۔

۱۳۱۔ الغرض جب حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے جفاکاروں کے ہاتھ سے شربتِ شہادت نوش فرمایا تو کہنا چاہئے کہ قلوب کی سرزمین میں گمراہی کا بیج بو کر اس کی آبیاری کر دی گئی' اور بدعات کے برگ و بار کے ظہور کا وقت قریب آپہنچا' اگر یقین نہ آئے تو روافض کے پیدا ہونے اور نواصب کے ظاہر ہونے کے منشا کی تفتیش کرو کہ کیا تھا؟ یہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل نکلے گا' جیسا کہ اپنی جگہ مذکور ہے۔ اس وقت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا' جو ہادی و مہدی تھے' مسند خلافت پر بیٹھنا عین موزوں وقت پر تھا۔ مگر جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے ان کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کئے تھے اور اس گناہ سے اپنا منہ کالا کیا تھا' جب انہوں نے دیکھا کہ تمام صحابہؓ اس واقعہ ہائلہ کے رونما ہونے سے نہایت حسرت اور غیظ و غضب میں ہیں تو انہیں اپنی جان کی فکر ہوئی' اور انہوں نے دامن مرتضویؓ کے زیر سایہ پناہ لی۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بلوائے عام کی وجہ سے قاتل و غیر قاتل کی شناخت نہیں کر سکتے تھے' جبکہ حدود کے جاری کرنے اور قصاص لینے میں ثبوت کامل درکار ہے۔ نیز ان شورہ پشتوں کے ہاتھ سے ابھی ایک دیرینہ خلافت درہم برہم ہو چکی تھی تو یہ خلافت' جسے ابھی قرار و استوار میسر نہیں آیا تھا' اس کا درہم برہم کر دینا کیا دشوار تھا؟ ان وجوہ سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اخذ قصاص میں تامل فرمایا' جو حضرات حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے وابستہ اور ان کے طرف دار تھے' انہوں نے اس رنج و صدمہ عظیم میں کچھ نہ سوچا' اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں قاتلین عثمانؓ سے مداہنت اور نرمی برتنے کا گمان کیا' اور جنگ و جدال کے درپے ہوئے۔ اس کی وجہ سے بہت سا غبار ایک دوسرے کے دل پر بیٹھ گیا' اور بہت سے فتنے اٹھے' اور ہوا جو ہوا' یہاں تک کہ کفار سے جہاد اور فتح بلدان کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور غنیمتوں کے آنے کا راستہ بند ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے عنوان میں امانت کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس وقت **ولا اراکم فاعلین** کا مضمون پوری طرح منطبق ہوا' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار افسوس' جو **ولا اراکم فاعلین** کے مضمون سے ٹپکتا ہے' اس کی وجہ ظاہر ہو گئی' اور معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا افسوس اگر ہے تو اس وجہ سے ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ جیسے ہادی و مہدی تھے' افسوس ہے کہ انہیں امت کی ہدایت اور بدعات کے مادہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی فرصت میسر نہ آئی' اور آپس کی چپقلش کے سبب عنان ہمت دوسری طرف مڑ گئی' بلکہ بانیان فساد کو اس باہمی انتشار و نزاع میں فرصت ہاتھ لگ گئی' جسے انہوں نے بسا غنیمت سمجھا۔ گویا ان کی آتش بے نور پر غیب سے تیل چھڑک دیا گیا' ورنہ عبداللہ بن سبا کا گروہ اور دیگر اہل بدعت' حروراء کے خارجیوں کی طرح آب تیغ مرتضویؓ سے آتش دوزخ کا ایندھن ہو جاتے' اور قدریہ کو اپنے اقوال باطلہ کے ساتھ لب کشائی کی قدرت میسر نہ آتی۔

۳۲۔ مگر حضرت حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور حضرات صحابہؓ کی جانفشانیاں اور ان کا اخلاص و انقیاد ایسی چیز نہیں کہ ایک دو خطائے اجتہادی یا تعصب قومیت۔ علی اختلاف الاراء........ کی بناء پر سب کو نظر

انداز کردیا جائے' اور ان حضرات سے جو پختہ وعدے ہوچکے ہیں۔ مثلاً (حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے):

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ (آل عمران: ۳۱)

ترجمہ۔ "آپ فرمادیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے۔"

اور (حدیث قدسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے):

ومن لقيني بقراب الأرض خطيئةً لا يشرك بي شيئًا لقيته بمثلها مغفرة. (مشكوٰة، ص١٩٦)

"جو شخص مجھ سے ملے (یعنی مرنے کے بعد) زمین کی بھرتی کے مطابق گناہ لے کر' بشرطیکہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو' میں اس سے ملوں گا اسی کی مثل مغفرت لے کر۔"

یہ حدیث مشکوٰۃ شریف باب ذکر اللہ عزوجل میں صحیح مسلم سے نقل کی ہے (مشکوٰۃ ص۱۹۶)

الغرض ہمارے لئے کسی طرح روا نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کئے گئے جو وعدے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ان تمام وعدوں کو فراموش کرڈالیں' بلکہ حق تعالیٰ شانہ کی رحمت واسعہ کہ امت نبوی ؐ کے تمام صغائر و کبائر اس کے ایک گوشہ میں سماتے ہیں' اس کی قدر شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ حسب وعدہ:

﴿أُولَـٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾. (الفرقان:۷۰)

"تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا۔"

اگر بالفرض ان اکابر سے دیدہ و دانستہ کبائر بھی سرزد ہوئے ہوں تو دفتر حسنات میں لکھے جائیں' اس بنا پر حکمت لم یزل نے ان واقعات کو رونما فرمایا' کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قدر و منزلت اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف و مرتبہ کا سب کے سامنے اظہار کرنا اور بے ادبوں کو ان کے ٹھکانے پہنچانا اسی پر موقوف تھا۔

وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین،

بعد ازیں گزارش ہے کہ بسبب کم فرصتی و قلت استعداد اور کتابوں کے ساتھ اشتغال نہ ہونے کی وجہ سے امر سامی کی تعمیل میں تاخیر ہوئی' وقت بے وقت کبھی ایک دو گھڑی کی فرصت میسر آئی تو کاغذ سیاہ کرتا رہا' دیر کے بعد جو نوبت یہاں تک پہنچی تو اپنی تقریر پریشان و خامی بیان سے یوں سمجھتا ہوں کہ نظر گرامی میں بے مغز دکھائی دے گی' اور جناب کے فہم رسا کی میزان میں کم وزن ثابت ہوگی۔ مگر ہر شخص اپنے اندازے کے مطابق بات کیا کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں اس کام کا آدمی نہیں ہوں' اس لئے معذور ہوں۔ باقی بخدمت عنایت فرمائے من مولوی عبدالقادر سلام مسنون قبول ہو۔

○ ○ ○

الحمدللہ کہ آج بتاریخ ۴/ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ کو ترجمہ کی تکمیل ہوئی۔ والحمدللہ اولاً و آخراً۔

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون' وسلام علی المرسلین' والحمدللہ رب العالمین۔

محمد یوسف عفی عنہ لدھیانوی

اِنتباہ المؤمنین

تالیف

حجۃ الاسلام حضرۃ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدائے را کہ زبان داد وبیان داد، ورسولے را کہ قرآن رسانید وایمان رسانید، میخواہم کہ بستایش گوناگون در ستایم ولیکن نیا رستم ستود، ونتوانم لب اظہار کشود، کہ زبان بے خود جنبان وبیان آشفتہ سامان وایمان از دست این وآن رو بہ قفا نگران - بااین ہمہ آفرین برمن وبر آئین من کہ دین من ہم ستایش وسپاس است، واستواری بندگی بلا وسواس، لیکن عنان گسستگی ہائے نفس آشفتہ سامان در انفعال نارسائی نخچیر پامالی انکسار ست، وزبان برخود لرزان از انحداد ہرزہ درائی بادکوب نانہجار، ناچار ازین وادی پر آفت کہ در ہر مرحلہ لا احصی ثناء علیک نشان بی نشان منزل ست، وازیں صحرائے ہمہ وحشت کہ سر ہرگام ادراک العجز درک دامن کش بوستگی محمل ست، گستہ بمدعائے کہ وابستہ لب اظہار ست در پیوستہ باظہار میگراید، وگرہ ناخن حل رہا می کشاید، کہ شخصی از گروہ غوایت شکوہ شیعہ اعتراضاً معنی حدیث نبوی مصطفوی کہ از مشکوۃ شریف از فصل ثالث باب مناقب العشرہؓ منقول میشود:

عن علی رضی اللہ تعالی عنه قال قیل یا رسول اللہ!
من نؤمر بعدك؟ قال إن تؤمروا أبا بكر تجدوه أمينا

زاهدا فى الدنيا راغبا فى الآخرة، وإن تؤمروا عمر تجدوه قويا أمينا لا يخاف فى الله لومة لائم، وإن تؤمروا عليا -ولا أراكم فاعلين- تجدوه هاديا مهديا يأخذ بكم الطريق المستقيم. (رواه أحمد)

از معارف آگاہ حقیقت انتباہ قدسی نفس جناب مولوی الٰہی بخش دام فیوضہ استفسار نمود ومولوی صاحب ممدوح پیش گاہ تقدس پناہ آب گوہر تنزیہ رنگ جوہر تشبیہ کحل البصر حقیقت نور نظر طریقت مرکز معقول ومنقول مدار فروع واصول حامی طریق حنفیہ ماحی بدعات ردیہ مولانا وبالفضل اولانا مخدومنا مکرمنا جناب ملائک ماب فرشتہ شیم مولوی محمد قاسم صاحب مد ظلہ المبین الی یوم الدین بذریعہ مکتوب مسرت اسلوب فرستادہ استطلاع اصل کار فرمود، مولانا صاحب ممدوح الصدر بہ بسط انبساط وبشرح انشراح کما ہی از موارد مواقع حدیث شریف در سلک تحریر کشیدہ آویزہ گوش حقیقت نیوش شان گردانید باکناف واطراف وعالم خوبی وخوش اسلوبی بیان سامی دست بدست رسانید، لاجرم این خاکسار پریشان روزگار آشفتہ سامان بندہ حبیب الرحمٰن بفرمایش عزیز از جان مولوی عبد الرحمٰن ولد سعید مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری القرشی الحنفی بانطباع گرائید، ورہنمائے گمراہان وادی ضلالت را دلیل مثوبات اخروی گردید، وآن این است :

الحمدلله رب العالمين، والصلوٰة والسلام علی رسوله
سیدنا محمد وآله وصحبه أجمعين.

۱- پس ازیں بندہ کمترین بندگان گمنام محمد قاسم نام بوالا خدمت مخدومی مطاعی مولوی الٰہی بخش صاحب دام فیوضہ سلام مسنون عرض کردہ امید وار قبول ست، وپس ازیں عرض می نماید کہ نامہ والا چہ رسید ایں ناکارہ را بیک منت رہین خود ساختند، وناديدہ نیاز مند خود نمودند، من نمی پنداشتم کہ باین گمنامی نام من باین نمط تا بسمع عالی خواہد رسید، شاید این کار کار بعضے مردم سادہ لوح باشد، ورنہ من کجا وایں عنایات بی پایاں کجا؟ وآنہم بایں مرتبہ کہ بالقاب ہمچو خاتمہ المفسرین وامثالش یا وفرمایند، جناب من مردمی چیزی دیگر است ومردم شناسی چیزے دیگر، صحیح این ست کہ این روایت غلط ست، ہر کہ گفت باندازہ ادراک خود گفت، من ہیچ مداں بیچارہ را یاد بودن مسائل ضروریہ در کنار، عبور ہم براں میسر نیست، تا بحل مشکلات علما چہ رسد؟ اگر سخنے دل نشین بر زبانم رفتہ باشد اتفاقیست ؎

گاہ باشد کہ کودک نادان
بغلط بر ہدف زند تیری

لیکن از امتثال امر سامی ہم چارہ نیست کہ اولین عنایت سامی از حد قدر من افزود، ناچار ہرچہ ہستم بنام خدائے کریم قلم گرفتہ آنچہ کہ ذہن نارسا من باں می رسد بریں صفحہ رقم زدہ بخدمت

می رسانم، مگر اول چند امر بطور مقدمہ گزارش می کنم، ہنگام ملاحظہ تقریر اصل مطلب ملحوظ خاطر ملازمان خدمت ماند۔

۲۔ اول: اینکہ طالب حق را ضرور است کہ معنی مطابقی واصل مدلول نصوص را مستند خود گرداند، وآنچہ کہ باعتبار بعضی اطلاقات عرف از زوائد معانی در ذہن فرد می ریزد بر آں نظر نہ افگند، پس اگر آن کلام محمل چند داشتہ باشد بے دلالت عقل ونقل از خود درپے تعیین محملش نشود کہ این روش اکثر از راہ مستقیم دور می اندازد۔

ہر چند ایں سخن نزد عقل معقول است، اما بر وجوب ملاحظہ ایں امر از نقل ہم اشارہ باید آورد، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم در خطاب پیر زنی بطور مزاح فرمودند **لا تدخل الجنتہ عجوز** اعنی داخل نخواہند شد در جنت پیر زنان آن پیر زن قید زائد از معنی مطابقی از خود افزودہ بر عجوز فی ہذا الوقت محمول کردہ بترسید وپرسید کہ بچہ سبب پیر زنان ازیں نعمت محروم اند؟ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمودند

أما تقرئين القرآن: ﴿إِنَّآ أَنشَأۡنَٰهُنَّ إِنشَآءً فَجَعَلۡنَٰهُنَّ أَبۡكَارًا﴾ (سورة الواقعة: ٣٥ - ٣٦) **(مشکواۃ ص ۴۱۶)**

پس اگر بحقیقت جواب رسالت پناہی علیہ الف الف تحیہ وسلام پے برند ہمیں ست کہ عجوز را نہ فقط یک محمل ست، اعنی عجوز فی ہذا الوقت، آن محمل دیگر ہم دارد، اعنی عجوز وقت الدخول، پس ایں را گرفتن وآنرا

گزاشتن خارج از معنے مطابقی ست' آنچہ می بایست سوال از تعین یکی ازین دو محمل بود' نہ اینکہ زائد از معنی مطابقی یکی را از دل خود مقرر کردن وبروی بناء کار کردن۔

۳۔ دوم : اینکہ اگر در عالم اسباب نیک بہ نگرند در اکثر اسباب ومسببات آنہا نسبت عموم مسبب وخصوص سبب بہ نظر می آید' آرے بعضے اسباب را نسبت مسبب خود خصوصیتے زائد از دیگر وقتل طفل بر وجہ ظلم وفساد کہ در ہمچو صور بہ نسبت قتل اکثری ست فردد آوردند' وحضرت خضر را ظالم شمردند' وہر چہ گفتند گفتند' وبجہت اکثریت ایں سبب بحقیقت الامر پے نبردند' انجام کار چون حقیقت کار معلوم شد معلوم شد کہ حضرت خضر برحق وصواب بودند نہ خطا' وکاریکہ کردند عین احسان وانصاف بود' نہ ظلم وجفا - چون منشاء ایں غلطی عدم رعایت ایں قاعدہ بود' گو بوجہ مستغرق بودن حضرت موسوی در تجلیات ربانی ومحویت در اسباب می باشد کہ بجہت آن اکثر تحقق آن مسبب بدان می شود' ایں وجہ اکثر رہ مثبتان علت از معلول وسبب از مسبب وملزوم از لازم میزند' وبغلط می اندازد' وہمیں است کہ تا مساوات علت ومعلول بہ تحقیق نرسد استدلال انی ناتمام است' ورفع مقدم منتج رفع تالی ووضع تالی منتج وضع مقدم نمی شود' چون در علم طب اکثر از مسبب بسبب واز اثر بہ موثر پے برند قدر شناسان علوم آں را از ظنیات شمردند۔

۴ ۔ واین کلیہ نہ فقط نزد اہل معقول معقول ست در منقول ہم معمول بہ است' کلام ربانی وکلام نبویؐ ہر دو تصدیق او می

کنند، تصویب حضرت خضر علیه السلام، کہ از سیاق قصہ اوشاں وقت مصاحبت حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلاۃ والسلام می برآید، شاہد بریں کافی ست۔

بیان ایں اجمال اینکہ انکار حضرت موسیٰ بر خضر علیہما السلام در واقعہ شکستن کشتی وقتل طفل وفرمودن او شان حضرت خضر علیہ السلام را لقد جئت شیئا امرا۔ ولقد جئت شیئا نکرا" محض بہ ہمیں وجہ است کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام در بادی النظر شکستن کشتی صفت ازالہ منکرات وغلبہ بغض للہ باشد، التزام ایں امر ہر متدل را لازم افتاد۔

۵ ۔ ومعنی ظنوا المومنین خیرا" نیز بظن ایں ہیچ مدان ہمیں ست کہ اگر از مومنان کہ قرائن احوال شان شاہد ایمان شان باشند، وباز بظاہر امر نامناسب ازوشان سر برزند، فقط بر اسباب معروفہ او حمل نباید کرد، محتمل کہ آں را سبب دیگر غیر معروف باشد کہ نظر بان معروف بود، نہ منکر۔ ورنہ در کار خیر حاجت امر ظن خیر نبود کہ ایں خود مقتضائے طبائع بشری است۔

۶ ۔ وجملہ الا شققت قلبہ در حدیث (صحیح مسلم ص۶۸ ج۱) محتوی قصہ قتل کردن بعضے اصحاب کرام متلفظان کلمہ اسلام را ہنگام التحام حرب بگمان اینکہ ایں اقرار بظاہر از خوف جانست، نہ از وجہ ایمان، دلیل کامل ست بریں دعویٰ کہ مسبب تیرا سبب را بہ یکی ازان قرار دادن ازاں باز کارہائے مناسب آں کردن سخت نازیبا ست۔

۷ ـ سوم: آنکه انبیاء واولیاء از محبت اولاد واقارب ودیگر هواء نفسانی محض معرا نباشند، که این موجب بسیارے از نقصانات دین ودنیاست، هرچند این سخن بظاهر بغایت گرانست که مرادف محبت دنیا واهل دنیا بنظر می آید، واقوال بسیارے از اکابر اولیاء مشعر خلاف این ست، ونمی پندارم که احدی در اول وہلہ اش بہ پذیرد، ونسبت شان معترف محبت دنیا واهل دنیا شود، اما اگر نظر بر حقیقت اش افگند امید از ارباب فهم آنست که بے دریغ اش علی الراس والعین نهند، تفصیل این اجمال وتوضیح این مقال باندازه وقت وذهن نارسائے خود کرده تتمیم وتکمیل اش بذمہ ذهن ثاقب سامی میگزارم۔

۸ ـ پس محقق باد که تحقق جمیلہ صبر را که سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نیز مامور بان اند چنانچہ فقدان نعمت ضرورست، چنانکہ همہ میدانند، وجدان محبت نعمت ورغبت بدان ضرور ترست، چہ ترکیب بلاکہ از ضروریات صبرست از همیں دو عنصرست، ورنہ اگر نفس فقدان را اعتبار کنند ابوجهل در مقام صبر بیشتر از سید الصابرین سرور مرسلین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین بود، ونمرود وفرعون از حضرت ابراهیم و حضرت موسیٰ علیهما وعلی نبینا الصلاۃ والسلام درین راه گوئے سبقت ربوده باشند، چہ اگر این انبیاء کرام علیهم الصلاۃ والسلام را از اکثر نعمائے دنیوی محروم داشتند قدری عطا فرموده اند، مگر آں اشقیارا ازالائے اخروی وفضائل نبوی حبہ هم نرسید، وظاهرست که دنیا بتامها چہ قدر دارد در پهلوئے یک ذره از نعمائے آخرت؟ نسبت یک ذره پیش زمین

وآسمان ہم ندارد' پس اگر صبر ہمیں ست کہ نعمت نباشد صبر انبیاء وایں ہمہ جانفشانی ہائے شان بہ صبر آں اشقیا نخواہد رسید' وہو باطل کما ہو ظاہر' وچون تحقق صبر بر محبت نعمائے مفقودہ قرار گرفت لاجرم ازدیاد صبر بر ازدیاد محبت مبنی خواہد بود' ورنہ بسیار کسان بودہ اند کہ مدت العمر بے سروسامان بظاہر مبتلا بایذا ہائے فراوان بسر کردند' بہ گمان ما نمی آید کہ صبر شان ہم سنگ صبر انبیاء بود' وازیں جا تفسیر ما اوذی نبی ما اوذیت (کنز العمال حدیث ۵۸۱۷) باید دریافت۔

۹ ۔ پس محبت مذکورہ در قلوب کاملین بوجہ اکمل باشد' اما محبت خدا کہ در جہت ومقتضائے خود معارض آنست قلوب شان را چنان از زیر وبالا در گرفتہ کہ محبت دیگر آنرا بہ نہجے جائے ظہور نماندہ تاکار خود بکند' ہمچو محبت برادر کہ زیر محبت فرزند مختفی میشود' محبت دنیا واہل دنیا ہم زیر دامن محبت خداوندی روئے خود میکشد' وتزکیہ وتصفیہ در حقیقت عبارت از ہمیں محویت اول ست در ثانی۔ وآنچہ کہ اقوال اکابر اولیا از زوال وانقطاع محبت دنیا از قلوب محبان خداوندی خبر میدہد مراد شان ہمیں ست' واللہ اعلم' نہ آنکہ مرد مجاہد محبت غیر وہم چنیں دیگر رذائل را کہ در حقیقت از ہمیں میزائید از بیخ دین بر می کند' کہ این از قبیل انفکاک ذاتیات یا لوازم آنست ۔ مع ہذا اولاً جناب باری تعالی می فرماید لا تبدیل لخلق اللہ۔

(الروم:۳۰)

وثانیاً حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد می فرمایند:

إذا سمعتم بجبل زال عن مکانه فصدقوه، وإذا سمعتم برجل تغیر عن خلقه فلا تصدقوه فإنه یصیر إلی ما جبل علیه. (مشکواۃ ص ۲۴)

وطبعی بودن محبت اقارب ورغبت نعمائے؟ چناں ظاہر ست کہ در پے اثبات او شدن فقط عبارت در از کردنست، مگر چون محبت خداوندی ومحبت اغیار باہم متعارض ومتنافی اند وقتیکہ غلبہ وشدت محبت حق قدرے فرو خواہد شد لاجرم محبت اغیار راہمان قدر ظہور خواہد بود، واین خود معروف ومعلوم است کہ ہیجان محبت از ہر قسم کہ باشد ہردم بیک وتیرہ نمی ماند، وقتی بجوش می آید واز محبت غیر بظاہر نامے ونشانے نمی گزارد، چنانکہ فرمودہ اند:

لی مع الله وقت لا یسعنی فیه ملك مقرب ولا نبی مرسل. (موضوعات کبیر ص ۱۰۲)

وزمانی آتش او فرو می نشیند ومحبت دیگران را فرصت سر برآوردن می دہد، در چنیں اوقات شدہ باشد آنچہ کہ در حق سبط اکبر رضی اللہ عنہ صد دریافت:

اللهم إنی أحبه فأحبه.

(مشکواۃ ص ۵۶۸)

وہم چنیں دیگر قصہ ہائے مشعر محبت حسنین ومعاملہ ہائے محبت

حضرت حمیراء رضی اللہ عنہم اجمعین

۱۰ ۔ القصہ بہ نظر قاصر این شکستہ خاطر چنان می آید کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم را باقارب خود محبت از ہمہ بیش بود چنانچہ

کل نسب وصهر وينقطع يوم القيامة إلا نسبي وصهري.

(در منشور ص۱۵ ج ۵' کنز العمال حدیث ۳۱۹۱۵)

نیز ازیں خبر میدہد' اعنی ربط محبت وعلاقہ یگانگت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم باقارب خود چنان محکم و مستحکم ست کہ از صدمہ شدت ہول چنین روز کہ ہمہ ہمہ را فراموش خواہند کرد واقارب بیگانہ وار از اقارب رو خواہند تافت نخواہد شکست' پس لاجرم کہ وبیگاہ اثرے از آثار او ہویدا شود' کہ گفتہ اند الشی اذا ثبت ثبت بلوازمہ' گو غلبۂ محبت خداوندی از اندازہ مقتضائے خود پا بیرون نہادن ندہد۔

۱۱ ۔ چہارم اینکہ عدم اخبار از شی اخبار عدم آن شی نمی باشد کما ہو ظاہر آیت ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾. (بنی اسرائیل:۳۶) موید این ست

۱۲ ۔ اکنون معروض باد کہ نفی در لا اراکم فاعلین محول ست از مفعول ثانی بسوئے فعل اری کہ از افعال قلوبست' چہ بظاہر ازین کلام اخبار عدم فعل ست بطور انکشاف' نہ جزم عدم انکشاف فعل' ورنہ دامن نسیان را از کشمکش شیعہ وداروگیر مقتدیان عبد اللہ بن سبا کہ دریں محل می تواند شد چہ باک؟ زیراکہ برین توجیہ

جملہ لا اراکم الخ ماخذ تعریض بجانب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم شدن نمی تواند' یکی از دلائل تعین مراد آنست کہ جناب سامی ہم ہمیں را مسلم داشتہ اند' ورنہ حاجت ایمائے سامی بتحریر مراد او چہ؟

۱۳ - واین تحویل و قلب فقط تراشیدہ من نیست' در مواقع کثیرہ از کلام ربانی واحادیث نبوی علی مصدرہا الصلاۃ والسلام باعتراف ہمہ ارباب فہم واقع ست' یک یک جملہ از کلام خدا وکلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کہ بر جواز تحویل واستعمال قلب دلالت دارند بطور نمونہ عرض میکنم' در لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ(المنافقون: ۹) نہی از مخاطبین بجانب اموال محول ست' مقصود این است **لا تلهوا باموالكم ولا اولادكم عن ذكر الله** ودر حدیث ست إنكم معروضون على أعمالكم(مشکوٰۃ ص۴۴۵) وبظاہر مراد ایں ست **ان اعمالكم معروضة عليكم**' غایت ما فی الباب ایں جا تحویل چیز دیگر ست' وآنجا تحویل چیز دیگر' لیکن درین تحویل سوائے تاکید نسبت عدم فعل کہ عدم رویت فعل از نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ نظر شان واسع ترین نظرہا است' وہمچو وقائع آیندہ را محیط ست' دلیل آنست' وبسبب آں تحویل گویا از قبیل قضایا قیاساتہا معہا گشت' اشارہ لطیف ست بجواب کسا لیکہ جملہ لا اراکم را در معرض تعریض بجانب صحابہ کرام کشیدہ متمسک سوء عقیدہ ودلیل صدور ظلم وتعدی ازو شان بر حضرت علی رضی اللہ عنہ در بارہ خلافت قرار دادہ اند۔

۱۴ - توضیح این مقال اینکہ عدم رویت فعل از رویت عدم فعل

عام ست، در صورت عدم عدم فعل که در حقیقت فعل ست هم می
تواند که عدم رویت فعل باشد، پس اگر این جمله را بر اصل خود
گزارند واعتبار تحویل نکنند مثبتان ظلم صحابه را این جمله حجت
شدن نمی تواند، پس بادائی مقصود معلوم بدین پیرایه که معروض شد
گویا دشمنان صحابه را بخیال دیگر ا گمندند، تا دست بی ادبان سوئے
دامن پاک شان دراز نشود، اما آنانکه فهم سلیم وطبع مستقیم دارند
خود میدانند که معنی مطابقی این کلام ازین بیش نیست که من
شمار می ہینم که حضرت علی مرتضیٰ رضی الله تعالیٰ عنه را امیر
نخواهید ساخت، اما اینکه از کمالات وفضائل شان چشم پوشیده
بتقاضائے ہوائے نفسانی دیده ودانسته از جناب شان اعراض
خواهید کرد، من گمان ندارم که اصحاب فهم مدعی دلالت ایں جمله
برآن شوند، مع ہذا بیعت امیر نکردن شان فقط در کینه وعناد منحصر
نیست تا بدلالت عقلی ثابت می شد ۔ آرے ایں جمله ایں را هم
محتمل ست، ومحمل دیگر نیز دارد، اعنی اشاره به مضمون
ويأبى الله والمؤمنون إلا أبا بكر. (ابوداوٗد ص۶۴۱) مگر محتمل اول
احتمال بیش نیست وثانی را مدد از نقل مذکور وهم دیگر نصوص بهم
رسیده، وملاحظه مناقب صحابه عقل نیز در تائید این ست، پس حیف
ست که بے دلیل بر احتمال بچسپند، واز قرائن داله بر مراد دیده
ودانسته چشم پوشند۔

۱۵ ۔ مگر شاید کسے را دریں مقام وسوسه دیگر بدل آید، وگوید که
این چنین کلام بشهادت وجدان در مقام تحسر وتمنا سر می زند پس
دیده انصاف باید کشاد، وباید دید که تحسر نبوی وآرزوی شان کلام

را بکدام محمل می افگند' وسیاق را بکه جانب می کشد؟ می گویم که اول شہادت وجدان غیر مسلم' ممکن ست کہ مطلق اخبار بالغیب بے اقتران حسرت وافسوس مد نظر باشد' واگر بپاس خاطر شیعہ پذیرا کنیم واز احتمال تبلیت ایں مقال بہ نسبت انکشاف اولویت ابی بکر رضی اللہ عنہ ہم در گزریم' تاہم برآمدن مطلب شان ازین جملہ معلوم چہ ہرگاہ انبیاء را از مقتضیات بشری چنانکہ مذکور شد ناگزیر ست' اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمنائے خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ داشتہ باشند کدام محذوری ست کہ اہل سنت وجماعت در فکر اعتزار او جگر خون کنند

۱۶ - واگر با ایں قدر سینہ ازین وسوسہ پاک نشود اینکہ روایت نیز موجود ست' فی تاریخ الخلفاء لجلال الدین السیوطی فی فصل الاحادیث والایات المشیرۃ الی خلافۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ قال:

أخرج الدار قطني في الأفراد والخطيب وابن عساكر عن علي رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ سألت الله أن يقدمك ثلاثا فأبى علي إلا تقديم أبي بكر رضي الله تعالى عنه. (تاریخ الخلفاء ص ۶۴)

وسلمنا کہ بسبب سنی بودن مخرجان این حدیث تسکین شیعہ نشود مگر درین چہ خواہند گفت کہ وقت ارادہ نکاح حضرت امیر رضی اللہ عنہ بدختر ابی جہل بر دل انور حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم چہ قلقہا کہ نگذشت' آخر این ہمہ بے تابی ہا از چہ بود؟ جز ایں کہ محبت حضرت زہراؓ نوبت باین رسانید دیگر چہ

می توانند گفت آرے اگر دختر ابی جہل از محرمات بودی این اہتمام منع وخطبہ خواندن بر مقتضائے نبوت منطبق می گشت' سیاق این قصہ را در حدیث بہ نگرند معلوم خواہد شد کہ این رنج والم محض بر اقتضاء محبت حضرت زہرا بود رضی اللہ عنہا ورنہ این مقال را چہ محل بود کہ من حلال را حرام نمی کنم۔

۱۷ ۔ القصہ عجب نیست کہ درین واقعہ ہم کم وبیش بمقتضائے طبیعت بشری ومحبت نسبتی میلان خاطر انور بجانب حضرت امیر رضی اللہ عنہ باشد' مگر دختر ابوجہل استحقاق زوجیت حضرت امیر نداشت' واین انعقاد از ضروریات شرع نبود' کہ بپاس آں رنج خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کہ واقعی رنج خویشتن ست گوارا میشد' واز خوبی مواسات اقارب وصلہ رحمی نظر برکندہ درین بارہ اہتمام نمی فرمودند' بخلاف این واقعہ کہ بجہت سوابق کمالات ابوبکر رضی اللہ عنہ ونظر بجانفشانی ہائے شان از اول تا آخر' کہ شیعہ ہم میدانند گو تجاہل کنند' لازم افتاد کہ از تقاضائے محبت طبعی برکران روند' وحق را بحق دار رسانند چنانچہ در اوقات مناسبہ درین بارہ بطورے اشارتہا فرمودند کہ آنانکہ مشق فہم سخن دارند دلالت نصوص را ہم بدل آن نمی گیرند مگر دیدہ کور را آفتاب ہم سیاہ نماید' وشم مزکوم را گلاب تیز زیادہ تر رباید۔

۱۸ ۔ بالجملہ از جملہ ولا اراکم فاطلین میلان خاطر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فہمیدن وباز از رجحان طبیعت ومیلان خاطر نبوی علیہ وعلی آلہ الف الف تحیہ وسلام باستحقاق حضرت علی رضی اللہ عنہ پے بردن' وامیر نکردن صحابہ ایشان را بسبب کینہ وفساد وظلم

وعناد شمردن کار کسانی ست که ازین فرقہا خبر ندارند' نہ اوشان را بر معنی ومدلول مطابقی نظر ست' ونہ از عموم وخصوص مسبب وسبب خبر' با ایں ہمہ جملہ مقتضیات طبعی انبیا را مطابق احکام الہی انگاشتہ' انچہ ناگفتی ست میگویند ۔ روش معانی سخان اہل انصاف ایں ست کہ اول نظر بر اصل مدلول ایں کلام اندازند باز بر عموم مسبب نظر دارند' پس ازیں انبیاء را بشر اعتقاد کردہ در معنی این جملہ غور بکار برند' آنگاہ اگر ازین کلام طعنہ بمذہب سنیان برآید غوغائی شیعہ باستناد این حدیث البتہ خیلے بجا باشد۔

۱۹ ۔ این ہمہ در صورتے ست کہ از بعدیت در "من تومر بعدک" بعدیت متصلہ گیرند' واز رویت رویت انکشافی ۔ واگر از رویت رویت استدلالی مراد وارند حاجت جواب یکسو' در ورود اعتراض ہم کلام ست چہ رہ استدلال پیچ در پیچ ست' وقوع خطا ممکن ست اگر چہ از نبی باشد خصوصاً نزد شیعہ کہ خدائے شان ہم خطا می کند تا آنکہ بدا واقع میشود تا بانبیا چہ رسد قصہ رہا کردن اساری بدر مشہور ست استدلالات دیگر را ہم براں قیاس باید کرد اندرین صورت خود امیر شدن حضرت امیر دلالت براں دارد واگر بعدیت مطلقہ مراد باشد ثبوت تعریض معلوم معلوم' البتہ فکر جواب این امر لازم خواہد آمد کہ پس از شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بے ساختہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ را امیر کردند' واز لزوم کذب قول سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیچ نہ اندیشیدند۔

۲۰ ۔ مگر حق ایں ست کہ مراد از رؤیت رؤیت انکشافی ست'

وبعدیت در "من نومر بعدک" بعدیت مطلقه ومد نظر از سوال از
تعین اشخاص ست نه اوصاف' واگر بعدیت را .شهادت عرف
ولحاظ اینکه سوال از تعین جمله خلفاء الی یوم القیامه نبود منحصر بر
بعدیت متصله دارند' تاهم جواب مطلق ست' وخوبی اطلاق جواب
با وجود تقید سوال اگرچه در دیده تنگ چشمان بے بصیرت نیاید'
وگویند سوال دیگر جواب دیگر مع ہذا از جمله خلفاء که تا روز
قیامت خواهند بود خبر ندادند' فقط احوال اصحاب ثلاثه مذکوره ذکر
کرده بظاہر بطور تحییر اشاره باستخلاف یکی ازیں بزرگواران فرموده
اند' مگر از بلغا باید پرسید که دریں مخالفت اطلاق و تقیید وبیان
اوصاف اصحاب ثلاثه کلام را از بلاغت گزرانیده بحد اعجاز
رسانیده اندگو من کم فهم را نمی رسد که بدعوی خوبی این کلام
وبیان اشاراتش زبان دراز کنم که تعریف فهم خویشتن ست

مادح خورشید مداح خود ست
که دو چشم روشن ونامر مداست

۲۱ ـ اما سخن بر لب رسیده را برگردانیدن نمی توانم' امید آنست
که برسقم بیانم خنده نزنند' عنایت فرموده بغور به نگرند' که دریں
کلام سراسر اعجاز اول بر طبق **ویسئلونک عن الاهلہ قل هی مواقیت
للناس .... الخ** بتغیر جواب از طرز سوال بر نقص سوال سائل
تنبیه فرمودند' وباز به بیان جمله خلفاء متوجه شدند' مگر چون در
تعین اشخاص او شان کلام بطول می انجامید' ومنفعت قلیل می شد'
بارشاد اوصاف چند بطورے تسکین خاطر سائل کردند که هم جواب
او بر آید' وهم امتیان را تا قیام قیامت در استخلاف خلفاء دستور

العمل بدست ماند - واقعی دریا را بکوزه در آورده و مضمون بزرگ را بکلمه سپرده اند٬ چون شرح این معما به بیان حقیقت خلافت ولوازم نبوت تعلق دارد اول حسب فہم رمزے ازان گزارش می کنم۔

۲۲ - جناب من خلیفه کسی کسی بود که کار او کند٬ پس اگر آن کار منشا کمال وموقوف بر ملکه باشد لا جرم ازاں ہم چیزے کم وبیش نصیب او باشد٬ ورنه مصداق ایں مصرعه بود

ع ایں ره که تو میروی بترکستانست

مگر کلام چون در خلافت نبوت ست٬ ضروریات نبوت را باید شناخت٬ در خلافتش ہماں ملحوظ ماند٬ پس بنظر قاصر ایں شکسته خاطر چناں می آید که نبی را اول ضرور ست که بکمال قرب رسیده٬ وبغایت برگزیده باشد٬ که افسری یک عالم ورہبری بنی نوع بہرکس وناکس نمی دہند٬ اکنوں که جمال قوت نظری وکمال قوت عملی او بامتحان آمد که از کجا بکجا رسیده٬ اسرار احکام وقواعد تدبیر ہدایت باو آموخته سوئے گرفتاران ضلالت روانه می کنند٬ پس اگر به گفته او قیود رسوم گسست اند فبها٬ ورنه ہرکه دست وگریبانش شود بزور ہمت خود زیر وزبر نماید٬ یا جان بازد۔

۲۳ - پس ازیں تقریر سه امر بدست آمدند که جدا جدا بعنوان اصحاب ثلاثه در حدیث مذکور اند٬ اصل ہمه کمال قرب بحدی که نام بعد را گنجایش دخل نماند٬ مگر چوں ایں چنیں قرب باں ذات عالی که در وراء الوراء اوج استغنا ست افتادگان خفیف ہوا وہوس را بے دو شہپر زہد فی الدنیا ورغبت فی الاخرة از محالات

ست لازم افتاد که درین دو کمال کمال دارد۔ دو یمیں ہمت قوی وعزم بلند که تا در کار خود از ننگ وناموس ہم که از جان چنانکه دانی عزیز تر ست حسابے نگیرد' وسویمین نگاہداشت حال شان' تا نیک را از بد بشناخته از بد منع فرماید' وبجانب نیک ہدایت نماید' این ست انچه که نبی را ضرورست' وازین جا وجه تخصیص ذکر این اوصاف ثلاثه که نام زد اصحاب ثلاثه کرده اند معلوم شد۔

۲۴ ۔ مگر ایں امور ثلاثه اگر بلحاظ یکے بدیگرے بنگرند چناں در مراتب متفاوت افتاده اند که یکے بدیگرے نمی رسد' توضیح این سر ایں که اصل نبوت ومصداق آں ہمان کمال قرب ست وبس' وہدایت خلائق از آثار ومقتضیات او' وہمت قوی از آلات او' ومع ہذا ہدایت محتاج ضلال واہل ضلال ست' وہمت قوی را درکار خود ضرورت مخالفت مخالفان' ورنه این باکه آویزد؟ وآن باکه ستیزد؟ وکمال قرب را جز ذات ربانی حاجت دیگر نیست' وظاہرست که با آله ہر دم سروکار نیست' وآثار را لزوم ضروری نے' البته از اصل ومصداق ہر لحظه ناگزیر ست' ونیز ہدایت را روسوئے غیرست' وقوت ہمت را رو بہر دو سوست' که از علوم ومعارف مقام قرب فرمان می پذیرد' وازان باز قوت عاقله وعامله را بکار ہدایت می گیرد' چوں ایں چنیں ست' اول اول ست' وثانی ثانی' وہم چنیں۔ پس اگر یکے را ازیں اوصاف ثلاثه چناں قدم پیش رود که دیگران بگرد او نرسند اگر اول است علی الاطلاق استحقاق او از ہمه بیش خواہد بود' ورنه باید دید' اگر مہمات عظیمه پیش رو آمده اند' امانت خلافت بصاحب ہمت بلند قوی دل باید

سپرد' واگر حوادث ضلال وشیوع بدعات در دین قویم رخنہ اندازد' ویا اندیشہ آن بدل خلد از جائے ہادی ومہدی را باید آورد کہ ہر کارے ہر مردے۔

۲۵ - اکنوں باید شنید کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اول بطوری کہ مذکور شد قاعدہ استخلاف ضبط فرمودند' ازاں باز مراتب ہریک ازیں اصحاب ثلاثہ در ضمن بیان اوصاف' چنانکہ معلوم شد' بیان فرمودہ بہ ترتیب ذکری مکرر تاکید فرمودند' وہم اشارہ فرمودند کہ ہریک ازیں اصحاب ثلاثہ را برای کاری ساختہ اند' وبکمالی دیگر بنواختہ' اگر درد طلب ربانی عارض حال شود' وضرورت رہبر این راہ افتد' دست بدامن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باید زد کہ دریں راہ از ہمہ قدم پیش دارد' واگر مہمات عظیمہ ومعاملات بزرگ پیش آیند' وحاجت تربیت عام وخاص افتد' از حضرت فاروق رضی اللہ عنہ التماس اہتمام ایں کار باید کرد' کہ مرد ایں کار است ہمت قوی وعزم مصمم دارد' ودر تنفیذ احکام الٰہی نہ پاس کسی دارد' نہ ہراس۔ از کسے اندیشہ ملامت ندارد' وحق او را واو حق را نمی گزارد۔ واگر ظہور بدع واہواء حق را بہ باطل آمیزد زیر سایہ مرتضوی پناہ باید گرفت' کہ آفتاب ہدایت مطلق را مطلع ومشرق سینہ گنجینہ اسرار او خواہد بود۔

۲۶ - ازیں جا فہم وفراست صحابہؓ باید دریافت کہ بہ ہمچو احادیث نبوی چگونہ نظر غائر انداختند' ودقیقہ فرو نہ گذاشت اند' اعنی پس ازانکہ جاذبہ الٰہی حبیب رب العالمین سید المرسلین علیہ افضل

التسلیمات واکمل التحیات را ازیں دارد نیا بجوار خود کشید' پس ماندگان ہماں بودند کہ بفیوض وجود پر نور حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دل از ماسوی اللہ برکندہ' بجان ودل در طلب حق مصروف بودند' وہردم دم **ھل من مزید** میزدند' مناسب چناں شد کہ بسر داری چنیں کسان کسی باشد کہ از نشیب وفراز ایں راہ آشنا بود' ودوائے ایں دردواند' طریق زہد فی الدنیا ورغبت فی الاخرۃ پامال او بود' تا تربیت شان کند' واصلاح ظاہر وباطن نماید۔ قطع نظراز دیگر نصوص واز افضلیت شان درین بارہ ہم بجانب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ از ہیچو این عبارت اشارہ ہا یافتہ دست بہ بیعت شان دادہ بر سجادہ نبوی نشاندند' چون جہاد نیز دران زمانہ یکے از ارکان طریقت وشریعت بود کہ مجاہدہ در مشقت ومنفعت بداں نمیرسد ومصلحت ہائے دیگر مثل ترقی اسلام وتکثیر غنائم وغیرہ براں موقوف بودند' حضرت اوشان سامانش فراہم آوردہ لشکر بر لشکر بطرف عراق وشام فرستادند' رفتہ رفتہ شہرہا در اطاعت اسلام آمدند' گروہی مسلمانان شدند' اکثرے بادائے جزیہ جان بسلامت بردند' وغنائم واموال فراوان بدار الخلافت رسیدن گرفت' درین اثناء حضرت صدیق رضی اللہ عنہ را داعیہ اجل پیش آمد' او شان لبیک گفتند وبرحمت حق پیوستند۔

۲۷ - چون دریں عرصہ ایں مہم بزرگ شدہ' وہر روز در بزرگی بود' فکر انجام یک مملکت در سر' ودشمن قوی بر سر آمد' ایصال حقوق مستحقان دور ونزدیک واجب ولازم افتاد' مصلحت وقت آں شد کہ مردے قوی دل' بلند ہمت کہ ازیں خرخش بستوہ نیاید'

واز ملامت ملامت کناں کہ از لوازم چنیں ریاست گیری ست' خصوصاً در چنیں زمانہ کہ ہر کس را مجال سخن بود' کمر ہمت نکشاید' وبانتظام ایں کار واہتمام ایں کارزار برخیزد' حضرت فاروق را بکمال درجہ موصوف بایں کمال دیدند' مع ہذا دلائل دیگر از نقل بر افضلیت شان گواہ بود' وحضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نیز بفرمانبری نصوص وہم بفراست خود بہ ولی(۱) عہدی شان اشارہ فرمودہ بودند' بایں وجوہ مذکورہ دست بہ بیعت شان دراز کردند' سر بحلقہ اطاعت شان در آوردند' چوں اوشان بر مسند خلافت نشست اند چنانکہ باید بسرانجام این کار پرداختند

۲۸ ۔ ہنوز زمانہ بہ ہمیں روش بود کہ مدت خلافت عمری منقرض گشت' ومہم سرکوبی سرکشان شام وفارس ناتمام ماند' چوں سانحہ تازہ کہ رعایت آں محتاج کمال مرتضوی باشد ہنوز پیش نیامدہ بود' بلکہ ہمان اہتمام کار فاروقی کارکنان خلافت پیش نہاد خاطر داشتند' وایں طرف روش فاروقی در انتظام مہمات چناں ذہن نشین ہر عام وخاص گشتہ کہ ہر کس ازو شان ایں کار کردن می توانست' ہمہ را دریں مقام متساوی الاقدام دیدند' القصہ در نشانیدن خلیفہ بر مسند خلافت سخت تحیر پیش آمد' مگر زہی دانش فاروقی کہ چگونہ باشارہ نبوی رفتند' وچساں قاعدہ استخلاف را مرعی داشتند' اعنی ہماں کمال قرب را مرجح قرار دادند' بتامیر کسانیکہ پسندیدہ بارگاہ مصطفوی وبغایت مقربان درگاہ خداوندی بودند' وصیت فرمودند۔

....

(۱) دراصل "اولی عہدی شان" بودہ' از سیاق عبارت فہمیدہ' تصحیح کردم۔ محمد یوسف

آخرکار بانکار باقیان از ستہ مشار الیہم امر خلافت فیما بین حضرت ذی النورین وحضرت امیر رضی اللہ عنہما دائر گشت، بعض اکابر صحابہ از اشارات حضرت نبویؐ ووصیت حضرت عمرؓ ایں دقیقہ را فہمیدہ در تعین حضرت عثمانؓ نیز برہان وتیرہ فاروقی رفتند، وبلحاظ افضلیت واقربیت ایشان کہ مستلزم مزیت قرب ست، واز اکثر نصوص ومعاملات زمانہ نبویؐ مستنبط می شد، ومع ہذا میلان خاطر اکثر خلائق کہ موافق بعض احادیث قدسی کہ یکے از دلائل افضلیت ست، او شان را بر حضرت امیر رضی اللہ عنہ ترجیح دادند، ایں جا معنی إن قمصك الله قميصا فلا تخلعه. (مشکوۃ ص ۵۶۲) کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ خطاب فرمودہ بودند، ووجہ نسبت کردن تقمیص بجانب باری عز اسمہ معلوم گشت، چہ وصول خلافت بحضرت عثمانؓ محض عطائے خداوندی ست، کہ بے خیال وگمان رسیدہ، کمال مخصوص را ہمچو خلافت ہائے خلفاء ثلاثہ باقیہ دراں دخل نیست، ونعمتے کہ بے سابقہ عمل وکمال میرسد دستور ست کہ آں را نسبت بخدا می کنند، ومی گویند کہ عطائے خدا ست، ووجہ تعین کردن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت فاروق را رضی اللہ عنہ وباعث معین نکردن حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کسی را نیز برآمد، ومعنی "لا اراکم فاعلین ..." نیز خیلے بریں واقعہ مطابق آمد، زیراکہ در دو بار اول در استحقاق خلیفہ اول وثانی احدی را کلام نبود، کہ در ضروریات خلافت نبوت خود یکتائے روزگار خود بودند، بسبب کمالات مناسبہ خلافت شان احدی ہم سنگ شان شدن

نمی توانست، مگر پس وفات خلیفہ ثانی خصوصاً وقت دوران امر خلافت فیما بین حضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ عنہما در ہر طرف احتمال تعین بود، وہر دو بزرگوار بظاہر ہم سنگ یکدگر بودند، اگر فرق ہم بود چندان خفی بود کہ اکابر صحابہ نیز باچندیں فہم وفراست پس از دیر، چنانکہ معلوم ست، دریافتند پس گویا خلافت تابادشان رسیدہ باز گردید۔

۲۹ ۔ نیز رعایت دو کمال مذکور باستخلاف خلیفہ اول وثانی بعمل آمدہ وازان انفراغ دست داد، اکنوں فقط رعایت کمال مرتضوی باقی بود، تاباقتران او برعایت کمال اول وثانی تمثال نبوت محمدی نقش ظہور می بست، مگر چوں حضرت عثمان در حیا از ہمہ قدم راسخ داشتند، واز نیرنگی ہائے حیا ایں ہم ست کہ بسا اوقات از مرد ضعیف کارہائے بزرگ چناں بچالاکی وچستی بہ ظہور آیند کہ مرد قوی ہمت ہم رشک برد، وازیں جہت کمالات عثمانی بکمالات فاروقی مستلحق شدہ بودند، اقامت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بمنزلہ جبر نقصان وتکمیل ناتمام شد، نہ آنکہ چون خلافات ثلاثہ باقیہ شان جداگانہ دارد، ازیں جہت وہم بلحاظ اینکہ غضب وحیا عظیم ترین اعوان ہمت اند، در حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ غضب فی اللہ بدرجہ کمال بود، مگر در حیا بیشتری حضرت عثمان راست رضی اللہ عنہ، اگر خلافت شان را تتمہ خلافت فاروقی نام نہند خیلے بجا باشد۔

۳۰ ۔ دریں مقام از خدشہ افضلیت حضرت امیر رضی اللہ عنہ از حضرت ذی النورین کہ بجہت ذکر نکردن شاں دریں حدیث باوہام

بعضے نسیاں متفرق می شد سینہ پاک گردید، وخلجان تخصیص ذکر اصحاب ثلاثہ مذکورین و ترک کردن ذکر حضرت ذی النورینؓ مرتفع گردید، گو از پیشتر نیز بحکم امر رابع مقدمہ مدفوع بود، و بحث چنانکہ بگذشت ہمیں ست کہ خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مبتنی بر کمال شان در کمالی از کمالات نبوت کہ مناسب حال زمانہ باشد نبود، بلکہ بجہت افضلیت شان در زمانہ خویش و استلحاق قوۃ عزیمت او شان فی الجملہ بسبب کمال حیا بقوت ہمت فاروقی از دیگر اقران وامثال مقدم شدہ بودند، وپس از ملاحظہ کار کردگی شان ہم محقق می شود کہ واقعی چنانکہ از حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امید بود بلاد فارس واطراف شام را جاروب دادہ از خس وخاشاک سرکشان نامور پاک کردند۔

۳۱ - القصہ چوں حضرت ذی النورین بدست جفا کاران شہید شدند، گویا تخم بدعت وضلال باب وخاک آمیخت، ووقت ظہور شاخ وبرگ بدعات قریب رسید، واگر باور نباشد از منشاء حدوث رفض وظہور نواصب تفتیش کنند کہ چیست؟ ہمیں قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خواہد بود، چنانکہ بجائے خود مذکورست، ایں وقت نشستن حضرت امیر رضی اللہ عنہ کہ ہادی ومہدی بودند بر مسند خلافت بجائے خود شد، مگر چوں قاتلان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دست بخون حضرت آلودند، وبدین گناہ روئی خود سیاہ نمودند، دیدند کہ ہمہ صحابہ بسنوح این واقعہ دست بدندان میخایند، آں سیہ کاران را فکر جان خویش شد، زیر دامن مرتضوی خزیدند، چوں حضرت ایشان بسبب عموم بلوی قاتل را از غیر قاتل نمی شناختند

ودر اجرائے حدود واخذ قصاص ثبوت کامل بکار ست، ونیز ہمیں دم از دست آں شوره پشتان یک خلافت دیرینه درہم وبرہم شده بوده برہمی ایں خلافت که ہنوز قرار نگرفته واستوار نشده چه دشوار بود از اخذ قصاص تامل فرمودند، وابستگان حضرت ذی النورین وطرفداران شان در صدمه ایں رنج بزرگ ہیچ نمنلهشند، بگمان مداہنت از حضرت امیر رضی الله عنه درپی جنگ وجدال شدند، وبدین سبب غبارہا برخاطر یکدگر به نشست، وفتنه ہا برخاست، و آنچه که شد شد، تا آنکه جہاد بکفار وفتح بلدان منقطع گشت، وراه آمدن غنائم مسدود شد، وہمیں است که در عنوان حضرت امیر رضی الله عنه ذکر امانت نکردند، ایں وقت معنی "لا اراکم فاعلین" حنوا بحنو منطبق شد، وتاسف نبوی صلی الله علیه وسلم که از معنی "لا اراکم فاعلین" می تراود موجه گشت، ومعلوم گردید که اگر ہست افسوس نبوی بایں وجه است که حضرت امیر را رضی الله عنه چنانکه ہادی ومہدی بودند، فرصت ہدایت امت واستیصال ماده بدعات از بیخ وبن میسر نیاید، وبسبب چپقلش باہم عنان ہمت بجانب دیگر معطوف ماند، بلکه بانیان فساد را دریں تفرق کلمه ونزاع باہم فرصتی بدست افتاد که بس غنیمت شمردند، گویا از غیب بر آتش بے نور شان روغن ریخته، ورنه گروه عبد الله بن سبا وبقیه خارج ہم ہمچو خوارج حروراء باب تیغ مرتضوی کنده آتش دوزخ می شدند، ونواصب بوجود نمی آمدند، وقدریه را قدرت زبان کشائی باقوال باطله خود میسر نمی آمد۔

۳۲ ـ مگر چوں شرف صحبت حضرت حبیب رب العالمین صلی الله

علیہ وسلم وعلی آلہ اجمعین وجانفشانی ہائے صحابہ واتباع واخلاص شان چنان نبود کہ بیک دو خطا اجتہادی یا تعصب قومیت۔ علی اختلاف الاراء۔ ہمہ را از نظر افگنند' ومواعید موثقہ مثل قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (آل عمران: ۳۱) ومن لقينى بقراب الأرض خطيئةً لا يشرك بى شيئًالقيته بمثلها مغفرة. کہ درمشکوۃ در باب ذکر اللہ عز وجل از مسلم آوردہ فراموش کنند' بلکہ قدر شناسی رحمت واسعہ کہ ہمہ صغائر وکبائر امت نبوی) بیک گوشہ اش بگنجد آنست کہ حسب وعدہ أُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ اگر کبائر ہم ازو شان دیدہ ودانستہ سرمیزد' در دفتر حسنات نبشتہ شود' بناء علیہ حکمت لم یزلی ایں سوانح را بر انگیخت کہ تماشائے عجیب مثل اظہار قدر صحابہ رضی اللہ عنہم ومنزلت شرف صحبت حبیب خود صلی اللہ علیہ وسلم بر روئی کار آوردن بود' ورسانیدن بے ادبان بجائے خود بران توقف داشت۔

واخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين، وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين.

۳۲۔ پس ازیں گزارش می کنم کہ بسبب کم فرصتی وقلت استعداد وعدم مزاولت کتب در امتثال امر سامی دیر شد' کہ وبیگاہ اگر فرصت ساعت دو ساعت میسری آمد کاغذ سیاہ میکردم' پس از دیر کہ نوبت تا بایں جا رسید' بملاحظہ تقریر پریشان وکجی بیان خود چناں میدانم کہ در نظر عنایت گرامی لاطائل نماید' وبہ میزان فہم درست سامی کم وزن برآید مگر ہرکس باندازہ خود می گوید' چوں سابق عرض کردہ آمدم کہ مرد ایں کار نیم معذورم۔ باقی بخدمت عنایت فرمائے من مولوی عبد القادر سلام مسنون پذیرفتہ باد فقط

کیا ذکری مسلمان ہیں؟

فہرست

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

ذکری فرقہ، جس کے افراد بلوچستان کے علاوہ کراچی میں بھی پائے جاتے ہیں اور جو ملّا محمد اٹکی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے، اس فرقہ کے بارے میں عام لوگوں کو، بلکہ خود اس فرقہ کے لوگوں کو بھی معلومات بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فرقہ کی مذہبی کتابیں مخطوطوں کی شکل میں ہیں اور وہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ چونکہ اس فرقہ کے لوگ اپنا تعارف مسلمان کی حیثیت سے کراتے ہیں اس لیے بعض لوگ ناواقفی کی وجہ سے ان کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھ لیتے ہیں۔

جناب مولانا احتشام الحق آسیا آبادی بلوچستان کے ایک محقق عالم ہیں، موصوف نے برسہا برس تک اس فرقہ کے بارے میں تحقیق کی اور اس فرقہ کے مذہبی پیشواؤں کا قلمی لٹریچر فراہم کیا۔ جس کی روشنی میں انہوں نے ایک مفصل استفتاء مرتب فرمایا ہے، یہ استفتاء تمام تر ذکری لٹریچر کے حوالوں پر مشتمل ہے جس کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ:

(۱) ذکری فرقہ ملّا محمد اٹکی کو مہدی معہود سمجھتا ہے۔

(۲) یہ فرقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیّین نہیں مانتا بلکہ ملّا محمد اٹکی کو خاتم النبیّین سمجھتا ہے۔

(۳) اس فرقہ کے نزدیک ملّا محمد اٹکی نورِ خدا ہے، رسول و نبی ہے، سید المرسلین ہے اور تمام انبیاء کرام اور ملائکہ عظام ملّا محمد اٹکی کے خدام ہیں۔

(۴) یہ فرقہ شریعتِ محمدیہ کو منسوخ سمجھتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کے اہم ترین رکن' نماز' کی ادائیگی کو کفر سمجھتے ہیں اور نماز پڑھنے والوں کو "چوتڑ اٹھانے والے" کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ روزۂ رمضان کے منکر ہیں، اس کے بجائے انہوں نے مختلف اوقات کے روزے تجویز کر رکھے ہیں۔ شرعی زکوٰۃ کا انکار کرتے ہیں، اس کے بجائے کم سے کم دس فیصد اپنے مذہبی پیشواؤں کو ٹیکس دیتے ہیں۔ حجِ اسلام کے منکر ہیں، اس کے بجائے "تربت" (بلوچستان) میں واقع "کوہِ مراد" کا حج کرتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک "مقامِ محمود" ہے۔

(۵) ذکریوں کے بقول قرآنِ کریم کے چالیس اجزاء تھے اور ملّا محمد اٹکی کو یہ اختیار دیا گیا کہ ان چالیس اجزاء میں سے جو چاہیں اپنے لیے انتخاب کرلیں چنانچہ ملّا محمد اٹکی نے ان میں سے دس اجزاء اپنے لیے منتخب کرلیے جو اسرارِ خداوندی پر مشتمل تھے، باقی اہلِ ظاہر کے لیے چھوڑ دیئے۔ اس موقع پر یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پہ پیش سگاں بگذاشتم

(میں نے قرآن کا مغز لے لیا اور ہڈیاں کتّوں کے آگے چھوڑ دیں)

(۶) اس فرقہ کے نزدیک محمد رسول اللہ سے مراد ملّا محمد اٹکی ہے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی احمد تھا۔ محمد سے مراد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ملا محمد اٹکی ہے)۔

(۷) یہ فرقہ تمام مسلمانوں کو جو ملا محمد اٹکی کو نہیں مانتے[؟] کافر قرار دیتا ہے۔

یہ تمام عقائد اس استفتار میں باحوالہ درج کئے گئے ہیں۔ مولانا موصوف نے اپنے استفتار میں ذکریوں کے یہ تمام عقائد باحوالہ درج کرکے علمائے امت سے استفتار کیا کہ:

(۱) جو فرقہ اور جو فرد ایسے عقائد رکھتا ہو کیا وہ مسلمان ہے یا نہیں؟

(۲) آیا ان سے رشتہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۳) اور ان کا ذبیحہ حلال ہے یا نہیں؟

راقم الحروف نے اس استفتار کے جواب میں قرآن کریم، احادیث نبوی اور اکابرِ امت کے فیصلوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ:

(۱) ایسے عقائد رکھنے والے لوگ قطعاً مسلمان نہیں، بلکہ ان کا حکم مرتدین کا ہے۔

(۲) کسی مسلمان کا ان کے ساتھ رشتہ ناتا جائز نہیں۔

(۳) ان کا ذبیحہ حلال نہیں بلکہ مُردار ہے۔

ذکری مذہب کے عقائد کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ عجیب انکشاف ہوا کہ ذکری مذہب اور قادیانی مذہب کے درمیان حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے، اتنی شدید مشابہت کہ گویا قادیانیت، ذکری مذہب کا نیا ایڈیشن یا اس کا چربہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان مشابہت کی تفصیلات ایک مستقل رسالہ کا موضوع ہے، حق تعالیٰ شانہٗ کو منظور ہوا تو اس موضوع پر مفصل لکھا جائے گا، سرِدست ان دونوں کے درمیان مشابہت کا ایک اجمالی خاکہ پیشِ خدمت ہے

۱۔ ذکری مذہب ملا محمد اٹکی کو مہدیٔ آخر الزمان مانتا ہے اور قادیانی مذہب مرزا غلام احمد قادیانی کو مہدی معہود اور مہدی آخر

الزمان قرار دیتا ہے۔

۲۔۔ ذکری مذہب ملا محمد اٹکی کو اللہ تعالیٰ کا نور و ظہور مانتا ہے اور قادیانی مذہب مرزا غلام احمد قادیانی کو خدا کا نور و ظہور مانتا ہے چنانچہ مرزا قادیانی کا ایک الہامی نام "نور اللہ" ہے۔ (تذکرہ ص ۱۴۲) نیز مرزا قادیانی کا ایک الہام ہے: "ظہورک ظہوری"۔ (تیرا ظہور میرا ظہور ہے)۔ (تذکرہ ص ۷۰۰)

۳۔۔ ذکری مذہب ملا محمد اٹکی کو تمام رسولوں سے افضل مانتا ہے اور قادیانی مذہب مرزا غلام احمد قادیانی کے اس دعوے پر ایمان رکھتا ہے کہ:

(۱) انبیاء گرچہ بودہ اند بسے
من بعرفان نہ کمترام ز کسے

(۲) آنچہ داد است ہر نبی را جام
داد آں جام را مرا بہ تمام

(۳) زندہ شد ہر نبی بامدنم
ہر رسولے نہاں بہ پیرہنم

(ترجمہ: (۱) نبی اگرچہ بہت ہوئے ہیں مگر میں معرفتِ الٰہی میں کسی نبی سے کم نہیں ہوں۔

(۲) جو جام کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو دیا ہے وہ پورے کا پورا مجھے دے دیا ہے۔

(۳) میرے آنے سے ہر نبی زندہ ہوگیا' ہر رسول میرے کُرتے میں پوشیدہ ہے۔)

۴۔۔ ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کے چالیس پارے تھے جن میں سے دس پارے ملا محمد اٹکی کے ساتھ مخصوص کر دیئے گئے اور قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی وحی نے دس

پاروں کا نہیں بلکہ بیس پاروں کا قرآنی وحی پر اضافہ کیا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے:

"اور خدا کا کلام اس قدر مجھ پر ہوا ہے کہ اگر وہ تمام لکھا جائے تو بیس جزو سے کم نہیں ہوگا۔" (حقیقۃ الوحی ص ۳۹۱)

۵ ـــــ ذکری مذہب کے عقیدہ میں نجات صرف ملّا محمد اٹکی کی پیروی میں ہے اور قادیانی عقیدہ ہے کہ نہیں بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیروی مدارِ نجات ہے۔

۶ ـــــ ذکری لوگ ملّا محمد اٹکی کے نہ ماننے والے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور قادیانی، مرزا غلام احمد قادیانی کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، قادیانیوں کا خلیفۂ دوم مرزا محمود لکھتا ہے:

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" (آئینۂ صداقت ص ۳۵)

مرزا بشیر احمد ایم اے لکھتا ہے:

"ہر ایک ایسا شخص جو موسیٰ کو تو مانتا ہے مگر عیسیٰ کو نہیں مانتا، یا عیسیٰ کو تو مانتا ہے مگر محمدؐ کو نہیں مانتا، یا محمدؐ کو مانتا ہے پر مسیح موعود کو (مرزا قادیانی) نہیں مانتا وہ نہ صرف کافر بلکہ پکّا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"
(کلمۃ الفصل ص ۱۱۰)

۷ ـــــ ذکریوں کے نزدیک محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین منسوخ ہے اور قادیانیوں کے نزدیک مرزا غلام احمد قادیانی کے بغیر دینِ اسلام لعنتی، شیطانی، قابلِ نفرت اور مُردہ ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ ص ۱۳۹، ۱۸۳)

ان چند نکات سے اندازہ ہوگا کہ دسویں صدی کے جھوٹے مہدی ملا محمد اٹکی اور چودہویں صدی کے جھوٹے مہدی کے دعویٰ و نظریات کے درمیان کس قدر مشابہت ہے؟ پس جس طرح قادیانی اپنے عقائد کفریہ کی وجہ سے مسلمان نہیں، ٹھیک اسی طرح ذکری لوگ بھی مسلمان نہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ امتِ مسلمہ کو تمام فتنوں سے محفوظ رکھے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد یوسف لدھیانوی

استفتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینِ اسلام کے محافظین علماء کرام اور مفتیانِ عظام کی خدمت میں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امّا بعد، یہ بندۂ عاجز عرض کرتا ہے کہ ——— گزشتہ کئی برسوں سے مختلف افراد اور متعدد ملکوں سے خطوط و استفتاء آتے رہے ہیں، جن میں "ذکری مذہب" کی شرعی حیثیت کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ "کیا ذکری کافر ہیں یا ان کو مسلمان کہا جا سکتا ہے"۔ ان خطوط و سوالات کا میں متعدد بار کبھی مختصر اور کبھی تفصیل کے ساتھ جواب بھی دیتا رہا ہوں۔ اسی ضمن میں میری دو کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں ——— جیسا کہ باخبر لوگوں کے علم میں یہ بات بخوبی ہوگی کہ گزشتہ چند سالوں سے ذکریوں کی بالواسطہ اور بلاواسطہ سرگرمیاں کافی تیز ہو گئی ہیں اور کسی وقت بھی یہ قادیانیوں کی طرح امتِ مسلمہ کے لیے ناسُور کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔

صورتِ حال کی اس سنگین نوعیت کے پیشِ نظر میں نے اُمت کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت اور بعض بہی خواہوں کی خواہش پر مناسب

سمجھا کہ علمار کرام اور مفتی حضرات کی اجتماعی رائے معلوم کر لی جائے تاکہ ذکریوں کی تخریبی سرگرمیوں کی روک تھام کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کو ان کے دھوکہ سے بھی محفوظ رکھا جا سکے۔

اس بنا پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ ذکری مذہب کی حقیقت اور ان کے عقائد واعمال کا تفصیلی جائزہ حضرات علمار کرام کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اپنی رائے کا اظہار فرمادیں ـــــــ اور یہی وجہ ہے کہ سوال میں ذکریوں کے عقائد واعمال کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

ذکری مذہب کی مختصر تاریخ

ذکری مذہب کو "داعی" بھی کہا جاتا ہے اور عوامی زبان میں یہ لفظ بگڑ کر "دینِ ڈاہی" بن گیا ہے۔ یہ مذہب صرف بلوچ قوم تک محدود ہے۔ ذکری تحریرات کے مطابق اس مذہب کے بانی ملّا محمد اٹکی کا ظہور ۹۷۷ھ مطابق ۱۵۶۹ء میں ہوا۔ (قلمی نسخہ شے محمد قصرقندی ص ۱۵۳ حصہ منظوم)۔ ملّا محمد اٹکی کا ظہور ابتداً اٹک (کیمبل پور) میں ہوا۔ (حقیقت نور پاک و سفرنامۂ مہدی ص ۷)

ذکریوں کی مشہور قلمی کتاب "سیر جہانی" کے بموجب محمد اٹکی نے دنیا کے اطراف و اکناف میں کافی چکر لگایا مگر کہیں اس کی پذیرائی نہ ہوئی، کہیں ایک آدھ ہمنوا مل گیا، ورنہ کچھ نہیں۔ بالآخر کیچ مکران میں دین سے ناواقفیت کی بنا پر اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ علاقہ مذکورہ میں اہلِ علم نہیں تھے۔ جلد ہی اس کو ایک امت ملی۔ ملّا محمد اٹکی، مہدی، نبوت اور رسالت کا دعویٰ کرنے کے کچھ عرصہ بعد روپوش ہوگیا۔ اور اس طرح ذکری مذہب وجود میں آگیا۔ اس کے روپوش ہونے کی تاریخ ۱۰۲۹ھ ہے۔ (قلمی نسخہ شے محمد قصرقندی ص ۱۵۴)

ملّا محمد اٹکی نے اس عرصے میں پہلے مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ کیا، پھر نبی اور رسول اور پھر خاتم النبیین اور خاتم المرسلین ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ شریعتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم) اب منسوخ ہو چکی ہے۔ چنانچہ نماز، روزۂ رمضان اور حجِ بیتُ اللہ کی فرضیت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ زکوٰۃ کو ایک ترمیم کے ساتھ بحال رکھا اور اس کا مصرف مذہبی پیشواؤں کو قرار دیا خواہ وہ کیسے ہی مالدار کیوں نہ ہوں۔ کوہِ مراد کو مقامِ محمود قرار دیا جس کی اب ہر سال حج و زیارت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر سال ذکری لوگ حج کے لیے کوہِ مراد تربت چلے جاتے ہیں۔ آبِ زم زم کے نام سے ایک پانی کو متعارف کرایا۔ صفا مروہ، عرفات،

کوہِ امام، مسجد طوبیٰ اور اس قسم کی بہت سی چیزیں اپنے جاہل ماننے والوں میں رائج کر دیں، جو تاحال قائم ہیں۔ جب سے اب تک اس مذہب نے عروج و زوال کے بہت سے ادوار دیکھے ہیں۔

ذکری مذہب کے چند کفریہ عقائد

ذکری مذہب والوں کے عقائد و نظریات کا خلاصہ یہ ہے:

ذکریوں کا کلمہ مسلمانوں کے کلمہ سے الگ ہے۔ وہ محمد اٹکی کو مہدی، رسول، نبی، خاتم المرسلین، خاتم النبیین اور اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا مانتے ہیں، اور کلمہ بھی اس کے نام کا پڑھتے ہیں، مہدی اٹکی کے منکرین کو کافر سمجھتے ہیں، قرآن مجید کی تاویل و تشریح کے لیے مہدی اٹکی کے قول کو معتبر مانتے ہیں۔ قرآن کریم کی جن آیات میں لفظ "محمد" آیا ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد محمد اٹکی لیتے ہیں، دیگر انبیاء کی توہین کرکے محمد اٹکی کو سب سے افضل سمجھتے ہیں، کوہِ مراد (تربت) کو مقامِ محمود سمجھتے ہیں، اور ہر سال اسی کا حج کرتے ہیں، تمام ارکانِ اسلام کے منکر ہیں بالخصوص نماز کو موجبِ کفر و گناہ سمجھتے ہیں وغیرہ

اس سلسلے میں بعض حوالہ جات ذکریوں کی اپنی کتابوں سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

ذکریوں کا کلمہ مسلمانوں کے کلمہ سے الگ ہے

ذکریوں کا کلمہ مسلمانوں کے کلمہ سے جُدا ہے۔ وہ چند طریقوں سے کلمہ پڑھتے ہیں، ان کی قبروں پر جو کتبے لگے ہیں، ان پر ان کا اپنا کلمہ لکھا ہوا ہے۔
ان کے چند کلمے یوں ہیں:

۱۔ لا الٰہ الا اللہ نور پاک نور محمد مہدی رسول اللہ

عام طور پر ذکری اس طرح کلمہ پڑھتے ہیں لیکن سفرنامہ مہدی ص ۷۵ میں اس کلمہ میں نور پاک کا لفظ نہیں لکھا ہے۔

۲۔ لا الٰہ الا اللہ الملک الحق المبین نور پاک نور محمد مہدی رسول اللہ صادق الوعد الامین۔

(ذکر وحدت ص ۱۶، ۱۷، ۱۸ وغیرہ، نور تجلی ص ۱۱۸، ۱۲۲۔ ذکر الٰہی ص ۱۰، ۱۱ وغیرہ)

۳۔ ذکریوں کی کتاب "ذکر توحید" ص ۷۴ میں ذکریوں کا کلمہ یوں درج کیا گیا ہے:

لا الٰہ الا اللہ نور محمد مہدی رسول اللہ صادق الوعد الامین۔

سفرنامہ مہدی از شیخ عزیز لاری ص ۷۴ میں اس کو کلمہ طیبہ کہا گیا ہے۔

ذکریوں کے ان تمام کلموں میں قدرِ مشترک نور محمد مہدی رسول اللہ ہے جس میں محمد مہدی کو رسول اللہ کہا گیا ہے جبکہ اسلام کے کلمہ میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کفر ہے۔

ملاحظہ: واضح رہے کہ ذکری جہاں نور محمد یا محمد مہدی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس سے ان کی مراد محمد اٹکی ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ "نور تجلی" ص ۵۹، ۶۰ میں لکھا ہے کہ "جس کو ہم مہدی موعود یا مہدی آخر الزماں کہتے ہیں وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ایک ہزار سال بعد میں پیدا ہوگا"۔ نیز اسی کتاب کے ص ۶۲ میں لکھا ہے کہ "جس کو روحِ محمدی بولتے ہیں اس سے نور محمدی مراد ہیں نہ کہ کوئی اور۔"

ذکری محمد اٹکی کو رسول، نبی آخر الزماں، خاتم المرسلین اور خاتم النبیین مانتے ہیں

ذکری ملا محمد اٹکی کو مہدی، نبی آخر الزماں اور تمام انبیاء کا سردار مانتے ہیں۔ چنانچہ شیخ عزیز لاری لکھتے ہیں:

"د نعت در شان حضرت سید المرسلین نور محمد مہدی اوّل و آخرین، ہادیٔ برگزین نور رب العالمین "۔

(سفرنامہ مہدی ص ۳)

ترجمہ: حضرت سید المرسلین نور محمد مہدی کی شان کے بیان میں جو کہ اولین و آخرین ہے اور برگزیدہ ہادی ہے، رب العالمین کا نور ہے۔

قلمی نسخہ شے محمد قصر قندی میں ہے:

"موسیٰ گفت یارب! بعد از مہدی رسولے دیگر پیدا کنی یا نہ؟ حق تعالیٰ گفت اے موسیٰ! بعد از مہدی پیغمبری دیگر نیافریدم نور اولین و آخرین ہمیں است کہ پیدا خواہم کرد "۔

(قلمی نسخہ شے محمد قصر قندی ص ۱۱۷)

ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یارب! مہدی کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر پیدا کروگے یا نہیں؟ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! مہدی کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر میں نے پیدا نہیں کیا، نور اولین و آخرین یہی ہے کہ میں پیدا کروں گا۔

ذکری رہنما ملا محمد اسحاق دزازئی نے مہدی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تاویلِ قرآن، نبی تمام، سید امام، مرسل ختم، رفیع الاکرام، نور محمد مہدی اول آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام "۔

(ذکر الٰہی ص ۳۹ مطبوعہ ۱۹۵۶ء)

ترجمہ: قرآن کی تاویل کرنے والا ہے، آخری نبی ہے، اماموں کا سید ہے، اور خاتم النبی ہے، نور محمد مہدی اول آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

یہ ترجمہ خود مؤلف کتاب نے کیا ہے جس کی ذمہ داری خود مؤلفِ کتاب ذکری رہنما پر ہے۔

یہی الفاظ بغیر ترجمہ کے "ذکر توحید" ص ۴۶ میں بھی درج ہیں۔ نیز یہ عبارت نورِ تجلی ص ۱۲۱ میں بھی درج ہے۔

نور تجلی ص ۶۸ میں ہے ؎

رسولی کہ بر جملہ را سرور است
امینِ خدا تاج پیغمبر است
رسولِ خدا خواجۂ ہر چہ است
زبہر وی ایں جملہ رانقش بست

(نورِ تجلی ص ۶۸)

ترجمہ: وہ رسول جو تمام رسولوں کا سردار ہے۔ خدا کا امین پیغمبروں کا تاج ہے۔ رسول خدا دو جہان کا آقا ہے۔ اسی کی خاطر ساری کائنات کا نقش قائم ہوا۔

آگے لکھتے ہیں کہ:

توئی خاتم جملہ پیغمبراں
توئی تاجدار ہمہ سروراں
تو بودی پیغمبر بحق الیقین
کہ آدم نہاں بود درماء وطین

(نور تجلی ص ۶۹)

ترجمہ: یعنی تو ہی تمام پیغمبروں کا خاتم ہے اور تو ہی تمام سرداروں کا تاجدار ہے۔ بحق الیقین تم تو اس وقت سے پیغمبر تھے جبکہ آدم علیہ السلام بین الماء والطین تھے۔ (یعنی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے)۔

آگے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

ہمہ انبیاء را بتو افتخار
توئی بندۂ خاص پروردگار

(نور تجلی ص ۷۱)

ترجمہ: تمام انبیاء کو تم پر فخر ہے کہ تو پروردگار کا خاص بندہ ہے۔

صاحب "درصدف" کے اشعار "نورِ ہدایت" میں زیرِ عنوان "نعت درشانِ حضرت محمد مہدی علیہ السلام" یوں نقل کئے ہیں کہ:

امام رسل پیشوائی سُبُل

ہمہ ہمچو برگ است او ہمچو گل

(نورِ ہدایت ص ۹)

ترجمہ: پیغمبروں کے امام اور راہِ راست کے پیشوا ہیں، دوسرے سب پتے کی مثل ہیں اور وہ پھول کی مانند ہیں۔

ان کے علاوہ ذکریوں کی منجملہ دیگر کتب کے درج ذیل کتابوں میں بھی محمد اٹکی کی پیغمبری کا دعویٰ، اور ان پر ختم نبوت و ختم رسالت کا ادّعا درج ہے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کا ضمناً انکار بھی ہے جن میں سے بعض کتب یہ ہیں:

ثنائے مہدی ص ۹، ۱۰۰۷۔ قلمی سیر جہانی ص ۵۹، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۶۶، ۱۶۷۔ فرمودات مہدی ص ۲ وغیرہ۔

ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ محمد اٹکی کو نہ ماننے والا اور اُس کو جھوٹا کہنے والا کافر ہے

ذکری عقیدہ کے مطابق ان کے محمد اٹکی کو نہ ماننے والا اور اس کی تکذیب کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذکریوں کے علاوہ باقی تمام مسلمان ان کے نزدیک کافر ہیں۔ "قلمی نسخہ شے محمد قصرقندی ہیتر موسیٰ نامہ" میں ہے:

"حق تعالیٰ گفت در طورات گفتہ ایم منکران مہدی فقد کفر و کذّب المہدی فقد کفر و کسی کہ منکر از مہدی باشد پس بتحقیق کافر

کسی کہ دروغ کند مہدی را پس بتحقیق کافر شود و ای موسیٰ ہر کہ
بر مہدی شک آرد کافر گردد ۔"

(قلمی نسخہ مہتر موسیٰ نامہ ص ۱۱، ۱۲)

خلاصۂ ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تورات میں کہا ہے کہ مہدی کا منکر کافر
ہے اور جو مہدی کو جھٹلائے وہ کافر ہے اور جو مہدی کے بارے میں
شک کرے وہ بھی کافر ہو جائے گا۔

مہتر موسیٰ نامہ میں ہی دوسری جگہ مختصراً یہ لکھا ہے کہ:
"آن کسی کہ منکر مہدی باشد کافر است۔"

(قلمی نسخہ موسیٰ نامہ ص ۱۵۸)

قلمی نسخہ موسیٰ نامہ کے ص ۱۵۴ حصّہ ابیات میں بھی مہدی کے نہ ماننے والوں
کو کافر کہا ہے۔ موسیٰ نامہ کے ص ۱۴۵ میں ہے کہ:

ترجمہ: "جو مہدی کے رازوں سے ناواقف ہے وہ کافر ہے۔"

ثنائے مہدی ص ۷ اور ۱۶ میں بھی مہدی انکی پر یقین نہ رکھنے والوں کو
کافر کہا گیا ہے۔

ذکریوں کی مشہور و معتمد کتاب "سیر جہانی" کے قلمی نسخہ میں ہے،
"و ہر کہ بر مہدیت ایں ذات ایمان آورد او مومن گردد و
ہر کہ انکار کند او کافر کلاں گردد ۔"

(سیر جہانی قلمی نسخہ ص ۳۷)

ترجمہ: یعنی جو اس ذات کی مہدیت پر ایمان لاتا ہے وہ مومن
ہوگا اور جو انکار کرے گا وہ بہت بڑا کافر ہو جائے گا۔

سیر جہانی میں مزید یہ بھی لکھا ہے کہ:
"کسی کہ ایمان آورد بخدائی و پیغمبری من است و کسی کہ
برگردد و شک آرد او کافر درگاہ باشد ۔"

(سیر جہانی قلمی نسخہ ص ۳۸)

ترجمہ: جس نے اللہ تعالیٰ کی خدائی پر اور میری پیغمبری پر ایمان لایا وہ مجھ سے ہے اور جو الٹے منہ پھرا اور شک کیا وہ کافر ہوگیا۔

سیر جہانی قلمی نسخہ ص ۸۶ میں ہے کہ:

"سید محمد مہدی تمہارا منکر کافر ہے۔"

اسی کتاب کے ص ۸۷ میں اسی طرح کا ایک جملہ مہدی اٹکی نے اپنی جانب منسوب کرکے لکھا ہے۔

شیخ عزیز لاری لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے میری طرف سے مُنہ موڑا وہ سب کفار اور میرے دین کے دشمن اور باغی ہوئے۔"

(حقیقتِ نور پاک و سفرنامۂ مہدی ص ۳)

قصص النبی ص ۴۲ میں محمد اٹکی کے دین میں شک کرنے والوں کو کافر کہا ہے۔

قلمی نسخہ فرمودات مہدی ص ۹۹ میں مہدی اٹکی کے بعض اقوال کو نقل کرکے لکھا ہے کہ:

"جو ان باتوں میں شک کرے اور کسی ایک بات کا بھی انکار کرے وہ کافر ہے .... اور جو ان پر یقین نہ رکھتا ہو وہ فرعون اور نمرود کی طرح کافر ہو جائے گا۔"

(فرمودات مہدی قلمی نسخہ ص ۹۹)

قلمی نسخہ "سیر جہانی" ص ۱۶۸ میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص تمام دوسرے پیغمبروں پر ایمان لاکر محمد اٹکی کی پیغمبری کا منکر ہو یا ذکری دین کو غلط سمجھے وہ کافر شمار ہوگا اور دوزخ سے خلاصی نہ پاسکے گا۔

ذکری عقیدہ کے مطابق مہدی خدا کے نور سے پیدا ہوا ہے

ذکریوں کی بعض کتابوں میں اگرچہ محمد مہدی اٹکی کے والدین کا بھی ذکر ملتا ہے۔

لیکن عام ذکری عقیدہ کے مطابق، ایسے ہی ان کی مصدقہ اور قابلِ اعتماد کتابوں کی رُو سے وہ ایک نور ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے پیدا کیا ہے۔ تقریباً ذکریوں کی تمام کتابوں میں مہدی اٹکی کو نور ہی لکھا گیا ہے۔ چنانچہ "موسیٰ نامہ" میں ہے:

"موسیٰ گفت یا رب! مہدی از چہ آفریدہ است۔ حق تعالیٰ گفت کہ از نور خود آفریدم"۔

(قلمی نسخہ شے محمد قصر قندی موسیٰ نامہ ص ۱۱۵)

ترجمہ: یعنی موسیٰ نے کہا اے رب! آپ نے مہدی کو کس چیز سے پیدا فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ نے کہا کہ اپنے نور سے پیدا کیا ہے۔

اسی کتاب کے ص ۱۱۷ میں مہدی اٹکی کو نور اولین و آخرین کہا گیا ہے

مہدی نامہ از شیخ عزیز لاری میں ہے:

"ھٰذا المھدی نور اللہ و مراد اللہ"۔

(حقیقتِ نورِ پاک ص ۷)

یعنی یہ مہدی اللہ کا نور ہے۔

ذکریوں کی ایک مشہور کتاب "معراج نامہ" قلمی ہے۔ اس پوری کتاب میں معراج کے واقعہ کو بے سروپا انداز میں بیان کرکے یہ تاثر دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد مہدی اٹکی کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

"نور مہدی و خاطم نبی توئی"۔ (معراج نامہ ص ۲۳)

یعنی اے محمد اٹکی! نور مہدی و خاتم النبی تم ہو۔

کتاب مذکور کے تقریباً اکثر صفحات میں مہدی اٹکی کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہی حال اکثر ذکری مؤلفین کا ہے۔

ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ جس مہدی کا انتظار تھا وہ وہی ہے جو آگیا ہے

ذکری کتاب ثنائے مہدی میں ان لوگوں کو منکرین کا نام دیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مہدی ابھی تک نہیں آیا ہے۔ لکھتے ہیں:

چشم اُمید از عقب دارند اہلِ منکران
تاجداراں جملہ شاہان مہدیٔ صاحب زمان

(ثنائے مہدی ص ۱۰)

ترجمہ: مہدی کے منکر، اب بھی اُمید رکھتے ہیں کہ مہدی آئے گا۔ حالانکہ تمام بادشاہوں کا سردار مہدی تو آگیا ہے۔

قلمی ابیات شے محمد قصر قندی ص ۱۵۶، ذکر وحدت ص ۱۱، قلمی نسخہ سیر جہانی ص ۴۴ اور دیگر کتب ذکریہ میں اس عقیدہ کا برملا اظہار کیا گیا ہے۔

ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی تاویل وتفسیر کے لیے نور محمد مہدی کا قول معتبر ہے

ذکری عقیدہ کے مطابق قرآن مجید ان کے پیغمبر محمد مہدی انکی پر نازل ہوا ہے۔ وہ کبھی اس کا نام "برہان" بھی رکھتے ہیں۔ البتہ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے نازل ہوا ہے جس کی تاویل وتشریح کے لیے مہدی انکی کا قول ہی معتبر ہے۔ وہ مہدی انکی کی صفات میں سے ایک صفت "تاویل قرآن" بھی بیان کرتے ہیں۔

ذکریوں کی بعض مذہبی کتابوں میں اس کی کتاب کا نام "کنز الاسرار" بھی آیا ہے۔

نیز ذکری رہنما یہ بھی لکھتے ہیں کہ فرقان (یعنی قرآن) چالیس اجزاء پر مشتمل تھا' جن میں سے دس اجزاء مہدی نے منتخب کر لیے اور یہی اہلِ باطن کا دستور العمل ہے. باقی تیس اجزاء اہلِ ظاہر کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔ چنانچہ مشہور ذکری رہنما ملاّ مزار عومرانی نے سفر نامۂ مہدی کے ترجمہ میں لکھا ہے:

"فرقان حمید چالیس اجزائے پر مشتمل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ جس قدر آپ چاہیں' فرقان حمید سے لے سکتے ہیں' پس میں نے دس جزء جو کہ اسرار خداوندی تھے' نکال لے۔ یہ دس اجزاء قرآن مجید کے مغز تھے۔

شعر
من ز قرآن مغز را برداشتم
استخوان پیش سگاں بگذاشتم

(میں نے قرآن کا مغز نکال لیا۔ اور ہڈیاں کتوں کے آگے چھوڑ دیں۔ ترجمہ از ناقل)

بقایا تیس پارے اہلِ ظاہر کے لیے چھوڑ دیئے. اور وہ دس پارے خاصانِ خدا کے لیے ہیں۔ جنہیں برہان کہا جاتا ہے۔ برہان کو کنز الاسرار بھی کہتے ہیں۔ تیس پاروں کی تحویل (تاویل) سید محمد جونپوری کی زبان سے ظاہر ہوئی ہے۔ "کنز الاسرار میرے خاص اُمتیوں کے پاس ہوگی"

(حقیقتِ نور پاک (سفر نامۂ مہدی ص ۴، ۵)

قلمی نسخہ شے محمد قصر قندی موسیٰ نامہ ص ۱۱۷ میں ہے کہ:

"مہدی کو "برہان نامی" کتاب دی گئی ہے"

ثنائے مہدی میں ہے؛ شعر

بیانیکہ او کرد ز تاویل قرآن
باب گنج و علم دریا مہدیٔ آخرالزمان

(ثنائے مہدی ص ۵)

انہیں کا ایک دوسرا شعر اس طرح ہے: شعر

نکا (پکا)، راست دل و جان و تن سر تا پا
فالق الاصباح تاویل قرآن مہدیٔ آخرالزماں

ذکریوں کی ایک مطبوعہ کتاب" ذکر الٰہی" میں مہدی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

بُلبل شکرستان، تاویل قرآن نبی تمام الخ

(ترجمہ از مؤلف ذکر الٰہی) : "میٹھے باغ کا بلبل ہے، قرآن کی تاویل کرنے والا ہے، آخری نبی ہے۔"

(ذکر الٰہی ص ۳۹)

ان کے علاوہ ذکرِ توحید ص ۱۳ میں مہدی اُمّی کو خلیفۂ رحمان اور تاویل قرآن کہا گیا ہے۔ ثنائے مہدی ص ۷ میں ایک شعر کے ضمن میں مہدی کو تاویل کہا گیا ہے۔ قلمی نسخہ شے محمد قصر قندی حصہ ابیات میں ہے ؎

بعد ازاں تا سال عالم خلق را دعوت نمود
از حدیث لوح محفوظ ز تاویل قرآن

(قلمی نسخہ شے محمد قصر قندی ص ۱۵۳)

ترجمہ : یعنی مہدی نے دنیا میں آکر کئی سالوں تک لوگوں کو دعوت دی اور لوح محفوظ کے مطابق قرآن کی تاویل و تفسیر کرکے لوگوں کو نصیحت کی۔

ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ مقامِ محمود سے مراد کوہِ مراد ہے

قرآن کریم کی آیت "عسٰی ان یبعثک ربک مقاماً محموداً" سے مراد ذکریوں کے نزدیک تربت مکران کا وہ پہاڑ ہے جس کا ہر سال وہ طواف و حج کرتے ہیں، جس کا نام کوہِ مراد ہے۔ اس کی تصریح ذکری رہنما جی ایس بجارانی نے اپنی کتاب "نورِ تجلی" میں کی ہے۔ انہیں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"زیارتِ کوہِ مُراد : یہ مقدس جگہ مقام محمود ہے۔ اس لیے ذکری عقائد

کی بنیاد پر مقامِ محمود کی زیارت کرنا فرض اور لازمی ہے۔ کیونکہ مقامِ محمود شفاعتِ کبریٰ کی جگہ ہے۔ چند علمایانِ دین کا خیال ہے کہ مقامِ محمود چوتھے آسمان پر ہے۔ یہ مقام جبکہ شفاعتِ کبریٰ کی جگہ ہے، بھلا کوئی بتائے کہ آسمان پر کون انسان جا سکتا ہے۔ اس لیے ہمارے عقائد کی رُو سے مقامِ محمود یہی ہے۔"

(نورِ تجلی ص ۱۴)

واضح رہے کہ آیت مذکورہ میں واضح طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے مگر ذکری حضرات اس سے مراد محمد اٹکی اور مقامِ محمود سے مراد کوہِ مراد لے رہے ہیں۔

ذکری عقیدہ کے مطابق قرآن مجید میں لفظ "محمد" سے مراد محمد اٹکی ہے۔ ایسے ہی جن آیتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، ان سب سے محمد مہدی اٹکی ہی مراد لیتے ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں لفظ محمد آیا ہے یا جن آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کا خطاب ہے، اس سے ذکری لوگ محمد مہدی اٹکی ہی مراد لیتے ہیں۔
ذکریوں کی ایک مشہور کتاب "معراج نامہ" ہے جو قلمی نسخہ کی شکل میں ہے۔ اس کے پورے تیئیس ۲۳ صفحات میں معراج کے واقعہ کو بے سروپا انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں جہاں ختم نبوت کا انکار کیا ہے وہاں یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی احمد ہے اور محمد ذکریوں کے خود ساختہ پیغمبر کا نام ہے۔ (ملاحظہ ہو معراج نامہ ص ۲ تا ۲۴)
اس موضوع سے متعلق ذکریوں کی کتاب نورِ تجلی ص ۱۲، ۲۲، ۲۳، ۶۲

نیز موسی نامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ :

"اگر بر مہدی ایمان نیاری ترا در آتش بسوزانم "

(موسیٰ نامہ ص ۱۰۰)

ترجمہ : یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ ! اگر مہدی پر ایمان نہ لاؤ گے تو تمہیں دوزخ میں جلا دوں گا ۔ العیاذ باللہ ۔

تقریباً یہی حال ذکریوں کی دیگر کتب کا بھی ہے ۔

توہین انبیاء کرام وملائکہ عظام

ذکریوں کی کتابوں میں نہ صرف مہدی اٹکی کو انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل کہا گیا ہے بلکہ تمام انبیاء کرام اور ملائکہ عظام کی توہین بھی کی گئی ہے ۔ معراج نامہ کے تیئیس صفحات کا حوالہ ہم پچھلے صفحات میں دے چکے ہیں ۔ نورِ تجلی میں ہے :

خلیل از جواہر فروشان تو

کلیم اللہ از بادہ نوشانِ تو

(نور تجلی ص۶۸)

ترجمہ : حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تیرے جوہر فروشوں میں سے ہیں اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام تیرے بادہ نوشوں میں سے ہیں ۔

نور تجلی کے اسی صفحے پر بہت ساری دیگر خرافات بھی موجود ہیں ۔ نور تجلی ص ۶۹ میں ہے ۔

ہمہ چاکر و خیل و احتشام تو

از جملہ را سکہ از نامِ تو

(نور تجلی ص ۶۹)

ترجمہ: تمام نبی تیری عزت و حشمت کے نوکر ہیں، سب کا سکہ
تیرے نام سے چلتا ہے۔

نور ہدایت ص ۸۳، ۸۷ و دیگر صفحات میں بھی بہت کچھ انبیاء و ملائکہ کی
توہین آمیز اشعار موجود ہیں۔

ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم منسوخ ہو چکی ہے۔

ذکریوں کی تمام کتابوں میں مہدی اٹکی کے ماننے والوں کو "اُمتِ مہدی" امتانِ مہدی کہا گیا ہے۔ ایسے ہی مہدی کے خود ساختہ مذہب کو مذہب مہدی، دینِ مہدی، شریعتِ مہدی وغیرہ الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلے میں کسی دین و شریعت کا تصور اور کسی دیگر اُمت کا تصور جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ شریعتِ اسلام کو منسوخ مانا جائے۔ اس سلسلے میں شے محمد قصر قندی نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ ؏

"قولِ انعال مذاہب خط باطل کشید۔"

(موسیٰ نامہ ص ۱۵۳)

اس کی مزید وضاحت کے لیے کہ ذکری اپنے مذہب کو مستقل دین و شریعت مانتے ہیں اور اپنے کو الگ امت تصوّر کرتے ہیں، ذیل کے حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔
قلمی نسخہ قصص الغیبی ص ۴، ۱۸، ۴۳، ۴۴ وغیرہ۔ معراج نامہ قلمی نسخہ ص ۲۴، ۲۵،
۴۴ وغیرہ۔

ذکری مذہب اور باقی ارکانِ اسلام

ذکری مذہب اور نماز :

ذکری مذہب کے لوگ نماز کے منکر ہیں، چنانچہ ایک بھی ذکری نماز نہیں پڑھتا۔ نماز پڑھنے والے کو وہ مرتد اور بددین شمار کرتے ہیں۔

ملّا نورالدین نے اپنے قلمی نسخہ میں نماز جمعہ وعیدین پڑھنے والوں کو کافر اور باقی نمازیں پڑھنے والوں کو گناہگار لکھا ہے :

(قلمی نسخہ ملا نورالدین ص ۱۲۱)

ذکری مذہب اور روزۂ رمضان المبارک :

تمام ذکری بلا استثنار روزۂ رمضان المبارک کے منکر ہیں اور رمضان کے روزے نہیں رکھتے۔ البتہ مغالطہ کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم ایام بیض، ہر پیر اور عشرۂ ذی الحجہ کے روزے رکھتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو میں ذکری ہوں ص ۷، ۳۷ تا ۳۹)

ذکری مذہب اور زکوٰۃ :

شرعی زکوٰۃ کے بھی ذکری منکر ہیں۔ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر زکوٰۃ کم از کم دسواں حصہ مقرر کر رکھا ہے اور زکوٰۃ کا مصرف صرف ان کا مذہبی پیشوا ہو سکتا ہے اور کسی کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ گویا ذکریوں کی زکوٰۃ دس فیصد ٹیکس یا بھتہ ہے جو مذہبی پیشواؤں کو دیا جاتا ہے۔ (قصص الغیبی ص ۴۸)

ذکری مذہب اور حجِ بیت اللہ

ذکری مذہب کے نزدیک حج بیت اللہ کی فرضیت منسوخ ہے اور اس

کا قائم مقام اگرچہ ذکراللہ ہے۔ تاہم وہ اس کے بدلے ۲۷ر رمضان اور
ور ذی الحجہ کو ہر سال کوہِ مراد تربت میں جاکر حج کرتے ہیں۔ کوہِ مراد
کے بارے میں پیچھے ہم ذکریوں کی عبارات نقل کرچکے ہیں۔ انہیں
دیکھ لیا جائے۔ قلمی نسخہ شے محمد قصرقندی میں ہے کہ:

"اگر ترا پرسند کہ چہ روز بود کہ حضرت مہدی از
مدینہ روانہ شد۔ بگو کہ آں روز عید بود کہ بر نمازیاں حج
فرض شد و بر ذگریاں ذکر فرض آمد"

(موسیٰ نامہ ص ۱۳۴)

ترجمہ: اگر تم سے پوچھا جائے کہ وہ کونسا دن تھا کہ مہدی
مدینہ سے روانہ ہوئے تو جواب میں کہہ دو کہ وہ عید کا دن
تھا وہ دن جس میں نماز پڑھنے والوں پر حج فرض ہوا اور
ہم ذکریوں پر ذکر فرض ہوا۔"

اس میں صاف اقرار ہے کہ ذکریوں پر حج فرض نہیں ہے اور یہی حج
کا انکار ہے۔

گزارش ہے کہ ان تفصیلات کی موجودگی میں ذکری مذہب اور اس
کے ماننے والوں کے بارے میں درج ذیل سوالات کے جواب دے کرامت
مسلمہ کو ایک گمراہ و کافر فرقہ کے دھوکہ اور تلبیسات سے نجات دلانے میں اپنا
مذہبی کردار ادا فرمائیں:

۱۔ کیا ذکری مذہب کے ماننے والے کافر ہیں یا ان کو مسلمان کہا جاسکتا ہے؟

۲۔ چونکہ وہ قرآن کو منزل من اللہ مانتے ہیں تو کیا اس لحاظ سے ان کو
اہلِ کتاب کہا جاسکتا ہے؟

۳۔ کیا ان کو رشتہ دینا یا ان سے رشتہ لینا جائز ہے اور ان کے ذبیحہ کا
کیا حکم ہے؟

۴۔ مندرجہ سوال ۳ کے مطابق معلوم ہو جانے کے بعد اور بتائے جانے

کے باوجود مسلمان مرد یا عورت اپنا رشتۂ مناکحت ذکری عورت یا مرد سے توڑنے کو تیار نہ ہو تو شریعتِ اسلام میں ان کا کیا حکم ہے؟

۵۔ کیا ذکریوں کے ساتھ دوستی کا تعلق رکھنا جائز ہے؟ مسلمانوں میں سے جو شخص ان کے ساتھ خصوصی دوستی کا تعلق رکھے اس کا شرعاً کیا حکم ہے!

بینوا بالدلیل والبرھان اجرکم الرحمٰن

السائل
احتشام الحق آسیا آبادی
خادم جامعہ رشیدیہ آسیا آباد
تربت ۔ مکران ۔ بلوچستان

۱۸ر صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ،

استفتاءً میں ذکری مذہب کے جو عقائد و نظریات ان کی مستند کتابوں کے حوالہ سے ذکر کئے گئے ہیں اور جن کے بارے میں ذکری مذہب کے لوگ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی ان کے یہی عقائد ہیں، ان کی روشنی میں ذکریوں کا معاملہ بالکل واضح ہے کہ ذکری مذہب' اسلام سے بالکل الگ اور جداگانہ مذہب ہے۔ اور اسلام کا ذکریوں سے، اور ذکریوں کا اسلام سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں۔

مناسب ہوگا کہ حسبِ ذیل چند نکات کے ضمن میں ان دونوں کی جداگانہ حیثیت کو نمایاں کر دیا جائے۔

(۱)

ملا محمد اٹکی کے بارے میں ذکری مذہب یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کی ولادت معروف انسانی طریقے سے نہیں ہوئی بلکہ وہ 'نورِ خدا' تھا جو آسمان سے آیا' اور آسمان ہی کی طرف چلا گیا، چنانچہ ذکریوں کے اس عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"نورے بود، بعالم بالا رفت۔"

یہی وجہ ہے کہ ذکری مذہب کے لوگ نہ ملّا محمد اٹکی کی ولادت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کہاں ہوئی۔ نہ اس کے والدین کا پتہ بتاتے ہیں کہ اس کے ماں باپ کون تھے؟ اور اس کا نسب نامہ کیا تھا؟ نہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کی وفات کہاں ہوئی؟ کس نے اس کی تجہیز و تکفین کی؟ کس نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی اور اسے کہاں دفن کیا گیا؟ ذکری مذہب کے لوگ صرف یہ بتاتے ہیں کہ ملّا محمد اٹکی خدا تعالیٰ کا نور تھے۔ فلاں تاریخ کو اس "نور کا ظہور" ہوا، اور فلاں تاریخ کو یہ "نور" غائب ہوگیا ــــ اور یہ ٹھیک وہی عقیدہ ہے جو فرقہ باطنیہ کا اپنے اماموں کے بارے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اماموں میں حلول کرتا ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے۔ چنانچہ حافظ ابنِ حزمؒ "کتاب الفصل" میں لکھتے ہیں:

"واما من قال ان اللّٰہ عزّ وجلّ ھو فلان لانسان بعینہٖ، او انّ اللّٰہ تعالیٰ یحل فی جسم من اجسام خلقہ، او ان بعد محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم نبی غیر عیسیٰ بن مریم فانہ لا یختلف اثنان فی تکفیرہ۔"

(کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل ــ ص ۲۴۹-۲۵۰ ج ۳)

"جس شخص نے کسی انسان کو کہا کہ یہ اللہ ہے یا یہ کہا کہ اللہ اپنی خلقت کے اجسام میں سے کسی جسم میں حلول کرتا ہے یا یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے، سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے، پس ایسے شخص کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کا بھی اختلاف نہیں۔"

قاضی عیاضؒ 'الشفا' میں لکھتے ہیں:

"فذالک کلہ کفر باجماع المسلمین........ وکذالک من ادّعیٰ مجالسۃ اللّٰہ والعروج الیہ ومکالمتہ اوحلولہ فی احد الاشخاص کقول بعض المتصوفۃ والباطنیۃ والنصاریٰ والقرامطۃ۔"

(الشفاء ص ۲۴۵ ج ۲)

پس یہ باتیں تمام مسلمانوں کے اجماع سے کفر ہیں ..... اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم نشینی کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف عروج کرنے کا اور اس سے ہمکلامی کا دعویٰ کرے، یا کسی شخص میں اللہ تعالیٰ کے حلول کا دعویٰ کرے، جیسا کہ بعض بناوٹی صوفی باطنیہ، نصاریٰ اور قرامطہ کا دعویٰ ہے۔ وہ بھی باجماعِ امت کافر ہے۔"

۲

اسلامی عقیدہ کی رُو سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا ہے چنانچہ اسلامی عقائد کی کتابوں میں صراحۃً درج ہے:

"اوّل الانبیاء آدم و آخرھم محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔"

(شرح عقائد نسفی ص۱۳۵)

"سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

ختم نبوت کا عقیدہ قرآنِ کریم کی آیت خاتم النبیین احادیث متواترہ اور امت کے قطعی اجماع سے ثابت ہے۔ اس کی تفصیل اس ناکارہ کے رسالہ "عقیدۂ ختم نبوت: قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت کی روشنی میں" آچکی ہے وہاں ملاحظہ فرما لی جائے۔ بطور نمونہ یہاں چند احادیث درج کرتا ہوں:

۱۔ عن سعد بن ابی وقاص عن ابیہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلیّ انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الّا انہ لا نبیّ بعدی ـــــ وفی روایۃ المسلم۔ الّا انہ لا نبوۃ بعدی۔"

"سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا' تم مجھ سے وہی نسبت رکھتے ہو جو ہارون کو موسیٰ (علیہما السلام) سے تھی۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ میرے بعد نبوت نہیں۔"

(صحیح بخاری ص ۶۳۳ ج ۲' صحیح مسلم ص ۲۷۸ ج ۲ واللفظ لہ)

یہ حدیث متواتر ہے اور حضرت سعدؓ کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ کرامؓ کی جماعت سے بھی مروی ہے:

۱۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ (مسند احمد ص ۳۳۸ ج ۳۔ ترمذی ص ۲۱۴ ج ۲ ابن ماجہ ص ۱۲)

۲۔ حضرت عمرؓ (کنزالعمال ص ۶۰۷ ج ۱۱ حدیث نمبر ۳۲۹۳۴)

۳۔ حضرت علیؓ (کنز ص ۱۵۸ ج ۱۳ حدیث نمبر ۳۶۴۸۸۔ مجمع الزوائد ص ۱۱۱ ج ۹)

۴۔ اسمار بنت عمیسؓ (مسند احمد ص ۴۳۸ ج ۶، مجمع ص ۱۰۹ ج ۹، کنز ص ۶۰۷ ج ۱۱ حدیث ۳۲۹۳۷)

۵۔ ابوسعید خدریؓ (مجمع الزوائد ص ۱۰۹ ج ۹، کنز ص ۶۰۳ ج ۱۱ حدیث ۳۲۹۱۵)

۶۔ ابو ایوب انصاریؓ (مجمع الزوائد ص ۱۱۱ ج ۹)

۷۔ جابر بن سمرہؓ (ایضاً ص ۱۱۰ ج ۹)

۸۔ ام سلمہؓ (ایضاً ص ۱۰۹ ج ۹)

۹۔ برار بن عازبؓ
۱۰۔ زید بن ارقمؓ
} (مجمع ص ۱۱۱ ج ۹)

۱۱۔ عبداللہ بن عمرؓ (مجمع ص ۱۱۰ ج ۹، خصائص کبریٰ سیوطی ص ۲۴۹ ج ۲)

۱۲۔ حُبشی بن جُنادہؓ (مجمع ص ۱۰۹ ج ۹، کنز ص ۱۹۲ ج ۱۳، حدیث نمبر ۳۶۵۷۲)

۱۳۔ مالک بن حسن بن حویرثؓ (کنز ص ۶۰۶ ج ۱۱ حدیث نمبر ۳۲۹۳۲)

۱۴۔ زید بن ابی اوفیٰؓ (کنز ص ۱۰۵ ج ۱۳ حدیث نمبر ۳۶۳۴۵)

واضح رہے کہ جو حدیث دس سے زیادہ صحابہ کرامؓ سے مروی ہو' حضرات محدثین اسے احادیث متواترہ میں شمار کرتے ہیں' چونکہ یہ حدیث دس سے زیادہ صحابہ کرامؓ

سے مروی ہے اس لیے مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس کو متواترات میں شمار کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ ازالۃ الخفا میں "مآثر علیؓ" کے تحت لکھتے ہیں:

"فمن المتواتر: انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسٰی"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم ص ۴۴۴ ج ۴ مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی)

"متواتر احادیث میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ "تو میرے لیے اس مرتبہ میں ہے جس مرتبہ میں ہارونؑ تھے بہ نسبت موسیٰؑ کے"۔

۲۔ "عن ثوبان قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم......... انہ سیکون فی اُمّتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیّین لا نبی بعدی"۔

(ابوداؤد ص ۲۲۷ ج ۲، ترمذی ص ۴۵ ج ۲)

"حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہونگے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی کسی قسم کا نبی نہیں"۔

یہ مضمون بھی متواتر ہے اور حضرت ثوبانؓ کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے:

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ (صحیح بخاری ص ۵۰۹ ج ۱، صحیح مسلم ص ۳۹۷ ج ۲)

۲۔ حضرت نعیم بن مسعودؓ (کنزالعمال ص ۱۹۸ ج ۱۴، حدیث نمبر ۳۸۳۷۲)

۳۔ حضرت ابوبکرہؓ (مشکل الآثار ص ۱۰۴ ج ۴)

۴۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (فتح الباری ص ۶۱۷ ج ۶ حدیث نمبر ۳۶۰۹)

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ (فتح الباری ص ۸۷ ج ۱۳ حدیث نمبر ۷۱۲۱)

۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

۷۔ حضرت علیؓ (فتح الباری ص ۸۷ ج ۱۲ حدیث نمبر ۱۲۱)

۸۔ حضرت سمرہؓ 〃

۹۔ حضرت حذیفہؓ 〃

۱۰۔ حضرت انسؓ 〃

۱۱۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ (مجمع الزوائد)

مجمع الزوائد میں (ص ۳۳۲۔۳۳۴ ج ۷) ان تمام احادیث کا متن ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ "عن انس بن مالك رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدى ولا نبى"

(ترمذی ص ۵۱ ج ۲، وقال حدیث صحیح مسند احمد ص ۲٦۷ ج ۳)

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسالت و نبوت ختم ہو چکی ہے پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی"

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس کو امام احمدؒ نے مسند میں بھی روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس حدیث میں بروایت ابو یعلیٰ اتنا اضافہ نقل کیا ہے:

"ولكن بقيت المبشرات؟ قالوا ما المبشرات، قال رؤيا المؤمن جزء من اجزاء النبوة"

(فتح الباری ص ۳۷۵ ج ۱۲)

"لیکن مبشرات باقی رہ گئے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا مومن کا خواب جو نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے"

اس مضمون کی حدیث مندرجہ ذیل صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہے:

۱۔ حضرت ابوہریرۃؓ (صحیح بخاری ص ۱۰۳۵ ج ۲)

۲۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ (کنز ص۳۷ ج۱۵ حدیث نمبر ۳۸۱۹۱۲، مجمع ص ۱۷۲ ج ۷)

۳۔ حضرت حذیفہ بن اسیدؓ (حوالہ بالا)

۴۔ حضرت ابن عباسؓ (مسلم ص۱۹۱ ج۱، نسائی ص۱۶۸ ج۱، ابوداؤد ص۱۲۷ ج۱، ابن ماجہ ص۲۷۸)

۵۔ حضرت ام کرز الکعبیہؓ (ابن ماجہ ص ۲۷۸، احمد ص ۳۸۱ ج ۶، فتح الباری ص۳۷۵ ج۱۲)

۶۔ حضرت ابوالطفیلؓ (مسند احمد ص ۴۵۴ ج ۵، مجمع الزوائد ص ۱۷۳ ج ۷)

۴۔ متعدد احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

"بعثت انا والساعة کهاتین۔"

"مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح بھیجا گیا ہے۔"

اس مضمون کی احادیث مندرجہ ذیل حضرات سے مروی ہیں:

۱۔ سہل بن سعدؓ (بخاری ص ۹۶۳ ج ۲، مسلم ص ۴۰۶ ج، ترمذی)

۲۔ ابوہریرۃؓ (بخاری ص ۹۶۳ ج ۲)

۳۔ انس بن مالکؓ (بخاری ص ۹۶۳ ج ۲)

۴۔ مستورد بن شدادؓ (ترمذی ص ۴۴ ج ۲)

۵۔ جابر بن عبداللہؓ (مسلم ص ۲۸۴ ج ۱، نسائی ص ۲۳۴ ج ۱)

۶۔ سہل بن حنیفؓ (جامع الاصول ص ۳۸۵ ج ۱۰)

۷۔ بریدہؓ (مسند احمد ص ۳۴۸ ج ۵)

۸۔ ابی جبیرہؓ (مجمع الزوائد ص ۳۱۲ ج ۱۰)

۹۔ جابر بن سمرہؓ (مسند احمد ص ۱۰۳ ج ۵)

۱۰۔ وہب السوائیؓ (مجمع الزوائد ص ۳۱۱ ج ۱۰)

۱۱۔ ابوجحیفہؓ (کنز ص ۱۹۵ ج ۱۴، مسند احمد ص ۳۰۹ ج ۴)

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قیامت کے درمیان اتصال ذکر کیا گیا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری قربِ قیامت کی علامت ہے اور اب قیامت تک آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

چنانچہ امام قرطبیؒ "تذکرہ" میں لکھتے ہیں:

"واما قوله 'بعثت انا والساعة كهاتين' فمعناه انا النبي الأخير فلا يليني آخر، وانما تليني القيامة كما تلي السبابة الوُسطىٰ وليس بينهما اصبع اخرى....... وليس بيني وبين القيامة نبي۔"

(التذکرۃ فی احوال الموتیٰ وامور الآخرۃ۔ ص ۷۱۱)

"اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی کہ: "مجھے اور قیامت کو ان دو (انگلیوں) کی طرح بھیجا گیا ہے"۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں آخری نبی ہوں میرے بعد اور کوئی نبی نہیں، میرے بعد بس قیامت ہے جیسا کہ انگشتِ شہادت درمیانی انگلی کے متصل واقع ہے۔ دونوں کے درمیان اور کوئی انگلی نہیں...... اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نبی نہیں۔"

علامہ سندھیؒ حاشیۂ نسائی میں لکھتے ہیں:

"التشبيه في المقارنة بينهما، اى ليس بينهما اصبع اخرىٰ كما انه لا نبي بينه صلى الله عليه وسلم وبين الساعة۔" (سنن نسائی ص ۲۳۴ ج ۱)

"تشبیہ دونوں کے درمیان مقارنت میں ہے یعنی جس طرح ان دونوں کے درمیان کوئی اور انگلی نہیں، اسی طرح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور قیامت کے درمیان اور کوئی نبی نہیں۔"

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری نبی ہونا قرآن کریم احادیث متواترہ اور اُمّت کے قطعی اور مسلسل اجماع سے ثابت ہے اس لیے جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم نہ کرے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کسی نبی کی بعثت کو جائز رکھے' وہ اسلامی عقیدہ کی رُو سے قطعاً کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے کیونکہ وہ اس قطعی عقیدہ کا انکار کرکے قرآن کریم کی تکذیب کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتا ہے اور پوری اُمّتِ اسلامیہ کی تکذیب کرتا ہے۔

اس کے برعکس ذکری مذہب کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملّا محمد اٹکی کی نبوت و رسالت کے قائل ہیں۔ لہٰذا جس طرح قادیانی مذہب کے لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی و رسول ماننے کی وجہ سے باجماعِ اُمّت دائرۂ اسلام سے خارج اور پاکستان کے آئین کی رُو سے ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے گئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ذکری مذہب کے لوگ بھی ملّا محمد اٹکی کو نبی و رسول ماننے کی وجہ سے باجماعِ امّت دائرۂ اسلام سے خارج ہیں اور پاکستان کے آئین کی رُو سے غیر مسلم اقلیت ہیں۔

ان لوگوں کے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہونے پر چاروں مذاہب کے فقہاء کے فتاویٰ نقل کرتا ہوں:

فقہ حنفی:

۱۔ الاشباہ والنظائر میں ہے:

اذا لم یعرف ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم

آخر الانبیاء فلیس بمسلم، لانہ من الضروریات "۔

(الاشباہ والنظائر ص ۲۹۶ من اواخر کتاب السیر من الفن الثانی)

"اور جب کوئی شخص یہ نہ جانتا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں، کیونکہ یہ عقیدہ ضروریاتِ دین میں سے ہے (اور ضروریاتِ دین کا منکر کافر ہے)"۔

۲۔ شرح 'فقہ اکبر' میں ہے:

"دعوی النبوۃ بعد نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کفر بالاجماع"۔

(شرح فقہ اکبر ص ۲۰۲)

"ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعویٰ نبوت بالاجماع کفر ہے"۔

فقہ مالکی:

۱۔ قاضی عیاضؒ مالکی 'الشفاء' میں لکھتے ہیں:

"او من ادعی النبوۃ لنفسہ او جوز اکتسابھا والبلوغ بصفاء القلب الی مرتبتھا کالفلاسفۃ و غلاۃ المتصوفۃ۔

و کذالک من ادعی منھم انہ یوحی الیہ و ان لم یدع النبوۃ او انہ یصعد الی السماء و یدخل الجنۃ و یاکل من ثمارھا و یعانق الحور العین فھٰؤلاء کلھم کفار مکذبون للنبی صلی اللہ علیہ وسلم"۔

(الشفاء ص ۲۴۷ ج ۲)

"اسی طرح وہ شخص بھی قطعاً کافر ہے جو اپنی ذات کے لیے نبوت کا دعویٰ کرے یا نبوت کے حصول کو اور قلب کی صفائی کے ذریعہ مرتبۂ نبوت تک پہنچنے کو جائز رکھے

جیسے فلاسفہ اور غالی صوفیہ۔

اور اسی طرح جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کی طرف وحی آتی ہے (خواہ صراحۃً نبوت کا دعویٰ نہ کرے) یا یہ دعویٰ کرے کہ وہ آسمان پر چڑھتا ہے یا جنّت میں داخل ہوتا ہے، جنّت کے پھل کھاتا ہے اور جنّت کی حوروں سے معانقہ کرتا ہے۔ پس یہ سب کافر ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں۔"

۲۔ فقہ مالکیؒ کی کتاب منح الجلیل شرح مختصر الخلیل میں بھی اسی کی مثل ہے۔

(دیکھئے ص ۲۱۰ ج ۹)

۳۔ علّامہ زرقانی مالکیؒ شرح مواہب میں امام ابن حبّانؒ سے نقل کرتے ہیں:

" من ذهب الى ان النبوة مكتسبة لا تنقطع او الىٰ ان الولی افضل من النبی فهو زندیق یجب قتله لتكذيبه القرآن وخاتم النبیین۔" (شرح مواہب ص ۱۸۸ ج ۶)

"جس شخص کا یہ مذہب ہو کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں بلکہ نبوت حاصل ہو سکتی ہے یا یہ کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے ایسا شخص زندیق اور واجب القتل ہے کیونکہ یہ شخص قرآن کریم کی آیت خاتم النبیین کی تکذیب کرتا ہے۔"

فقہ شافعیؒ:

۱۔ فقہ شافعیؒ کی مستند کتاب 'مغنی المحتاج' شرح منہاج میں ہے:

" (او) نفى (الرسل) بان قال لم يرسلهم الله او نفى

نبوة نبیؐ او ادّعی نبوة بعد نبیّنا صلی اللّٰہ علیه وسلم
او صدق مدّعیها او قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اسود
او امرد او غیر قرشی او قال النبوة مکتسبة او تنال
رتبتها بصفاء القلوب او اوحی الیّ و لم یدع نبوة
(او کذّب رسولاً او نبیاً) او سبّه او استخف به او باسمه
او باسم اللّٰہ (کفر) ۔"

(مغنی المحتاج ص ۱۳۵ ج ۴)

"یا کوئی شخص رسولوں کی نفی کرے اور یوں کہے کہ اللّٰہ
تعالیٰ نے ان کو نہیں بھیجا یا کسی خاص نبی کی نبوت کا انکار کرے
یا ہمارے نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے
یا مدعی نبوت کی تصدیق کرے یا یہ کہے کہ نبی کریم صلی اللّٰہ
علیہ وسلم (نعوذ باللّٰہ) کالے تھے یا بے ریش تھے، یا قریشی
نہیں تھے، یا یہ کہے کہ نبوت حاصل ہوسکتی ہے یا قلب کی
صفائی کے ذریعہ نبوت کے رتبے کو پہنچ سکتے ہیں یا نبوت کا
دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ کہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے یا کسی
رسول و نبی کو جھوٹا کہے یا نبی کو بُرا بھلا کہے یا کسی نبی کی تحقیر
کرے یا اللّٰہ تعالیٰ کے نام کی تحقیر کرے تو ان سب صورتوں
میں کافر ہو جائے گا۔"

۲۔ نہایۃ المحتاج بھی فقہ شافعیؒ کی مستند کتاب ہے اور اس میں بھی اسی کی مثل
ہے۔ (دیکھئے ص ۴۱۵ ج ۷)

فقہ حنبلیؒ :

۱۔ فقہ حنبلیؒ کی مستند کتاب المغنی لابن قدامہؒ میں ہے :

"ومن ادّعی النبوة او صدق من ادعاها فقد ارتد لان مسیلمة لما ادعی النبوة فصدقه قومه صاروا بذالك مرتدین وکذالك طلیحة الاسدی و مصدقوه۔ و قال النبی صلی الله علیه وسلم" لا تقوم الساعة حتی یخرج ثلاثون کذابون کلهم یزعم انه رسول الله"

(المغنی مع الشرح الکبیر ص ۱۱۲ ج ۱۰)

"جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے یا مدعی نبوت کی تصدیق کرے وہ مرتد ہے، کیونکہ مسیلمہ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کی قوم نے اس کی تصدیق کی تو وہ اس کی وجہ سے مُرتد قرار پائے۔ اسی طرح طُلَیحہ اسدی اور اس کے تصدیق کنندگان بھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تیس جھوٹے نکلیں گے، ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ رسول اللہ ہے۔"

۲۔ الشرح الکبیر شرح المقنع بھی فقہ حنبلی کا مستند فتاویٰ ہے اور اس میں بھی لفظ بلفظ وہی عبارت ہے جو مغنی ابن قدامہ سے اوپر نقل کی گئی ہے۔

۳۔ علامہ سفارینی حنبلی "شرح عقیدۂ سفارینی" میں لکھتے ہیں:

"ومن زعم انها مکتسبة فهو زندیق یجب قتله لانه یقتضی اعتقاده ان النبوة لا تنقطع وهو مخالف للنص القرآنی والاحادیث المتواترة بان نبینا صلی الله علیه وسلم خاتم النبیین علیهم السلام۔"

(مختصر شرح عقیدہ سفارینی ص ۲۵۳)

" جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبوت حاصل ہو سکتی ہے
وہ زندیق اور واجب القتل ہے کیونکہ اس کا عقیدہ
اس بات کو مقتضی ہے کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں اور
یہ بات نصِ قرآن اور احادیثِ متواترہ کے خلاف ہے۔
جن سے قطعاً ثابت ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
خاتم النبین ہیں (علیہم السلام) ۔"

۳

ذکریوں نے ملّا محمد اٹکی کو نبی اور رسول کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انتہائی جسارت و دلیری اور ڈھٹائی اور بے شرمی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص مراتب اور اعلیٰ اوصاف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھین کر ملّا محمد اٹکی کی طرف منسوب کر دیا۔ مثلاً

۱۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین ہیں جبکہ ذکری عقیدہ کے مطابق ملّا محمد اٹکی خاتم النبین ہے۔

۲۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق سیّد المرسلین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ذکریوں کے نزدیک یہ منصب ملّا محمد اٹکی کے لیے ہے۔

۳۔ مسلمان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا کلمہ :

لا الٰہ الّا اللہ محمّد رسول اللہ

پڑھتے ہیں جبکہ ذکری ملّا محمد اٹکی کے نام کا کلمہ :

لا الٰہ الا اللہ نور پاک نور محمد مہدی رسول اللہ

پڑھتے ہیں۔

۴۔۔۔ مسلمانوں کے نزدیک جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتا، وہ کافر ہے اور ذکریوں کے نزدیک جو شخص ملّا اٹکی کا کلمہ نہیں پڑھتا وہ کافر ہے۔۔۔ گویا روئے زمین کے وہ اربوں کھربوں مسلمان جو ملّا محمد اٹکی کے زمانے سے آج تک پیدا ہوئے یا قیامت تک ہوں گے وہ ذکریوں کے نزدیک سب کے سب کافر ہیں۔

۵۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر بے حیائی اور ڈھٹائی یہ کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں 'محمدؐ' کا نام آیا ہے، ذکریوں کے نزدیک اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مُراد نہیں بلکہ ملّا اٹکی مُراد ہے۔۔۔ اس سے بڑھ کر کفر و الحاد اور وقاحت و بے شرمی کیا ہو سکتی ہے۔

(۴)

ذکریوں کے نزدیک ملّا محمد اٹکی کے آنے سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی پوری کی پوری شریعت منسوخ ہو چکی ہے، اس کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ ذکری لوگ دینِ اسلام کی کسی ایک چیز کے بھی قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ:

۱۔۔۔ ان کے نزدیک نماز منسوخ ہے، وہ نہ صرف یہ کہ نماز کی فرضیت کے قائل نہیں بلکہ نماز اور نمازی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

۲۔۔۔ وہ روزۂ رمضان کے قائل نہیں، بلکہ اس کی جگہ ان کی شریعت میں دوسرے دنوں کے روزے ہیں۔

۳۔۔۔ وہ اسلامی زکوٰۃ کے قائل نہیں اس کے بجائے وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو کم سے کم "دہ فیصد" کی شرح سے نذرانہ پیش کرتے ہیں اور

ان کی شریعت میں اسی کا نام "زکوٰۃ" ہے۔

۴ ـــــ وہ اسلامی حج کے قائل نہیں بلکہ ان کی شریعت میں حج کوہِ مرادؔ پر ہوتا ہے، جو اُن کے عقیدہ کیمطابق مقامِ محمود ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی شریعت کو منسوخ قرار دینے کے بعد وہ اسلام کے پانچوں ارکان یعنی :

۱۔ کلمۂ شہادت

۲۔ نمازِ پنجگانہ

۳۔ روزۂ رمضان

۴۔ زکوٰۃ ـــــ اور

۵۔ حج

سب کے مُنکر ہیں اور اسی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کے کسی حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے قائل نہیں، اس کے بعد ان کے کفر و ارتداد اور زندقہ و الحاد میں کیا شبہ رہ جاتا ہے ؟

۵

بظاہر ان کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن کریم کو مانتے ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ بھی سراسر غلط ہے کیونکہ :

۱ـــ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کے چالیس پارے تھے اُن میں سے دس پارے ملّا محمد اٹکی نے اپنے لئے چُن لیے اور ان کا نام "برہان" رکھا، اور تیس پاروں کا قرآن جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے یہ ـــــ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد ـــــ کتّوں کے سامنے ڈالی ہوئی ہڈیاں ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بے ایمان اس سے بڑھ کر قرآن کریم کی کیا توہین کر سکتا ہے ؟ اور اس سے بدتر کفر اور کیا ہو سکتا ہے ؟

۲ پھر مسلمانوں کے پاس جو قرآن ہے اس کی تاویل وتشریح کا حق بھی ملا محمد اٹکی کے پاس محفوظ ہے۔ یہ حق نہ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی صحابی وتابعی اور کسی امام ومفسّر کو کہ قرآن کریم کی کسی آیت کی تشریح وتفسیر کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسرے انداز میں قرآن کریم کو معطل قرار دینا ہے جو صریح کفروالحاد ہے۔

۳ اور پھر ملا اٹکی کی تأویل کا جو نمونہ استفتار میں پیش کیا گیا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ تأویل بجائے خود قرآن مجید کا انکار اور صریح کفروالحاد ہے۔

٦

ذکریوں کے کلام میں جس انداز سے ملا محمد اٹکی کا تقابل حضرات انبیارِ کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہایت دل آزار اور بے ہودہ ہے۔ انبیارِ کرام علیہم السلام کو (نعوذ باللہ) ملا محمد اٹکی کا نوکر چاکر قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو ملا اٹکی کا "جواہر فروش" اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو ملا اٹکی کا "بادہ فروش" کہا گیا ہے۔ اس قسم کے دل آزار کلمات جن کا اظہار ذکریوں نے بطور عقیدہ کیا ہے، خبیث ترین وجہ کفر ہے۔

الغرض ذکریوں کے مذکورہ بالا تمام عقائد کفرِ خالص ہیں، اس سلسلے میں حضرات فقہائے امّت کی چند عبارتیں نقل کرتا ہوں:

"والنصوص من الكتاب والسنة تحمل على ظواهرها ما لم يصرف عنها دليل قطعي ...... والعدول عنها اى عن الظواهر الى معان يدعيها اهل الباطن وهم

الملاحدة و سمّوا الباطنية لادعائهم ان النصوص
ليست علی ظواهرها بل لها معان باطنية لايعرفها
الا المعلم وقصدهم بذٰلك نفی الشريعة بالكلية الحاد
ای ميل وعدول عن الاسلام و اتصال و اتصاف
بكفر لكونه تكذيبا للنبی عليه السلام فيما علم مجيئه
به بالضرورة............ ورد النصوص بان ينكر
الاحكام التی دلت عليها النصوص القطعية من الكتاب
والسنة كحشر الاجساد مثلا كفر لكونه تكذيبا صريحا
لله تعالٰی و رسوله عليه السلام فمن قذف عائشة رضؓ
بالزنا كفر۔

و استحلال المعصية صغيرة كانت او كبيرة كفر
اذا ثبت كونها معصية بدليل قطعی و قد علم ذٰلك
مما سبق والاستهانة بها كفر والاستهزاء علی الشريعة
كفر لان ذٰلك من امارات التكذيب "

شرح عقائد نسفی ص ۱۶۶/۱۶۷)

"اور کتاب وسُنّت کے نصوص کو ان کے ظاہر پر محمول
کیا جائے گا۔ جب تک کہ کوئی دلیل قطعی ظاہر سے پھیرنے
والی نہ ہو، اور کتاب وسُنّت کے ظاہری معنوں کو چھوڑ کر وہ
معنیٰ مراد لینا، جن کا اہل باطن ملاحدۂ باطنیہ دعویٰ کرتے ہیں،
یہ الحاد ہے یعنی اسلام سے انحراف اور کفر سے اتصال و
اتصاف ہے، کیونکہ ان معنوں کے مُراد لینے میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے، ان امُور میں جن کے بارے
میں بالبداہت معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو
لائے تھے، ان اہلِ باطن ملحدین کو باطنیہ اس لیے کہا جاتا ہے

کیوں کہ ان کا دعویٰ ہے کہ کتاب وسنّت کے ظاہری معنیٰ مُراد نہیں بلکہ باطنی معنیٰ مراد ہیں جن کو صرف معلّم (امام) ہی جانتا ہے اور اس ادعاءٗ سے ان کا مقصد پوری کی پوری شریعت کی نفی کرنا ہے، اس لیے یہ صریح کفر ہے۔

اور نصوص کو ردّ کر دینا، بایں طور کہ جن احکام پر کتاب وسنّت کے نصوص قطعیہ دلالت کرتے ہیں، ان کا انکار کر دیا جائے، جیسے مثلاً حشر جسمانی، یہ کفر ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تکذیب ہے۔ لہٰذا جو شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ــــ نعوذ باللہ ــــ زنا کی تہمت لگائے وہ کافر ہے۔

اور کسی گناہ کو، خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، حلال سمجھنا کفر ہے جبکہ اس کا گناہ ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو، اور یہ بات اُوپر کے قاعدے سے معلوم ہو چکی ہے اور کسی گناہ کو معمولی اور حقیر سمجھنا کفر ہے اور شریعت کا مذاق اُڑانا کفر ہے کیونکہ یہ تکذیب کی علامت ہے۔"

○

"ومن لم یقر ببعض الانبیاء علیہم السلام او عاب نبیاً بشئ اولم یرض بسنة من سنن المرسلین علیہم السلام کفر"

(جامع الفصولین ص ۳۰۲ ج ۲)

"اور جو شخص انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کا اقرار نہ کرے، یا کسی نبی پر کوئی معمولی سا عیب بھی لگائے یا انبیاء علیہم السلام کی سنتوں میں سے کسی پر راضی نہ ہو تو

ایسا آدمی کافر ہوگا ۔"
بحرالرائق شرح کنز الدقائق ص ۱۳۰ ج ۵ پر بھی یہی عبارت دیکھی جا سکتی ہے۔

○

قال انا رسول اللہ او من پیغمبرم ویرید بہ پیغام می برم کفر ۔"

(جامع الفصولین ص ۳۰۳ ج ۲)

"جو شخص یہ کہے کہ میں رسول اللہ ہوں یا کہے کہ میں پیغمبر ہوں اگرچہ اس سے پیغام پہنچانا مراد ہو تب بھی وہ کافر ہوگا ۔"

○

" قال عند مجئی شهر رمضان آمد آن ماہ گراں او قال جاء الضیف الثقیل یکفر ۔"

(جامع الفصولین ص ۳۰۶ ج ۲)

"رمضان کی آمد پر اگر کسی نے کہا کہ "ماہ گراں" آ گیا یا یہ کہا کہ بھاری مہمان آ گیا تو کافر ہوگیا۔

○

" قولہ ـــــ لا اصلی اذ لا تجب علی یکفر فیہ ۔"

(جامع الفصولین ص ۳۰۶ ج ۲)

"کسی (مکلف شخص) نے یہ کہا کہ میں اس لیے نماز نہیں پڑھتا کہ نماز مجھ پر فرض نہیں ہے تو اس کہنے سے کافر ہوگا ۔"

○

"و بعیبه ملکا من الملائکة او الاستخفاف به"
(البحر الرائق ص ۱۳۱ ج ۵)
"یعنی فرشتوں میں سے کسی کو عیب لگانا یا ان کی توہین کرنا کفر ہے۔"

○

"بقرأة القاری یا یها الناس قد جاءکم برهان من ربکم مریداً مدرساً اسمه ابراهیم"
(البحر الرائق ص ۱۳۱ ج ۵)
"قاری نے قرآن مجید کی آیت "قد جاءکم برہان من ربکم" پڑھی اور "برہان" سے کوئی مدرس، جس کا نام ابراہیم تھا، مراد لیا تو کافر ہو جائے گا۔"

○

"(و) کفر (ب) دعوی جواز (محاربة نبی) من انبیاء الله تعالیٰ و اولی محاربته بالفعل. عیاض اجمعوا علی تکفیر من استخف بنبینا محمد صلی الله علیه و سلم او بأحد من الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام او ازری علیهم او آذاهم او قتل نبیاً او حاربه فهو کافر باجماع"
(منح الجلیل شرح مختصر الخلیل ص ۲۱۰ ج ۹)
"اور جو شخص انبیاء کرام علیہم السلام میں سے

کسی نبی کے ساتھ لڑائی کے جواز کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے اور بالفعل لڑائی کرنے سے تو بدرجۂ اولیٰ کافر ہوگا۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں جو شخص ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یا انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی کی شان میں بےادبی کرے، یا ان پر عیب لگائے، یا ان کو ایذا دے، یا کسی نبی کو قتل کرے یا اس سے لڑائی کرے، ایسا شخص بالاجماع کافر ہے۔"

○

"(او) كفر بان (استحل) محرماً مجمعاً على تحريمه معلوماً من الدين (كالشرب) للخمر والزنا والسرقة و القذف والربا و انكر حل البيع واكل الثمار و وجوب الصلاة والصوم ولو على ولي مكلف، او وجود مكة او البيت او المدينة او المسجد الحرام او الاقصى او استقبال الكعبة او صفة الحج او الصلوات او حرفاً من القرآن او زاده او غيره او اعجازه او الثواب والعقاب۔ عياض اجمع المسلمون على تكفير كل من استحل القتل او شرب الخمر او شيئاً مما حرمه الله تعالى بعد علمه بتحريمه كأصحاب الاباحة من القرامطة و بعض غلاة المتصوفة"

(منح الجليل شرح مختصر الخليل ص ۲۱۰ ج ۹)

"جو شخص کسی ایسے حرام کو حلال سمجھے، جس کا حرام ہونا اجماعی ہو اور دین سے قطعی طور پر معلوم ہو،

وہ کافر ہے۔ جیسے شراب نوشی، زنا، چوری، تہمت لگانا اور سود کھانا ــــ اور جو شخص بیع کے حلال ہونے کا، پھل کھانے کے جواز کا منکر ہو یا نماز روزہ کی فرضیت کا منکر ــــ خواہ کسی ولی مکلف کے حق میں ــــ یا وجودِ مکہ کا منکر ہو یا بیت اللہ کا منکر ہو یا مدینہ کا منکر ہو یا مسجدِ حرام کا منکر ہو یا مسجد اقصیٰ کا منکر ہو یا استقبالِ کعبہ کا منکر ہو یا حج کے معروف طریقہ کا منکر ہو یا نمازوں کا منکر ہو یا قرآنِ کریم کے کسی حرف کا منکر ہو یا کسی حرف کو زیادہ کرے یا تبدیل کرے یا قرآن کے اعجاز کا منکر ہو یا ثواب و عذاب کا منکر ہو، یہ سب لوگ کافر ہیں۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اجماع ہے ہر اس شخص کے کافر قرار دیئے جانے پر جو قتل کو، شراب نوشی کو یا کسی ایسی چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، حلال سمجھے جبکہ اس کو حرام ہونے کا علم ہو جیسے اباحتی لوگ قرامطہ اور بناوٹی صوفیوں میں سے حرام کو حلال سمجھتے ہیں، یہ سب کافر ہیں۔"

○

"كذالك وقع الاجماع على تكفير كل من دافع نص الكتاب او خص حديثا مجمعاً على نقله مقطوعا به مجمعاً على حمله على ظاهره."

(الشفا ص ۲۴۷ ج ۲)

"اسی طرح ہر وہ شخص جو کتاب اللہ کی صریح نص کا انکار

کرے یا کسی ایسی حدیث میں تخصیص کرے جس کے نقل پر اجماع ہو اور اس بات پر بھی اجماع ہو کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ ایسے شخص کے کافر ہونے پر اجماع قائم ہے۔"

○

"وكذلك نقطع بتكفير كل قائل قال قولاً يتوصل به الى تضليل الأمة و تكفير جميع الصحابة. كقول الكميلية من الرافضة بتكفير جميع الامة بعد النبي صلى الله عليه وسلم اذ لم تقدم عليا وكفرت عليا اذ لم يتقدم و يطلب حقهٗ في التقديم فهٰؤلاء قد كفروا من وجوه لانهم ابطلوا الشريعة بأسرها اذ قد انقطع نقلها و نقل القرآن اذ ناقلوه كفرة على زعمهم"

(الشفا ص ۲۴۷ ج ۲)

"اور اسی طرح ہم ایسے شخص کو قطعی کافر قرار دیتے ہیں جس کے قول سے پوری امت اور تمام صحابہ کی تکفیر لازم آتی ہو جیسے رافضیوں کا فرقہ کمیلیہ قائل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پوری امت کافر ہو گئی تھی کیونکہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہیں بنایا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی کافر قرار دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور اپنا حق خلافت طلب نہیں کیا۔ پس اس فرقہ کے لوگ چند وجوہ سے کافر ہیں ،

کیونکہ انہوں نے پوری شریعت کو باطل کر دیا کیونکہ جب ان کے عقیدہ کے مطابق شریعت اور قرآن کے ناقلین کافر ٹھہرے تو شریعت اور قرآن کا ثبوت ناقابلِ اعتبار ٹھہرا۔"

○

"و کذلك نقطع بتکفیر کل من کذب و انکر قاعدةً من قواعد الشرع وما عرف یقیناً بالنقل المتواتر من فعل الرسول و وقع الاجماع المتصل علیه کمن انکر وجوب الصلوات الخمس و عدد رکعاتها و سجداتها و یقول انما اوجب اللّٰه علینا فی کتابه الصلوٰة علی الجملة وکونها خمساً و علیٰ هذه الصفات والشروط لا اعلمه اذ لم یرد فیه فی القرآن نص جلی والخبر به عن الرسول صلی اللّٰه علیه وسلم خبر واحد۔"

(الشفا ص ۲۴۸ ج ۲)

"اسی طرح ہم ایسے شخص کو قطعی کافر قرار دیتے ہیں جو شریعت کے کسی قاعدہ کی اور شریعت کے کسی ایسے امر کی تکذیب و انکار کرے جو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے فعل سے نقل متواتر کے ساتھ ثابت ہو اور اس پر اجماع مسلسل چلا آتا ہو مثلاً کوئی شخص نمازِ پنجگانہ کا انکار کرے، یا اس کی رکعات کی تعداد اور سجدوں کا انکار کرے اور یہ کہے کہ "اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں

نماز کو مجمل واجب کیا ہے لیکن نمازوں کا پانچ ہونا اور ان کو ان صفات و شروط کے ساتھ ادا کرنا ' میں اس کو نہیں جانتا کیونکہ اس میں قرآن کی کوئی نص جلی وارد نہیں ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث خبر واحد ہے"۔ ایسا شخص قطعی کافر ہے"

○

"(فصل) (و تارك الصلوٰة) المعهودة الصادقة باحدي الخمس (على ضربين احدهما ان يتركها) و هو مكلف (غير معتقد لوجوبها فحكمه) أى التارك لها (حكم المرتد) و سبق قريباً بيان حكمه"

(فتح القریب المجیب فی شرح الفاظ التقریب للعلامہ محمد بن قاسم الغزی ص۶۲)

"اور نماز پنجگانہ میں سے کسی ایک نماز کے تارک کی دو قسمیں ہیں ' ایک یہ کہ باوجود عاقل و بالغ ہونے کے وہ نماز کو اس لیے ترک کرتا ہے کہ اس کے وجوب کا قائل ہی نہیں تو اس کا حکم مرتد کا ہے اور مرتد کا حکم ابھی اوپر گزر چکا ہے........"

○

"و من سب الله تعالىٰ كفر سواء كان مازحاً او جاداً و كذالك من استهزأ بالله تعالىٰ او بآياته او

برسله او کتبه قال اللہ تعالیٰ (ولئن سألتهم لیقولن انّما کنا نخوض و نلعب قل اباللہ و آیاته و رسوله کنتم تستهزءون ۔ لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم) و ینبغی ان لا یکتفی من الهازئ بذالك بمجرد الاسلام حتی یؤدب ادباً یزجره عن ذٰلك فانه اذا لم یکتف ممن سبّ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بالتوبة فممّن سبّ اللہ تعالیٰ اولیٰ ۔"

(مغنی ابنِ قدامہ مع الشرح الکبیر ص ۱۱۳ ج ۱۰)

"جو شخص اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) گالی دے، وہ کافر ہے، خواہ بطور مزاح ایسا کرے یا واقعی سچ مچ ۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کا یا اس کی آیات کا یا اس کے رسولوں کا یا اس کی کتابوں کا مذاق اڑائے وہ بھی کافر ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اور اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہیں گے کہ ہم تو یونہی دل لگی اور ہنسی کھیل کر رہے تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ سے اس کی آیات اور اس کے رسول سے ہنسی کر رہے تھے؟ بہانے نہ بناؤ، تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو۔" اور چاہیئے کہ ایسے ہنسی کرنے والے کے صرف اسلام لانے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کو عقل سکھانے کے لیے کچھ سزا بھی دی جائے تاکہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ناشائستہ الفاظ کہنے والے کی توبہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا تو جو شخص اللہ تعالیٰ کے حق میں گستاخانہ الفاظ کہے وہ بدرجۂ اولیٰ تعزیر کا مستحق ہوگا۔"

مندرجہ بالا تصریحات سے آپ کے تمام سوالوں کا جواب اجمالاً معلوم ہوجاتا ہے، تاہم مناسب ہوگا کہ ان کا الگ الگ جواب لکھا جائے۔

(۱)

اوپر معلوم ہوچکا کہ جو شخص دینِ اسلام کے قطعی مسائل اور شرائع اسلام میں سے کسی ایک کا منکر ہو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکذّب اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ ذکری لوگ دینِ اسلام کی ایک دو باتوں کے نہیں بلکہ پورے کے پورے دینِ اسلام کے منکر ہیں۔ ختمِ نبوت کے وہ قائل نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے قیامت تک رہنے کے وہ قائل نہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے وہ منکر ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ کو کلّی طور پر منسوخ اور معطل قرار دیتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے کے بجائے ملّا محمد اٹکی کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں، اس لیے ان کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے میں ذرا بھی تردد نہیں۔ یہ لوگ بلاشبہ کافر و زندیق ہیں اور جو شخص ان کے عقائد و نظریات سے واقف ہونے کے بعد بھی ان کے کفر و زندقہ میں تردد کرے وہ بھی قطعی کافر ہے کیونکہ اس کے نزدیک ذکریوں کی کفریات بھی اسلام ہیں اور جو شخص کفر کو اسلام یا اسلام کو کفر سمجھے اس کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہے؟

(۲)

ذکری مذہب کے لوگوں کو "اہلِ کتاب" قرار دینا غلط ہے کیونکہ اوّل تو ذکری، قرآنِ کریم کو صحیح معنی میں منزّل من اللہ مانتے

ہی نہیں، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ قرآن کریم کے چالیس پاروں کے قائل ہیں، ان میں سے نام نہاد دس پاروں کو "برہان" کا نام دے کر اسے ملا محمد اٹکی کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، اور تیس پاروں کا یہ قرآن جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اس کو نہایت بےشرمی سے "کتوں کے آگے ڈالی ہوئی ہڈیاں" قرار دیتے ہیں۔ اس نجس اور ناپاک عقیدہ کے بعد کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ وہ قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں "اہلِ کتاب" ان قوموں کو کہا جاتا ہے جو قرآن کریم سے پہلے کی نازل شدہ کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں ــــ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اسلامی عقائد سے منحرف ہوں وہ قادیانیوں کی طرح ملحد اور زندیق ہیں اور ان کا وہی حکم ہے جو علامہ شامیؒ نے دروزیہ، تیامنہ، نصیریہ اور قرامطہ کا لکھا ہے کہ یہ واجب القتل ہیں اور ان کی توبہ قابلِ قبول نہیں۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"یعلم مما ھنا حکم الدروز و التیامنة فانھم فی البلاد الشامیة یظھرون الاسلام و الصوم والصلوٰة مع انھم یعتقدون تناسخ الارواح وحل الخمر والزنا وان الالوھیة تظھر فی شخص بعد شخص و یجحدون الحشر والصوم و الصلوٰة والحج و یقولون المسمّٰی به غیر المعنٰی المراد و یتکلمون فی جناب نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کلمات فظیعة۔ و للعلامة المحقق عبدالرحمٰن العمادی فیھم فتوٰی مطولة، و ذکر فیھا انھم ینتحلون عقائد النصیریة والاسماعیلیة الذین یلقبون بالقرامطة و الباطنیة الذین ذکرھم

صاحب المواقف:

و نقل عن علماء المذاهب الاربعة انه لا یحل اقرارهم فی دیار الاسلام بجزیة ولا غیرها۔ ولا تحل مناکحتهم ولا ذبائحهم وفیهم فتوی فی الخیریة ایضاً فراجعها۔

والحاصل انهم یصدق علیهم اسم الزندیق والمنافق والملحد، ولا یخفی ان اقرارهم بالشهادتین مع هذا الاعتقاد الخبیث لا یجعلهم فی حکم المرتد لعدم التصدیق، ولا یصح اسلام احدهم ظاهراً الا بشرط التبری عن جمیع ما یخالف دین الاسلام لانهم یدعون الاسلام و یقرون بالشهادتین۔ و بعد الظفر بهم لا تقبل توبتهم اصلاً۔"

(ردالمحتار ص ۴۴۴ ج ۴)

"یہیں سے دروزیہ اور تیامنہ کا حکم معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ شام کے علاقوں میں اسلام کا اظہار کرتے ہیں۔ نماز، روزہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ تناسخ ارواح کے قائل ہیں اور خمر اور زنا کو حلال سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ الوہیت یکے بعد دیگرے مختلف اشخاص میں ظہور کرتی ہے۔ وہ حشر و نشر، نماز، روزہ اور حج کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسمّٰی بہ معنی مراد کے علاوہ ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ناشائستہ کلمات بکتے ہیں۔ علامہ محقق

عبدالرحمٰن عماديؒ کا ان کے بارے میں ایک طویل فتویٰ ہے اس میں موصوف نے ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ نصیری اور اسمٰعیلی لوگوں کے عقائد رکھتے ہیں جن کو قرامطہ اور باطنیہ کہا جاتا ہے اور جن کا ذکر صاحبِ مواقف نے کیا ہے اور انہوں نے مذاہبِ اربعہ کے علماء سے نقل کیا ہے کہ ان کو دارالاسلام میں ٹھہرانا حلال نہیں، نہ جزیہ لے کر اور نہ اس کے بغیر، نہ ان سے رشتہ ناتا جائز ہے اور نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے ان کے بارے میں فتاویٰ خیریہ میں بھی ایک فتویٰ ہے اس کی طرف مراجعت کی جائے۔

حاصل یہ ہے کہ ان پر "زندیق" منافق اور "ملحد" کا مفہوم صادق آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان خبیث عقائد کے باوجود ان کا شہادتین کا اقرار کرنا ان کو مرتد کے حکم میں قرار نہیں دیتا، کیونکہ یہاں تصدیق مفقود ہے اور ان میں سے کوئی شخص اسلام کا اظہار کرے تو وہ قابلِ قبول نہیں جب تک کہ ان تمام عقائد سے برأت کا اظہار نہ کرے جو دینِ اسلام کے خلاف ہیں، کیونکہ وہ پہلے ہی سے اسلام کے مدعی ہیں اور شہادتین کا اقرار کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ قابو میں آجائیں تو ان کی توبہ قطعاً قبول نہیں۔"

(۳)

علامہ شامیؒ کی مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہو چکا کہ

ذکریوں کا حکم مرتدین اور زنادقہ کا ہے اور مذاہبِ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ :

۱ ـــــ یہ زندیق اور مرتد واجب القتل ہیں ۔

۲ ـــــ ان کا جنازہ جائز نہیں

۳ ـــــ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں

۴ ـــــ ان سے رشتہ لینا اور دینا جائز نہیں ۔ مرتد اور زندیق اگر مرد ہو تو اس کا نکاح نہ کسی مسلمان عورت سے ہو سکتا ہے نہ غیر مسلمہ کے ساتھ اور نہ کسی مرتدہ کے ساتھ ۔ اسی طرح جو عورت مرتد اور زندیق ہو اس کا نکاح کسی مسلمان، کسی غیر مسلم اور کسی مرتد سے نہیں ہو سکتا۔ ان کا نکاح باطل ہے اور اولاد ولد الزنا ہے۔

۵ ـــــ ان کا ذبیحہ حرام اور مُردار ہے ۔

۶ ـــــ مسلمان اور مُرتد کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوتی، نہ مسلمان کسی مرتد اور زندیق کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مرتد اور زندیق کسی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے ۔

ان مسائل پر یہ ناکارہ اپنے تین رسائل ـــ 'قادیانی جنازہ' 'قادیانی مُردہ' اور 'قادیانی ذبیحہ' میں مذاہبِ اربعہ کی نقول درج کر چکا ہے جس کو شوق ہو ان رسائل کا مطالعہ کر لے ۔

(۴)

اُوپر ذکر کر چکا ہوں کہ جو شخص ذکری عقائد سے واقف ہونے کے باوجود ان کو مسلمان سمجھے وہ بھی کافر ہے' اس لیے جو شخص ذکریوں کے عقائد معلوم ہونے کے باوجود ان سے رشتہ ناتا کرتا ہے یا پہلے

سے رشتہ غلطی سے کر لیا تھا اس کو باقی رکھتا ہے وہ بھی مُرتد اور واجب القتل ہے۔

(۵)

ذکریوں کے ساتھ دوستی اور موالات کا تعلق جائز نہیں بلکہ دوستی اور موالات کا تعلق تو کسی کافر سے بھی جائز نہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

"لا تجد قوما یؤمنون باللّٰہ والیوم الاٰخر یوآدون من حآدّ اللّٰہ ورسولہ ولو کانوا اٰبآءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھمؕ اولٰٓئک کتب فی قلوبھم الایمان وایّدھم بروح منہؕ ویدخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھاؕ رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہؕ اولٰٓئک حزب اللّٰہؕ الآ انّ حزب اللّٰہ ھم المفلحون"

(المجادلۃ: ۲۲)

"جو لوگ اللّٰہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھتے ہیں جو اللّٰہ اور رسول کے برخلاف ہیں گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللّٰہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان (قلوب) کو

اپنے فیض سے قوت دی ہے (فیض سے مُراد نور ہے) اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے' یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے' خوب سُن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے۔

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

ایسے ہی قرآن حکیم کی ایک اور آیت میں ہے:

"یٰآیّھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوّی و عدوکم اولیآء تلقون الیھم بالمودۃ و قد کفروا بما جاءکم من الحق ط یخرجون الرسول و ایّاکم ان تؤمنوا باللّٰہ ربّکم ط ان کنتم خرجتم جھاداً فی سبیلی وابتغآء مرضاتی ق تسرّون الیھم بالمودۃ ق و انا اعلم بما اخفیتم و ما اعلنتم ط و من یفعلہ منکم فقد ضلّ سوآء السّبیل۔"

(الممتحنہ : ۱)

"اے ایمان والو نہ پکڑو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست' تم ان کو پیغام بھیجتے ہو دوستی سے اور وہ منکر ہوئے ہیں اُس سے جو تمہارے پاس آیا سچا دین۔ نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس بات پر کہ تم مانتے ہو اللہ کو جو رب ہے تمہارا۔ اگر

تم نکلے ہو لڑنے کو میری راہ میں اور طلب کرنے کو میری رضامندی، تم ان کو چھپا کر بھیجتے ہو دوستی کے پیغام اور مجھ کو خوب معلوم ہے جو چھپایا تم نے اور جو ظاہر کیا تم نے اور جو کوئی تم میں یہ کام کرے تو وہ بھول گیا سیدھی راہ۔"

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

امام ابو داؤد نے کتاب الجہاد "باب النہی عن قتل من اعتصم بالسجود" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

"انا بری من کل مسلم یقیم بین اظہر المشرکین قالوا یا رسول اللہ لم؟ قال لا ترایا ناراھما۔"

(ابوداؤد ص ۳۵۶ جلد اوّل)

"میں بری ہوں ہر اس مسلمان سے جو کافروں کے درمیان مقیم ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیوں؟ فرمایا۔ دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نظر نہیں آنی چاہیئے۔"

نیز امام ابوداؤد نے آخر کتاب الجہاد "باب فی الاقامۃ بارض الشرک" میں یہ حدیث نقل کی ہے:

"من جامع المشرک و سکن معہ فانہ مثلہ۔"

(ابوداؤد ص ۲۹ ج ۲)

"جس شخص نے مشرک کے ساتھ سکونت اختیار کی، وہ اس کی مثل ہوگا۔"

البتہ عام کافروں کے ساتھ خوش معاملگی اور مدارات کا حکم ہے
مگر کسی ذکری اور قادیانی مرتد، زندیق کے ساتھ یہ تعلق بھی جائز
نہیں۔ ان سے کلی طور پر قطع تعلق ضروری ہے :

ارشادِ خداوندی ہے :

"ولا ترکنوآ الی الذین ظلموا فتمسکم
النار، وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم
لا تنصرون "

(ہود : ۱۱۳)

" اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو
لگے گی آگ اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار۔
پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے " (ترجمہ شیخ الہندؒ)

ھذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

محمد یوسف لدھیانوی

انکارِ حدیث کیوں

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

اما بعد!

مذہب اسلام کے لئے موجود دور میں جو سوالات خاص اہمیت کے حامل ہیں، ان میں حدیث نبوی (علی صاحبہا الف الف سلام) کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات بالخصوص توجہ طلب ہیں۔

۱۔ حدیث کا مرتبہ اسلام میں کیا ہے؟

۲۔ حدیث سے شریعت اسلامیہ کو کیا فوائد حاصل ہوئے؟

۳۔ حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے تو اس سے دین کو کیا نقصان ہوگا، دور حاضر میں انکار حدیث کی جو وباء پھوٹ پڑی ہے، یہ کن جراثیم کا نتیجہ ہے؟

سطور ذیل میں ہم ان سوالات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔

واللہ الموفق والمعین۔

لیکن اصل سوالات پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم چند اصولی امور ناظرین کی خدمت میں پیش کردیں جن سے نظر و فکر کی مزید راہیں کھل سکیں۔

۱۔ نبی امت کی عدالت میں

انکار حدیث کا فتنہ ظہور میں آچکا ہے۔ بحث کرنے والے پوری قوت کے ساتھ اس بحث میں مصروف ہیں کہ حدیث حجت ہے یا نہیں؟ جن لوگوں کی طرف سے یہ بحث اٹھائی گئی ہے ان کا حال تو انہی کو معلوم ہو گا لیکن جہاں تک میرے ایمان کا

احساس ہے یہ سوال ہی غیرت ایمانی کے خلاف چیلنج ہے جس سے اہل ایمان کی گردن ندامت کی وجہ سے جھک جانی چاہئے۔

اس فتنہ کے اٹھانے والے ظالموں نے نہیں سوچا کہ وہ اس سوال کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اعتماد یا عدم اعتماد کا فیصلہ طلب کرنے کے لئے امت کی عدالت میں لے آئیں گے۔ امت اگر یہ فیصلہ کردے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و الہ وسلم کی بات (حدیث) قابل اعتماد ہے، تو اس کے مرتبہ کا سوال ہوگا اور اگر نالائق امتی یہ فیصلہ صادر کردیں کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات (حدیث) آپ کے زمانہ والوں کے لئے لائق اعتماد ہو تو ہو لیکن موجودہ دور کے متمدن اور ترقی پسند افراد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرنا ملائیت ہے" تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عدم اعتماد کا فیصلہ ہو جائے گا۔ (معاذ اللہ ' استغفر اللہ) اگر دل کے کسی گوشے میں ایمان کی کوئی رمق بھی موجود ہے تو کیا یہ سوال ہی موجب ندامت نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات لائق اعتماد ہے یا نہیں؟

تُف ہے! اس مہذب دنیا پر کہ جس ملک کی قومی اسمبلی میں صدر مملکت کی ذات کو تو زیر بحث نہیں لایا جا سکتا (پاکستان کی قومی اسمبلی کے اسپیکر نے متعدد دفعہ یہ رولنگ دی ہے کہ معزز ارکان اسمبلی صدر مملکت کی ذات گرامی کو زیر بحث نہیں لا سکتے) لیکن اسی ملک میں چند ننگ امت ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو نہ صرف یہ کہ زیر بحث لاتے ہیں بلکہ زبان و قلم کی تمام تر طاقت اس پر صرف کرتے ہیں کہ امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ دے ڈالے۔ اگر ایمان اسی کا نام ہے تو مجھے کہنا ہوگا" ﴿بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾۔

بہرحال مریض دلوں کے لئے انکار حدیث کی خوراک لذیذ ہو تو ہو (غلبہ صفراء کی

وجہ سے ان مسکینوں کو اس کی تلخی کا احساس نہیں ہوتا)' لیکن میرے جیسے گنہگار اور ناکارہ امتی کے لئے یہ موضوع خوشگوار نہیں بلکہ یہ بحث ہی تلخ ہے' نہایت تلخ' مجھے کل ان کے دربار میں جانا ہے اور ان کی شفاعت کی امید ہی سرمایہ زندگی ہے۔ سوچتا ہوں اور خدا کی قسم' کانپتا ہوں' کہ اگر ان کی طرف سے دریافت کر لیا گیا کہ "او نالائق! کیا میری حدیث کا اعتماد بھی محل بحث ہو سکتا ہے ؟ تو میرے پاس کیا جواب ہوگا ؟ اسلام کے ان فرزندان ناخلف نے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر جرح و تعدیل کا جو راستہ اختیار کیا ہے واللہ! اس میں کفر و نفاق کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (اب جس کا جی چاہے نبی کی بات پر ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے)

۲۔ فتنہ کی شدت

فتنہ کی کجی ملاحظہ کیجئے۔ دین قیم کے وہ صاف' واضح' روشن اور قطعی مسائل جن میں کل تک شک و تردد کا ادنیٰ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا' کل تک ملت اسلامیہ جن کو یقینی مانتی چلی آئی تھی' شکی مزاج طبیعتیں آج ان ہی مسائل کو غلط اور نا قابل قبول ٹھہراتی ہیں۔

ایک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اب تک محفوظ تھی' تمام امت کا مرجع تھی' ہر امتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا کرتا تھا۔ امت میں کوئی اختلاف رونما ہو' اس کے فیصلہ کے لئے آپ کی ذات آخری عدالت تھی اور آپ کا ہر فیصلہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا' لیکن افسوس! آج کس کے پاس یہ شکایت لے جائیں کہ فتنہ کے سیلاب کی موجیں علماء' صلحاء صوفیاء' متکلمین' محدثین' مجتہدین' تابعین اور صحابہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) ان

سب کو روندتی ہوئی دین و شریعت کی آخری فیصل ذات رسالمتابؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹکرا رہی ہیں اور چاہا جاتا ہے کہ انسانیت کی سب سے بڑی اور سب سے آخری عدالت کو بھی مجروح کر دیا جائے فالی اللہ المشتکی۔

اف! مبتلائے فتنہ امت میں یہ بحث موضوع سخن ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث حجت ہے یا نہیں' دینی حیثیت سے قابل قبول ہے یا نہیں؟ کیا یہ صاف اور موٹی بات بھی کسی کی عقل میں نہیں آسکتی کہ کسی ذات کو نبی اور رسول ماننا یا نہ ماننا تو ایک الگ بحث ہے۔ لیکن جس ذات کو رسول مان لیا جائے' ماننے والے کے ذمہ اس کی ہر بات کا مان لینا بھی ضروری ہے' جس کام کا وہ حکم کرے اس کی تعمیل بھی ماننے والے کے لئے لازم ہے اور جس فعل سے وہ منع کرے اس سے رک جانا ضروری ہے۔

> رسول کو رسول مان کر اس کے احکام میں تفتیش کرنا کہ یہ "حکم آپ اپنی طرف سے دے رہے ہیں یا خدا کی طرف سے؟ اور اگر آپ اپنی طرف سے کوئی ارشاد فرماتے ہیں تو اس کی تعمیل سے معاف رکھا جائے" نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کتنی صاف اور سیدھی بات تھی لیکن نہیں معلوم لوگ عقل کو کہاں استعمال کیا کرتے ہیں کہ ایسے بدیہی امور میں بھی شک اور تردد کا مرض ان کو ایمان و یقین سے محروم کئے رکھتا ہے۔
>
> شرح تحریر میں ہے۔

"حجية السنة سواءٌ كانت مفيدة للفرض او الواجب أو غيرهما (ضرورةٌ دينيةٌ) كل من له عقل وتميز حتى النساء والصبيان يعرف أن من ثبت نبوته صادق فيما يخبر عن الله تعالى ويجب اتباعه" (تیسیر التحریر ص: ۲۲ ج ۱)

ترجمہ! سنت خواہ مفید فرض ہو یا واجب یا ان کے علاوہ کے لئے مفید ہو ' اس کا حجت ہونا دین کا ایسا واضح مسئلہ ہے جس میں طلب دلیل کی ضرورت نہیں' جس کو ذرا بھی عقل و تمیز ہو ' عورتوں اور بچوں تک بھی ' وہ جانتا ہے کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ اللہ تعالٰی کی طرف سے جو کچھ بتلائے گا اس میں قطعا سچا ہو گا اور اس کی بات کی پیروی واجب ہو گی "۔

منکرین حدیث کی کور چشمی ملاحظہ کرو۔ اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں اس پر بھی اتفاق ہے کہ علم و عرفان کے سرچشمہ ہوتے ہیں الغرض آفتاب طلوع ہو چکنے کے بعد ' بحث اس پر ہو رہی ہے کہ سورج نکلنے کے بعد دن ہوتا ہے ، یا رات ہوتی ہے۔ زبان و قلم ' عقل و فہم اور دل و دماغ کی قوتیں اس پر صرف کی جا رہی ہیں کہ رسول کو رسول ماننے کے بعد اس کی کسی بات (حدیث) پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو خیرہ چشم طلوع آفتاب کا اقرار کرنے کے باوجود " دن نہیں رات ہے " کی رٹ لگا رہا ہو اور چاہتا ہو کہ تمام دنیا اسی کی طرح آنکھیں موند لے' بتلایا جائے کہ آپ ایسے سوفسطائی کو کس دلیل سے سمجھا سکتے ہیں۔

اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زبانی اقرار کرنے والوں سے جب سنا جاتا ہے کہ جس ذات کو ہم رسول مانتے ہیں اسی کا کوئی قول اور فعل ہمارے لئے حجت نہیں تو بتلایئے ایسے محرومان بصیرت کے لئے کونسا سامان ہدایت سود مند ہو سکتا ہے ؟ کاش ان کو چشم بصیرت نصیب ہو جاتی۔ ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ "کیونکہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ' بلکہ وہ دل اندھے ہو چکے ہیں جو ان کے سینوں میں ہیں"۔

۳۔ منکرین حدیث کی بے اصولی

حدیث کا جو ذخیرہ اس وقت امت کے پاس محفوظ ہے اس کے دو جز ہیں۔
(۱) متن (۲) سند۔ یعنی ایک تو حدیث کے وہ جملے ہیں جو قولاً یا فعلاً یا تقریراً صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا یا آپ نے فلاں عمل کر کے دکھایا یا آپ نے فلاں کام کی .... جو آپ کے سامنے کیا گیا' تصویب فرمائی۔ دوم اساتذہ حدیث کا وہ سلسلہ ہے جو امت اور امت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں۔ مثلاً امام بخاری جس حدیث کو روایت کریں گے وہ ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے جائیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث کن کن واسطوں سے ہم تک پہنچی۔

پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کی حدیث جن لوگوں نے خود آپ کی زبان فیض ترجمان سے سنی وہ سننے والوں کے حق میں اسی طرح قطعی تھی جس طرح قران کریم قطعی ہے۔ آپ کی زبان مبارک سے جو حکم بھی صادر ہوا بالمشافہ سننے والوں کے لئے اس کا درجہ وحی خداوندی کا ہے اگر آپ نے اس کو قرآن میں لکھنے کا حکم دیا تو وہ وحی جلی کہلائے گا ورنہ وحی خفی۔

قسم اول (وحی جلی) کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ تھے۔

قسم دوم (وحی خفی) کا مضمون منجانب اللہ ہوتا تھا' الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے تھے' بہرحال وحی کی یہ دونوں قسمیں چونکہ منجانب اللہ ہیں اس لئے دونوں پر ایمان لانا اور دونوں کا قبول کرنا اہل ایمان کے ذمہ ضروری ہوا۔ البتہ روایت حدیث کے اعتبار سے حدیث کی مختلف قسمیں ہو جاتی ہیں جن کی تفصیل کو

مع ان کے احکام کے اپنی جگہ بیان کیا گیا ہے۔

اب منکرین حدیث کی بے اصولی دیکھئے کہ وہ ان دونوں اجزاء (متن حدیث اور سند حدیث) کے متعلق مخلوط بحث کریں گے۔ حالانکہ بے اعتمادی کا زہر پھیلانے سے پہلے انصاف و دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ محل بحث کو طے کر لیا جاتا کہ کیا ان کو نفس حدیث ہی پر اعتماد نہیں خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو؟ یا نفس حدیث پر ان کو اعتماد ہے اور وہ اسے دینی سند بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن موجودہ ذخیرہ حدیث کے متعلق ان کی بے اعتمادی کا سبب یہ ہے کہ پوری امت میں ان کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امانت امت تک صحیح پہنچا دی ہو اس لئے اس کو موجودہ ذخیرہ حدیث سے ضد ہے۔ مثلاً امام مالک کی وہ روایت جو مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مروی ہیں، جو شخص ان روایات پر بے اعتمادی کا اظہار کرتا ہے، کیا اس کا فرض نہ ہوگا کہ وہ اپنی بداعتمادی کی وجہ بتلائے کہ آیا اسے حدیث کے ان تین ناقلین، مالک، نافع، ابن عمر رضی اللہ عنہم پر ہی اعتماد نہیں۔ معاذ اللہ۔ یا خود ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد نہیں۔ استغفراللہ۔

بہرحال جب تک موضوع کی تنقیح اور تعین نہ کرلی جائے، اس وقت تک کسی بھی مسئلہ پر بحث لغو اور لا یعنی مشغلہ ہے۔ لیکن آپ منکرین حدیث کو پائیں گے کہ وہ کبھی نفس حدیث پر بحث کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں اور کبھی بے چارے ناقلین حدیث پر تبرا شروع کر دیں گے کہ ان لوگوں نے امت کی یہ امانت بعد میں آنے والی امت تک کیوں پہنچائی۔ لیکن انکار حدیث کا منشاء متعین کرنے سے وہ گریز کریں گے۔ اس لئے میں کہوں گا کہ حدیث پر سے اعتماد اٹھانے کا اصل حل تلاش کرو اور محل بحث تلاش کرنے کے بعد افہام و تفہیم کریں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ قصور وار ناقلین روایت ہوں اور فرد

جرم خود حدیث پر عائد کر دی جائے ۔ یا اعتماد نفس حدیث پر نہ ہو ، اور اس کی سزا حدیث روایت کرنے والی پوری امت کو دی جانے لگے ۔

۴ ۔ انکار حدیث کا عبرتناک انجام

حدیث پر اعتماد نہ کرنے والوں کو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا پوری امت میں سے ایک کو ناقابل اعتماد قرار دینا ہوگا استغفر اللہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ زید کا کلام عمرو نقل کرے ' سننے والے کو زید کے صدق کا یقین ہو اور عمرو پر اعتماد ہو کہ وہ نقل میں جھوٹا نہیں لیکن اس کے باوجود کہے 'کہ یہ کلام جھوٹا ہے ۔ بہرحال یہاں یہ سوال کسی خاص حدیث کا نہیں بلکہ مطلق حدیث کا ہے ۔ جب اس کا انکار کیا جائے گا اور اسے ناقابل اعتماد قرار دیا جائے گا تو اس صورت میں یا خود صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اعتماد اٹھانا ہوگا یا پوری امت کو غلط کار اور دروغ گو کہنا ہوگا ۔ انکار حدیث کی تیسری کوئی صورت نہیں ۔ اوز ان دونوں کا نتیجہ سب کے سامنے ہے ۔ اگر معاذ اللہ خود صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم یا چودہ سو سالہ امت سے اعتماد اٹھا لیا جائے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں 'کہ اسلام اور قرآن پر بھی ان کا اعتماد نہیں ۔ اور دین و ایمان کے ساتھ بھی ان کا کچھ واسطہ نہیں ۔ ان حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بے اعتمادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لانا چاہئے کہ اس تمام تر سعی مذموم کے باوجود وہ اسلام اور قرآن کو بے اعتمادی کے جھگڑے سے محفوظ رکھ سکیں گے ۔

۵۔ تنقیح بحث

اب تمام تر بحث جو آپ کے سامنے آئے گی، وہ نفس حدیث سے متعلق ہوگی۔ سند حدیث اور رجال سند کی بحث کو ہمارے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

ان ابتدائی اشارات کے بعد ہم پہلے سوال پر غور کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ دور نبوت کے ارشادات، کلمات طیبات، قضایا اور فیصلے، افعال و احوال، سیرو اخلاق، الغرض اس طویل مدت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو زبانی حکم دیا یا جو کچھ عملاً کر دکھلایا، یا کسی عمل کی تصویب قولاً یا سکوتاً فرمائی (ان ہی امور کے مجموعہ کا نام حدیث ہے)

☆۔ ان سب کو قرآن مجید کیا مرتبہ دیتا ہے؟
☆۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کی حیثیت کیا تھی؟
☆۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے تقریبا صد سالہ دور میں ان کے ساتھ کیا تعلق رکھا؟
☆۔ صحابہ کرام کے بعد کی امت کی نظر میں ان کا کیا مرتبہ رہا؟
☆۔ عقل صحیح کی روشنی میں ان کا کیا مقام ہے؟

یہ پانچ نکات ہیں، جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک مجلاتی مضمون میں جس قدر شرح و بسط کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ حتی الوسع اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حق تعالیٰ سوء فہم اور قصور تعبیر سے حفاظت فرمائیں (آمین)

۱۔ فرمودہ رسولؐ کو بلا چون و چرا قبول کرو

قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو کچھ دیا
ائے۔ اس کو بلا چون و چرا قبول کرلیں اور آپ کے منع کردہ امور سے باز رہیں۔
ر انہوں نے ایسا نہ کیا، تو ان کے حق میں شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔ ارشاد
داوندی ہے۔

﴿وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

(الحشر: ۷)

(ترجمہ) اور رسول تمہیں جو کچھ بھی دے دیں۔ اس کو لے لو۔
اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ
سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والے ہیں۔

۲۔ حکم نبوی سے روگردانی باعث فتنہ و عذاب ہے

آپؐ کے امر کی مخالفت کرنے والے لوگوں کو ڈرایا گیا ہے
کہ ان کی یہ روش بد ترین فتنہ اور درد ناک عذاب میں انہیں
دھکیل کر رہے گی۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ
أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ (النور: ۶۳)

(ترجمہ) اور جو لوگ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

انہیں ڈرنا چاہئے ، کہ کہیں ان کو کوئی عظیم فتنہ پیش نہ آجائے
یا کہیں ان کو عذاب الیم کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

چنانچہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں۔
یعنی اللہ اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں ان کے دلوں میں کفر و نفاق وغیرہ کا فتنہ ہمیشہ کے لئے جڑ پکڑ نہ جائے۔ اور اس طرح دنیا کی کسی سخت آفت یا آخرت کے دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں العیاذ باللہ۔ (تفسیر عثمانی ص ۴۶۶)

۳۔ اطاعت نبوی باعث رحمت خداوندی ہے۔

رحمت خداوندی کے نزول کو آپؐ کی اطاعت کاملہ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔

فرمان باری ہے۔

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴾

(النور، ۵۶)

"اور اے مسلمانوں نماز کی پابندی رکھو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اور باقی احکام میں بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کیا کرو۔ تاکہ تم پر کامل رحم کیا جائے۔

(ترجمہ حکیم الامت رحمہ اللہ)

۴۔ فوز و فلاح کا راز

ہر قسم کی فوز و فلاح ' رشد و ہدایت ' اور بہبودی دنیا و آخرت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں منحصر قرار دیا گیا۔

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا، ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ، وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا﴾ (النساء ۶۹)

(ترجمہ) " اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا۔ تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیاء اور صدیقین ' اور شہدا اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں "۔

۵ اتباع رسول محبت و محبوبیت الٰہی کا معیار ہے

دعوائے محبت خداوندی کے صدق و کذب کا امتحان کرنے کے لئے اتباع محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو معیار قرار دیا گیا۔ اسی کے ساتھ آپ کی ہر ادا کی نقل اتارنے والوں کو مقام محبوبیت پر فائز ہونے کی بشارت اور مغفرت سے ہمکنار ہونے کی خوشخبری سے نوازا گیا ہے۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

(آل عمران: ۳۰)

(ترجمہ) آپ فرما دیجئے۔ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔ تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بہت رحم والے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

"دشمنان خدا کی موالات و محبت سے منع کرنے کے بعد خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا معیار بتلاتے ہیں۔ یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ یا خیال ہو، تو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا جو شخص جس قدر حبیبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا، اور آپ کی لائی ہوئی، روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے، اسی قدر سمجھنا چاہئے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعوے میں سچا ہو گا، اتنا ہی حضورؐ کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا۔ جس کا پھل یہ ملے گا۔ کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے گا۔ اور اللہ کی محبت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری باطنی مہربانیاں مبذول ہوں گی۔ مختصراً ان آیات میں پیغمبر آخرالزمان کی اطاعت کی پر زور طریقے سے دعوت دی گی ہے۔ (تفسیر عثمانی ص ۶۹)

٦۔ آپؐ کی ذات گرامی تصفیہ طلب امور میں بحیثیت آخری عدالت!

اعلان کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو جب تک شعار زندگی نہ بنایا جائے گا اور ہر قسم کے تصفیہ طلب امور کے لئے آپ کی ذات پاک کو آخری عدالت کی حیثیت نہیں دی جائے گی اہل ایمان کو نہ ذرہ خیرو برکت میسر آسکتا ہے نہ اس کے بغیر کسی اچھے انجام کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الأَمْرِ مِنكُمْ، فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَالِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً﴾ (النساء: ٥٩)

(ترجمہ) اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو، اور رسول کا کہنا مانو۔ اور تم میں سے جو لوگ اہل حکومت ہیں، ان کا بھی۔ پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو. تو اس امر کو اللہ اور رسول کے حوالے کر دیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب بہتر ہیں۔ اور انجام کار خوش تر ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ باہمی اختلافات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق حل کریں اور اگر کوئی اپنے اختلافات ختم کرنے کے لئے قرآن و سنت سے پہلو تہی کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج تصور ہو گا۔

علما نے لکھا ہے کہ اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں۔ ایک نے کہا کہ چلو شرع کی طرف رجوع کریں۔ دوسرے نے کہا کہ میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کیا ہے۔ تو اس کے یہ کلمات دائرہ اسلام سے خارج کرنے والے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واجب العمل ہے

آگاہ کیا گیا ہے کہ نہ صرف دینی امور بلکہ خالص دنیوی امور میں بھی کسی مومن مرد اور عورت کو آپ کے فیصلے کے بعد کسی قسم کی گنجائش نہیں کہ فیصلہ نبوت کے بعد وہ اپنے لئے ادنیٰ اختیار کا تصور بھی ذہن میں لائے۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ (الاحزاب:٣٦)

(ترجمہ) اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں ہے۔ جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا وجوباً حکم دے دیں کہ (پھر) ان مومنین کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے (یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ خواہ کریں یا نہ کریں۔ بلکہ عمل کرنا ہی واجب ہے۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

۸۔ فیصلۂ نبویؐ سے انحراف باعث ہلاکت ہے

بات یہیں پوری نہیں ہو جاتی، بلکہ پُر جلال انداز میں ہر سننے والے کے کان کھول دیئے گئے کہ فیصلہ نبوی کے بعد جن

لوگوں کو اپنے لئے کسی قسم کی اختیاری گنجائش پیدا کرنے کی فکر رہتی ہے، ایسے نافرمان صریح بھٹکے ہوئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُبِيناً﴾

(الاحزاب: ٣٦)

(ترجمہ) اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا۔ وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

۹۔ ہدایت صرف اطاعت نبویؐ میں منحصر ہے۔

یہ بھی واضح کر دیا گیا۔ کہ ہدایت صرف اطاعت نبویؐ میں منحصر ہے۔ اور یہ کہ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے علاوہ ہدایت کے تمام راستے بند ہیں۔ اس کے ساتھ بتلا دیا گیا۔ کہ آپؐ کے اوامر سے سرتابی کرنے والے کو تاہ اندیش لوگوں کو اس کے ہولناک نتائج کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (النور: ٥٤)

(ترجمہ) آپ کہیے کہ اللہ تعالٰی کی اطاعت کرو۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم (اطاعت سے) روگردانی کرو گے، تو سمجھ رکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ وہی (تبلیغ) ہے جس کا ان پر بار رکھا گیا۔ اور تمہارے ذمہ وہ ہے جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے اور اگر تم نے ان کی اطاعت

کر لی ، تو راہ پر جا لگو اور بہرحال رسول کے ذمہ صاف صاف طور پر پہنچا دینا ہے۔

۱۰ ۔ مومن اور جذبہ سمع و طاعت

واضح کر دیا گیا کہ ایمان کا سب سے بڑا نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنا ' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم پر سمع و طاعت بجا لانا ' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دینا ہے ۔ اور یہ کہ کامرانی اور کامیابی انہیں لوگوں کے قدم چومے گی جو اپنے اندر یہ ایمانی صفات رکھتے ہوں گے ۔

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (النور: ٥١)

(ترجمہ) ۔ مسلمانوں کا قول تو جبکہ ان کو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یہ ہے کہ وہ (بطیب خاطر) کہتے ہیں ۔ کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور ایسے لوگ آخرت میں فلاح پائیں گے ۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" یعنی ایک سچے مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے اور یہ ہونا چاہئے کہ جب کسی معاملے میں ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے ۔ خواہ ان میں بظاہر ان کا نفع

ہو ' یا نقصان ایک منٹ کا توقف نہ کریں ۔ فی الفور سمعاً و طاعتہ کہہ کر حکم ماننے کے لئے تیار ہو جائیں ۔ اس میں ان کی اصلی بھلائی اور حقیقی فلاح کا راز مضمر ہے ۔

(تفسیر عثمانی ص ۶۶۳)

۱۱۔ گفت او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

بتلایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و عمل وحی الٰہی کا تابع اور منشائے خداوندی کا ترجمان ہے ۔ اس لئے کہ اپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ اپنی ذاتی خواہش سے نہیں ، بلکہ وحی الٰہی سے فرماتے ہیں ۔

﴿ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴾

(النجم من أولى إلى الأربع آياتٍ)

(ترجمہ) " قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے ۔ یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نہ راہ سے بھٹکے ، اور نہ غلط رستے ہوئے اور نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں اور ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے ۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

پس جس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں حق تعالیٰ شانہ یہ ضمانت دیتے ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ غلط روی کا احتمال ہے اور نہ وحی الٰہی کے خلاف کسی لفظ کے زبان مبارک پر آنے کا

اندیشہ ہے، ایسی ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے ہر قول و فعل پر ہمہ دم وحی الٰہی کا پہرا رہتا ہو انصاف کیا جائے ....

حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو دلائل وبراہین سے محقق کرنے کے بعد خدا تعالیٰ آپ کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسولؐ کی فرمانبرداری کرے گا وہ بے شک ہمارا تابعدار ہے۔ اور جو اس سے روگردانی کرے گا تو ہم نے تجھکو اے رسولؐ ان لوگوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دے ہم ان کو دیکھ لیں گے تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ آگے ثواب یا عتاب یہ ہمارا کام ہے۔"

۱۲۔ اطاعت نبویؐ کی حقیقت

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، اور جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی نہیں سمجھتے وہ اپنی بدفہمی کی وجہ سے کفر کے مرتکب ہیں۔

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾ (النساء: ۸۰)

ترجمہ۔ جس شخص نے رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی، اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے روگردانی کرے سو آپ کچھ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے آپ کو نگران کرکے نہیں بھیجا کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

۱۳ - ایک مثالی نمونہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول، علم و عمل، گفتار و کردار، نشست و برخاست غرضیکہ آپؐ کی ذات سے صادر ہونے والی ہر چیز سراپا ہدایت ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی کو امت کے لئے بہترین مثالی نمونہ قرار دیا گیا۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ، وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ ۔ تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو ۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔"

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہر ایسے شخص کے لئے معیاری نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور جس کا دل ذکر الٰہی کی کثرت سے منور ہو، برعکس اس کے جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثالی نمونہ نہیں سمجھتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو واجب الاطاعت اور لائق اقتدا نہیں سمجھتا اسے نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے ۔ نہ آخرت پر۔ اس کا دل ذکر الٰہی کے نور سے محروم ہونے کی وجہ سے ظلمت کدہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا مطلب یہ ہے کہ رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو دیکھو ۔ سختیوں اور جانگداز حالات میں کیا استقلال رکھتے ہیں ۔ حالانکہ سب سے زیادہ اندیشہ اور فکر ان ہی پر ہے مگر مجال ہے کہ پائے استقامت ذرا جنبش کھا جائے ۔ جو لوگ اللہ سے ملنے اور آخرت کا ثواب حاصل

کرنے کی امید رکھتے ہیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرتے ہیں ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات بہترین نمونہ ہے ۔ چاہیئے کہ ہر معاملہ ' ہر ایک حرکت و سکون ' اور نشست و برخاست میں ان کے نقش قدم پر چلیں اور ہمت و استقلال وغیرہ میں ان کی چال سیکھیں ۔

۱۴ ۔ ایک نکتہ

آپؐ کی اطاعت سے اعتقاداً پہلو تہی کرنے والوں پر صاف صاف کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ﴾ (آل عمران: ۳۲)

ترجمہ ۔ آپ فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو ۔ اللہ اور اس کے رسول کی ۔ پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو سن رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے "۔

۱۵۔ فیصلہ نبوی سے منحرف ظالم ہے ۔

آپؐ کے فیصلوں سے اعراض کرنے والوں کو شک و تردد اور نفاق کے مریض ' غلط اندیش اور ظالم قرار دیا گیا۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ○ اَفِيْ

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ
رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (النور ع ۶ ۔ آیت نمبر ۵۱)

(ترجمہ) "اور یہ لوگ جب اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اس غرض کے لئے بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو ان میں ایک گروہ پہلو تہی کرتا ہے۔ اور اگر ان کا حق ہو تو سر تسلیم خم کئے ہوئے آپ کے پاس آتے ہیں۔ آیا ان کے دلوں میں مرض ہے یا یہ شک میں پڑے ہیں یا ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم نہ کرنے لگیں، نہیں! بلکہ یہ لوگ سراسر ظالم ہیں"۔

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

۱۶۔ اتباع رسولؐ سے پہلو تہی منافقانہ عمل ہے

آپؐ کی اتباع سے انحراف کرنے والوں کو صاف صاف منافق اور ایمان سے عاری قرار دیا گیا۔

﴿وإذا قيل لهم تعالوا إلى ما أنزل الله وإلى الرسول
رأيت المنفقين يصدون عنك صدودا﴾ (النساء: ٦١)

ترجمہ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں"۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یعنی جب کسی

جھگڑے میں منافقوں سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم نازل فرمایا ہے اس کی طرف آؤ۔ ظاہر میں چونکہ مدعی اسلام ہیں، اس لئے صاف طور پر تو انکار نہیں کرسکتے مگر آپؐ کے پاس آنے سے اور حکم الٰہی پر چلنے سے بچتے ہیں اور رکتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے۔ اور رسولؐ کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اپنا جھگڑا لے جائیں۔ (ص ۱۱۳)

۱۷۔ ارشادات نبویؐ سے بے اعتنائی برتنے والے کا حکم

آپکے پاک ارشادات کے ساتھ بے اعتنائی برتنے والوں اور آپ کے اقوال شریفہ کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کے متعلق اعلان کیا گیا کہ ان کے قلوب پر خدائی مہر لگ چکی ہے، جس کی وجہ سے وہ ایمان و یقین اور رشد و ہدایات کی استعداد گم کر چکے ہیں اور ان لوگوں کی ساری تگ و دو خواہش نفس کی پیروی تک محدود ہے۔

﴿وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ﴾ (محمد: ١٦)

ترجمہ۔ اور بعض آدمی ایسے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو دوسرے اہل علم سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تحقیر کے طور پر) کہتے ہیں کہ حضرت نے ابھی کیا بات فرمائی تھی؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی، اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں۔ (ترجمہ حضرت تھانوی بتصرف یسیر)

۱۸۔ اسلامی دستور کا دوسرا ماخذ احادیث نبوی ہیں

قرآن کریم نے صاف صاف یہ اعلان بھی کر دیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو صرف اسی مقصد کے لئے بھیجا جاتا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار اور آپ کے ارشادات سے سرتابی کرنا گویا انکار رسالت کے ہم معنی ہے۔ اس طرح آپ کی اطاعت کے منکرین انکار رسالت کے مرتکب ہیں۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلاَّ لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾

(النساء: ٦٤)

ترجمہ۔ اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے"۔

قرآن کریم کی وہ آیات جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اہل ایمان کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے' بے شمار ہیں۔ ان میں سے یہ چند آیات آپ کے سامنے ہیں۔ کتاب اللہ کے ان واضح اعلانات کی روشنی میں یہ فیصلہ بالکل آسان ہے' کہ اسلام میں ذات اقدس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مرتبہ کیا ہے؟ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی اطاعت اور پیروی کا حکم خود قرآن ہی میں موجود ہے اور جب قرآن کریم ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی قرار دیتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو جب قرآن ہی وحی

خداوندی بتلاتا ہے (وَ مَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی اور آپؐ کے کلمات طیبات کو جب قرآن ہی "گفتہ او گفتہ اللہ بود" کا مرتبہ دیتا ہے تو بتلایا جائے کہ حدیث نبوی کے حجت دینیہ ہونے میں کیا کسی شک و شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے؟ اور کیا حدیث نبوی کا انکار کرنے سے کیا خود قرآن ہی کا انکار لازم نہیں آئے گا؟ اور کیا فیصلہ نبوت میں تبدیلی کے معنی خود قرآن کو بدل ڈالنا نہیں ہوں گے۔ اور اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم بھی تو امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سنا، اور سن کر اس پر ایمان لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "یہ قرآن ہے"، یہ ارشاد بھی تو حدیث نبوی ہے۔ اگر حدیث نبوی حجت نہیں، تو قرآن کریم کا قرآن ہونا کس طرح ثابت ہو گا۔ آخر یہ کونسی عقل و دانش کی بات ہے کہ اس مقدس و معصوم زبان سے صادر ہونے والی ایک بات تو واجب التسلیم ہو اور دوسری نہ ہو؟

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

"یہ تو میرے میاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کمال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور یہ میرا کلام ہے، ورنہ ہم نے تو دونوں کو ایک ہی زبان سے صادر ہوتے ہوئے سنا تھا"۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن تو حجت ہے مگر حدیث حجت نہیں ہے ان ظالموں کو کون بتلائے کہ جس طرح ایمان کے معاملہ میں خدا اور رسول کے درمیان: تفریق نہیں ہو سکتی کہ ایک کو مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے۔ ٹھیک اسی طرح کلام اللہ اور کلام رسول کے درمیان بھی اس تفریق کی گنجائش نہیں۔ کہ ایک کو واجب الاطاعت مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے۔ ایک کو تسلیم کر لیجئے تو دوسرے کو بہر صورت تسلیم کرنا ہوگا اور ان میں سے ایک کا انکار کر دینے سے دوسرے کا انکار آپ سے آپ ہو جائے گا۔ خدائی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کے کلام کو تسلیم کرنے کا دعوے کیا جائے، اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو ٹھکرایا جائے۔ وہ

ایسے ظالموں کے خلاف صاف اعلان کرتا ہے۔

فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ○

ترجمہ "پس اے نبیؐ! یہ لوگ آپ کے کلام کو نہیں ٹھکراتے
بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کے منکر ہیں"

لہٰذا جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے اور کلام اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں لا محالہ رسول اور کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ ورنہ ان کا دعویٰ ایمان حرف باطل ہے۔

۲۔ مرتبہ حدیث خود صاحب حدیث کی نظر میں

"حدیث نبوی .... حجت ہے یا نہیں ؟" اس نزاع کا جو فیصلہ قرآن کریم نے فرمایا ہے وہ مختلف عنوانات کے تحت آپ کے سامنے آچکا ہے آیئے اب یہ دیکھیں کہ خود صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث مبارکہ اور اپنے ارشادات طیبہ کے حجت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے ؟

یہ تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی امت کے تمام نزاعی امور کا فیصلہ کرنے کے لئے آخرت عدالت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہو جانا معیار ایمان ہے ' اور قرآن کریم کا حلفیہ بیان ہے کہ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں اور اس کے لئے سر تسلیم خم نہ کریں وہ ایمان سے محروم ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○

(النساء ۔ ایت ٦٥)

ترجمہ۔ "سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں' اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے' پھر نہ پاویں اپنے دل میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے"۔

جب قرآن کریم نے امت کے تمام جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصف قرار دیا ہے تو لازم ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے اس کا فیصلہ لے لیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا کیا مرتبہ ہے؟ آپ کے فیصلہ کے بعد کسی قسم کی کٹ حجتی کی ضرورت نہ رہے گی۔ آیات بینات کے بعد اب فیصلہ نبوت سنئے۔

(۱)

پوری امت کو مخاطب کرکے فرمایا جاتا ہے کہ ایسا شخص ایمان سے محروم ہے جس کی خواہشات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہر چیز سے ہم آہنگ نہیں ہو جاتیں۔

عن عبداللہ بن عمرو رضي اللہ عنهما عن النبيّ صلى اللہ عليه وسلم قال: «لا يؤمِنُ احدُكُم حتّى يكونَ هواهُ تَبعاً لما جئتُ به»

(رواہ فی الشرح السنۃ و قال النووی فی اربعینہ ہذا حدیث صحیح رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح مشکوٰۃ ص: ۳۰)

ترجمہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی

خواہشات اس (شریعت) کے تابع نہیں ہو جاتیں جس کو میں
لے کر آیا ہوں "۔ (مشکوٰۃ۔ ۳۰)

(۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تارک اور آپ کے اوامر کی اقتداء نہ کرنے والے نا خلف دروغ گو اور غلط کار ہیں اور جو شخص ان کے ساتھ ' ہاتھ ' زبان یا دل کے ساتھ جہاد نہیں کرتا وہ بھی ذرہ ایمان سے محروم ہے۔

«عن ابنِ مَسْعودٍ رَضي الله عَنْهُ قال قال رسولُ اللهِ ما مِنْ نبيٍ بَعَثه اللهُ فِيْ أمتهِ قَبلى إلا كَانَ لَهُ فى أمته حَوارِيُونَ وأصحابٍ يأخُذُون بِسُنَّتِهِ ويقتدون بأمرِهِ، ثُمَ إنَّها تخلُف مِن بَعْدِهِم خُلُوفٌ يقُولُونَ ما لا يَفْعَلُونَ ويفعلُونَ ما لا يُؤمَرونَ فَمَنْ جاهَدَهُمْ بِيَده فَهُو مُؤْمِنٌ ومَن جاهَدَهم بِلِسانِهِ فهُو مُؤْمِنٌ ومَن جاهَدَهم بِقلبِهِ فَهُو مُؤْمِنٌ وليس وراء ذلِكَ مِن الإيمان حَبةُ خردلٍ»

(رواہ مسلم)

ترجمہ " عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالٰی نے بھیجا اس کی امت میں ضرور ایسے خاص لوگ اس کے دین کے مددگار رہا کئے جو اس کی سنت پر عمل پیرا ہوتے اور اس کے حکم کی اقتداء کرتے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جو ایسی باتیں کہتے جن پر عمل نہ کرتے اور ایسے

افعال کرتے جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا (یہی اس امت میں ہوگا) پس جو شخص ان لوگوں کے ساتھ ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے ساتھ دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے اس کے علاوہ ایمان کا ذرہ نہیں "۔

(مشکوۃ ص۲۹ بروایت صحیح مسلم)

(۳)

سنت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اعراض کرنے والوں کا ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں۔

«عن أنسٍ رضی اللہ عنه عَنِ النَّبی ﷺ (فی حدیث فیهِ قِصةٌ) فَمَن رَغِبَ عَن سُنَّتِی فَلَیس مِنِّی»

(متفق علیه)

" حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جس نے میری سنت سے بے رغبتی کی وہ مجھ سے نہیں "۔ (بخاری و مسلم)

(۴)

انکار حدیث کا نعرہ لگانے والے دجال اور کذاب ہیں۔

«عن أبی هریرة رضی اللہ عنه قال قال رَسُولُ اللہ ﷺ : یکونُ فی آخرِ الزمان دجَّالُونَ کَذَّابُونَ یَأتُونَکُمْ

مِن الأحاديث ما لم تَسمَعوا أنتم ولا آبائكم فإياكم لا يضلونكم ولا يفتنونكم» (رواه مسلم)

" حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ آخری زمانہ میں ایسے ایسے دجال اور کذاب ہوں گے جو تمہیں ایسی ایسی باتیں سنائیں گے جو نہ تم نے کبھی سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے۔ پس ان سے بچو ' ایسا نہ ہو کہ تمہیں گمراہ کردیں یا فتنہ میں ڈال دیں "

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ایسے نظریات پیش کرتے ہیں جو امت کی گذشتہ صدیوں میں کبھی نہیں سنے گئے وہ دجال و کذاب ہیں انکار حدیث کا نظریہ بھی اسی قسم کا ہے۔

(۵)

انکار حدیث کا منشاء شکم سیری ' ہوا پرستی اور گندم خوری کے سوا کچھ نہیں۔

«عن المقدام بن معديكرب رضى الله عنه قال قال رَسُولُ اللهِ ﷺ: ألا إنى أُوتيتُ القرآن ومِثلَه ألا يوشك رجلٌ شبعان على أريكته يقول عليكم بِهذا القُرآن فمَا وَجدتم فيه مِنْ حلالٍ فاحلوه وما وَجَدتم فيه من حرام فحرِموه وأن ما حرم رسول اللهِ ﷺ كما حرم الله» الحديث.

([illegible] نمبر ۵ ص ۲۹)

"مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سن رکھو! مجھے قرآن بھی دیا گیا اور قرآن کے ساتھ اس کے مثل بھی، سن رکھو! قریب ہے کہ کوئی پیٹ بھرا تکیہ لگائے ہوئے یہ کہنے لگے کہ لوگوں! تمہیں یہ قرآن کافی ہے بس جو چیز اس میں حلال ملے اسی کو حلال سمجھو! حالانکہ اللہ کے رسول کی حرام بتلائی ہوئی چیزیں بھی ویسی ہیں جیسی اللہ تعالیٰ کی حرام بتلائی ہوئی"۔

(۶)

جب امت میں اختلاف رونما ہو جائے اور ہر فرقہ اپنی تائید قرآن سے ثابت کرنے لگے۔ اس وقت سنت نبوی کو لازم پکڑنا اور قرآنی مطالب کے افہام و تفہیم میں اسوۂ نبوت کو فیصل قرار دینا ہی اصل منشاء دین ہے۔ ایسے نازک وقت حدیث نبویؐ سے دست کشی گمراہی کا پہلا زینہ ہے۔ اور نئے نظریات اور اعمال کا اختراع کجروی کا سنگ بنیاد ہے۔

«عن العرباض بن سارية رضى الله عنه قال صَلّى بنا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ذاتَ يومٍ ثُمَ أقْبَلَ علينا بوجهِهِ فوَعظَنا مَوْعِظَةً بليغةً زَرَفَتْ مِنْها العيون، ووَجَلَتْ مِنها القلوب، فقال رَجُلٌ يا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَأنَ هذهِ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٌ فأوصِينا- فقال أوصِيكُمْ بتَقوَى الله والسَمعَ والطاعَة، وإن كان عبداً حبشياً»

(رواه أحمد، وأبو داود والترمذى، مشكواة ص٢٩)

ترجمہ۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمیں نماز پڑھائی پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ پس ہمیں بہت ہی موثر وعظ فرمایا۔ جس سے آنکھیں بہہ پڑیں، اور دل کانپ گئے۔ آپؐ سے ایک شخص نے کہا یا رسولؐ اللہ یہ تو ایسا لگتا ہے، جیسے کسی رخصت کرنے والی کی نصیحت ہو۔ پس ہمیں وصیت فرمایئے۔ فرمایا .... کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور اپنے حُکام کی بات سننا اور ماننا خواہ حاکم حبشی غلام ہو۔

(۷)

حدیث جیسے بدیہی اور اجماعی مسائل میں نزاع اور جدال پیدا کرنے والے ہدایت چھوڑ کر راہ ضلالت اختیار کئے ہوئے ہیں۔

«عن أبی أمامة رضی الله عنهُ قال قال رسولُ الله ﷺ ما ضل قوم بعد هُدًى كانوا عليه إلا أوتُوا الجدل، ثُمَّ قرأ رسولُ الله ﷺ مَا ضَرَبوه لك إلا جَدلا، بل هُم قومٌ خَصِمُون» (رواه أحمد، وأبو داود والترمذی)

" حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جب بھی کوئی قوم ہدایت کھو کر گمراہ ہو جاتی ہے۔ انہیں جھگڑا دے دیا جاتا ہے (پھر وہ ایسے واضح مسائل میں بھی جھگڑتے ہیں۔ جن میں نہ کبھی نزاع کی نوبت آئی اور نہ عقل سلیم ایسے امور میں مشاجرۃ کا تصور کر سکتی ہے"۔

(۸)

زہر ضلالت کے لئے اسوہ نبوت تریاق اعظم ہے جب تک کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دینی سند کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہے گا۔ امت گمراہی سے محفوظ رہے گی، لیکن جونہی کتاب و سنت میں تفریق کی جانے لگے گی اور امت کی آوارہ مزاجی کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو بار دوش تصور کرنے لگے گی۔ اس وقت امت قعر ضلالت میں جا گرے گی۔

«عن مالك بن أنسٍ قال قال النبى ﷺ تركتُم فيكم أمرين لَنْ تضلّوا ما تَمَسكتُمْ بِهِما ، كتابُ اللهِ وَسُنّةُ رسُوْلِهِ» (رواهُ فى الموطأ) -

" امام مالک نے مرسلاً" روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک ان دونوں کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوں گے۔

(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ

(۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد کسی شخص کے لئے بھی یہ گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے انحراف کرے۔ حتی کہ اگر موسےٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے بغیر چارہ کار نہ ہوتا۔

«عن جابرٍ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ لَوْ کَانَ مُوسی حیًّا مَا وَسِعَہ إلا اتباعی»

(رواہ أحمد، والبیہقی، مشکوٰۃ ص ۳۰)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر موسٰے علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا"۔

«وفی روایۃٍ والذی نفسُ محمد ﷺ بیدہِ لو بدأ لکم موسٰی فاتبعتُمُوہ وترکتمونی لضلَلْتُم عَنْ سواءَ السبیل ولَو کان موسٰی حیًا وأدرکَ نبوتی لا تبعنی»

(رواہ الدارمی، مشکوٰۃ ص۳۲)

ترجمہ۔ "اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جن کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔ اگر وہ (یعنی موسٰی علیہ السلام) تمہارے سامنے ظاہر ہو جائے پس تم ان کی اتباع کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم راہ راست سے قطعاً بھٹک جاؤ گے' اگر موسٰے علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پالیتے تو بالضرور وہ میری ہی پیروی کرتے"۔

(دارمی۔ مشکوٰۃ : ۳۲)

(۱۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوری طرح محفوظ کرنے اور امانت نبوت دوسروں تک پہنچانے والے بارگاہ نبوت سے تازہ روئی کی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

«عن ابنِ مسعودٍ رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللہ ﷺ نضرَ اللہُ عبداً سمعَ مقالتِی فحفِظها ووعاها فأدّاها» (رواہ أحمد، والترمذی، أبو داود ابن ماجہ مشکٰوۃ ص۳۵)

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوش و خرم رکھے، جس نے میری حدیث سنی اور اسے یاد کیا اور محفوظ رکھا۔ پھر جیسی سنی تھی، ٹھیک ٹھیک ادا کر دی"۔

اور امام احمدؒ ترمذی اور ابو داوٗد ' ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (یہ تمام احادیث مشکوٰۃ شریف میں ہیں)

خدا تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت آپ کے سامنے ہے۔ ان دو شاہدوں کی شہادت کے بعد اہل ایمان کے لئے شک اور تردد کی گنجائش ظاہر ہے کہ باقی نہیں رہ جاتی۔ البتہ جن سے ایمان کی دولت ہی کو سلب کر لیا گیا ہو، کس کے اختیار میں ہے کہ ان کو تشکیک کے روگ سے نجات دلا سکے اور کونسا سامان ہدایت ہے جو ان کے لئے سود مند ہو سکے «فَمَا تغنِ الآیاتِ والنذر عن قومٍ لا یؤمنون»(جن کو ایمان نہیں لانا ہے ان کے لئے نہ کوئی آیت سود مند ہو سکتی ہے نہ کوئی ڈر سنانے والے)۔

سلامت طبع کے ساتھ قرآن پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ اسی قرآن کا حوالہ دے کر بتلانے والے لوگوں کو یہ بتلاتے ہیں کہ۔

"یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے حتیٰ کہ خود رسول (پیغیر صلوٰۃ و سلام) کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا 'کہ اسے بھی قطعاً" یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔

(معارف القرآن از پرویز)

مسلمانوں کے ہاتھ میں جو قرآن ہے اس کی بنیادی تعلیم اوپر معلوم ہو چکی ہے' جس میں بار بار اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر زور دیا گیا ہے' سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسا قرآن ہے جس کی بنیادی تعلیم اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی ہے اور قرآن کے وہ کونسے واضح اور غیر مبہم الفاظ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اطاعت کا حق سلب کیا گیا ہے۔ قرآن کی جو آیات اوپر نقل کی گئی ہیں۔ ایک دفعہ انہیں پھر سے بار بار پڑھ لیجئے اور ان کے ساتھ مسٹر پرویز کی مندرجہ بالا عبارت کو ملائیے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ اس سے بڑھ کر افترا علے اللہ کبھی کیا گیا؟

قرآن حکیم بتاتا ہے کہ نبی کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ قرآن کا نام چرانے والے مفتری اعلان کرتے ہیں کہ

"رسول .... کو بھی قطعاً حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔"

قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی قرار دیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اعراض کرنے والوں کو منافق قرار دیتا ہے لیکن قرآن کا نام بدنام کرنے والے منافق لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ۔

"اسے (نبی کو) بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ "کسی سے اپنی اطاعت کرائے"۔ بہرکیف قرآن کی آیات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پڑھ کر فیصلہ کیجئے کہ کیا یہی قرآن رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اطاعت کا حق چھین سکتا ہے؟ جس کی صدہا آیات میں بار بار حلفی تاکیدات کے ساتھ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

دنیا کی جس گمراہی پر غور کرو گے' اس کا آخری نقطہ اس قدر کج در کج اور پیچ در پیچ ہو گا جس سے عقل سلیم نفرت کرے گی اور جسے ثابت کرنے کے لئے زمین و

آسمان کے ہزاروں قلابے ملائے جائیں گے، تاہم عقل صحیح اسے ہدایت کی ادنیٰ ٹھوکر سے ٹھکرائے گی۔

فتنہ انکار حدیث نے کس قسم کے ہذیانات اور خرافات کو جنم دیا اس کی تفصیل تو شاید کسی دوسری جگہ آئے گی، لیکن ایک خرافاتی معمہ کا تذکرہ یہاں بھی کر ہی دینا چاہیئے۔

مطلب یہ کہ ایک طرف آپ ان کج طبع اور خام عقل لوگوں سے سنیں گے کہ وہ صاحب وحی صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا بیان کردہ "حق اطاعت" چھین لیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اطاعت کا یہی حق وہ "مرکز ملت" کے نام سے حکومت وقت کو دے ڈالتے ہیں۔ ایک طرف یہ چاہا جاتا ہے کہ پوری امت کا رشتۂ اطاعت اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاٹ دیا جائے۔ دوسری طرف ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے کہ ہر سکندر و دارا کو اللہ اور رسول مان کر اس کے سامنے سر نیاز خم کر دو۔ ایک جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام رسانی کے بعد منصب رسالت سے معزول کر دیا جاتا ہے۔ دوسری جانب بتلایا جاتا ہے۔(اور قلم کو تاب نہیں کہ اسے آسانی سے نقل کرنے پر آمادہ ہو) کہ۔

"قرآن حکیم میں جہاں اللہ و رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے۔" (معارف القرآن از پرویز)

استغفراللہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت و دشمنی کا یہ عالم کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات کا ماننا بھی گوارا نہیں کیا جاتا، دوسری طرف طاغوت کے ساتھ دوستی کا یہ حال کہ ہر ڈکٹیٹر کو خدائی اور رسالت کا منصب تفویض کیا جاتا ہے، اور اصرار کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں "اللہ و رسول" کا لفظ دیکھو۔ اس سے مراد صدر مملکت سمجھو، اور سچے خدا اور سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرو۔ اسکندر مرزا ہو

یا غلام محمد ' ناظم الدین ہو یا ایوب خان ' ذوالفقار علی بھٹو صدر ضیاء الحق ' جونیجو یا۔ بینظیر' جو بھی کرسی نشین اقتدار ہو ' اسی کو اللہ اور رسول سمجھو ! اسی کے سامنے ڈنڈوت بجالاؤ۔ اور چند ٹکے سیدھے کرنے کے لئے اللہ و رسول سے اطاعت چھین کر برسر اقتدار قوت کو دے ڈالو۔ ولا حولَ ولا قُوۃَ إلا باللہِ ستم یہ کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو نہ " اسلام طلوع " ہوگا ' نہ قرآنی ربوبیت منظر عام پر آئے گی بلکہ اسلام عجمی سازش کا شکار رہے گا۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو !

کیا اس سے زیادہ کجی اور زیغ پن کی مثال دنیا کی تاریخ پیش کر سکتی ہے ؟

انکار حدیث کوئی علمی تحریک نہیں۔ یہ جہالت کا پلندہ ہے۔ اس کا اصل منشا صرف یہی ہے کہ اب تک ایک ہی خدا کی عبادت اور ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاتی تھی۔ لیکن اس نام نہاد ترقی یافتہ دور کے تعلیم یافتہ آرزوؤں کو ہر روز نیا خدا چاہیے ، جس کی وہ پوجا کیا کریں ' اور ہر بار نیا رسول ہونا چاہیے جو ان کے لئے نظام ربوبیت کی قانون سازی کیا کرے ؟ خدا کا غضب ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ و رسول سے مراد " مرکز ملت " ہے لیکن ان میں کسی کو بھی اس کے سننے سے تے نہیں آتی۔

کیا کوئی ذی شعور تسلیم کرے گا کہ "اللہ" ذات پاک کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد "مرکز ملت" ہے اور "الرسول" کا لفظ جو قرآن میں بار بار آتا ہے اس سے مراد " محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " نہیں بلکہ اس سے مراد حکمرانوں کی وہ ٹولی ہے جو اپنے پاس سے قانون گھڑ گھڑ کر قرآن کے نام چسپاں کیا کرے ؟

﴿فویلٌ لِلذین یکتُبونَ الکتابَ بأیدیہم ثُم یقُولُونَ ہذا من عِند اللہ﴾

اب تک دنیا کے عقلا یہی بتلاتے رہے کہ اعلام شخصیہ میں شرکت جائز نہیں۔ یعنی زید جس خاص شخص کا نام رکھا گیا ہے لفظ زید جس وقت کان میں پڑے گا تو ذہن صرف

اسی شخص کی طرف منتقل ہوگا جس کا یہ نام رکھا گیا لیکن دوسروں کو "ملائیت اور وقتیا نوسیت کا طعنہ دینے والے پیران نابالغ آج بتلاتے ہیں کہ لفظ " اللہ " یا " الرسول " جس ذات خاص کا نام ہے اس سے وہ ذات خاص مراد نہیں بلکہ قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اس سے مراد صدر مملکت ہے جسے ہر پانچ سال بعد تبدیل کیا جا سکتا ہے کیا اس منطق کو سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ عقل و فہم کی ضرورت ہے ؟

عقل سوخت ز حیرت کہ چہ بوا لعجبی است

ماں ' باپ ' بہن ' بھائی ' بیوی ' بچوں کے مفہوم میں یہ تمام کجروی اختیار نہیں کی جاتی۔ لیکن اللہ رسول کے مفہوم میں عقل و فہم کے علی الرغم یہ کجی " مرکز ملت" کی تائید کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اور ماننے والے پوری " دانائی " کے ساتھ اسی کو مانتے چلے جا رہے ہیں جن مسکینوں کا اللہ و رسول ہی صنم اقتدار ہو جسکو مرکز ملت کہتے ہیں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انکے دین و ایمان علم و عقل اور فہم و دانش کا حدود اربعہ کیا ہے ؟ نیز بیچارے " قرآن " کے ساتھ ان کو کیا علاقہ ہے۔ جس کی آیتیں پڑھ پڑھ کر چودہ صد سالہ امت کو عجمی سازش کا شکار قرار دیا جاتا ہے۔

" فکرو نظر " کی کجی سے خدا کی پناہ ! اتنی صاف ' سادہ اور ستھری حقیقت کو ان فتنہ گروں کا ذہن قبول نہیں کرتا کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے نازل کرنے والے کی جانب اس کی توضیح و تشریح کا حق بھی عطا کیا گیا ہے۔ **لتبین للناس ما نزل الیھم۔"** اور جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کہلاتے ہیں ان کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کریم کو اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شرح و بیان کے ساتھ سمجھیں ' پڑھیں اور عمل کریں۔ اس لئے قرآن کے ماننے والوں کو لازم ہے کہ قرآن کی وہ علمی اور عملی تشریحات جو قرآن لانے والے کی جانب سے پیش کی گئیں ہیں ان کو بھی قبول کریں۔ اور قرآن کی کوئی ایسی شرح ایجاد نہ کریں جو صاحب قرآن کی پیش کردہ تعلیمات سے ٹکرا جائے یہ بات کتنی صاف اور

سیدھی ہے لیکن ان کے لئے نا قابل قبول ہے۔ اور اس کے برعکس بالکل ٹیڑھی ' ترش اور کج در کج بات کہ

" قرآن میں جہاں کہیں اللہ و رسول کا نام آیا ہے۔ اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے۔ " اسی کو ان کے کج دماغ اور مبتلائے فتنہ ذہن قبول کئے جا رہے ہیں۔

نعوذ با للہ من فتنہ الصدور و سیعلمون الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون○ ان ظالموں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوٹنے کے لئے کس جگہ لوٹ کر جاتے ہیں "۔

۳ - عہد صحابہ رضی اللہ عنھم میں حدیث کا مقام۔

قرآن و حدیث کے بعد ہمارے سامنے صحابہ کرامؓ کا تعامل ہے۔ صحابہ کرامؓ کے حالات پر صحیح غور و فکر کا جن لوگوں کو موقع ملا ہے، ان کو معلوم ہے کہ حضرات صحابہؓ کی سیرت کا ایک ایک باب اخلاص و انقیاد اور اتباع و امتثال کا حسین مرقع ہے۔ ان کی ہر ادا سے اتباع نبویؐ کی شان ٹپکتی ہے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے مشرف ہی اس لئے کیا گیا تھا تاکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات ' عبادات و معاملات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنی ذات میں جذب کرکے حسب استعداد آپ کے رنگ میں رنگین ہو جائیں اور بعد میں آنے والی امت کو اس رنگ میں رنگین کرتے چلے جائیں۔

معلم انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان بلا واسطہ شاگردوں کے متعلق یہ تصور کرنا کتنا گندا اور مکروہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور احادیث کو کوئی مرتبہ نہ دیتے تھے۔ العیاذ باللہ ' کج ذہنی اور خام عقلی کی حد ہے کہ تلاش کرنے والے اسی ذخیرہ حدیث سے جو سب کا سب صحابہؓ سے مروی ہے۔ آج ایسی

روایات تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ جن سے ثابت کیا جائے کہ معاذ اللہ صحابہ کرام حدیث نبوی کے دشمن، تعلیم نبوت کے مخالف اور سنت رسول کے مٹانے والے تھے۔ تعجب عقل و فہم کے ان مریضوں پر نہیں، بلکہ حیف ان نادانوں پر ہے جو ان دیوانوں کے ہذیانات پر وحی الٰہی کی طرح ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔

"دیوانہ گفت ابلہ باور کرد"۔

کیا کسی کی عقل باور کر سکتی ہے کہ جس امی قوم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو الرسول کی حیثیت سے کھڑا کیا گیا تھا اسی قوم میں سے جن حضرات کو آپؐ پر ایمان لانے کی توفیق دی گئی، آپ کی خدمت کے لئے جن کو چن لیا گیا، آپ کی حمایت اور نصرت کے لئے جن کو اٹھایا گیا اور آپ پر مر مٹنے ہی کے لئے جن کو آپ کے زمانہ میں پیدا کیا گیا۔ کیا وہ دنیا میں لائے ہی اس لئے گئے تھے کہ آپؐ کے تشریف لے جانے کے بعد آپ کی ایک ایک سنت کو مٹا ڈالیں۔ آپ کی سیرت کا ایک ایک ورق دھو ڈالیں اور آپؐ کے قول و فعل علم و عمل، سیرت و کردار، اخلاق و عادات اور قضایا و احکام میں سے ایک ایک کو بدل ڈالیں۔ کتابیں پڑھنے اور پڑھ پڑھ کر خدا کی مخلوق کو گمراہ کر دیں اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں انکار حدیث کی روایات تلاش کرنے سے پہلے کیا اتنی عقل سے کام لینا ضروری نہیں تھا کہ صحابہ کرام کو صحابہ بنایا کس مقصد کے لئے گیا تھا اور بعد میں آنے والے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو پیدا نہیں کیا گیا اس میں کیا حکمت ہے۔

جن نفوس قدسیہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے منتخب کیا گیا، مسلسل تئیس سال تک امتحان اور آزمائش کی بھٹی میں جن کو نکھارا گیا، جن کو تعلیم و تربیت، تزکیہ و تطہیر، اصلاح و تکمیل کے لئے عالم انسانیت کے سب سے بڑے معلم، سب سے بڑے مصلح صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا، خداوند قدوس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی آخری شریعت کا سب سے پہلا امین اور

محافظ جن کو بنایا گیا اور طویل مدت تک اسوہ حسنہ کا رنگ جن کی زندگی کے ہر خاکہ میں بھرا گیا۔ مسجد نبوی کے علاوہ بدر کے میدانوں' احد کی پہاڑیوں۔ حدیبیہ کی وادیوں' حنین کی گھاٹیوں اور تبوک کے کھنڈرات کو جن کے لئے تعلیم گاہ قرار دیا گیا۔ کیا انہی کے متعلق عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رخصت ہو جانے کے بعد قرآن کے سوا وہ اپنے نبی کی ہر تعلیم سے بیگانہ' آپؐ کی ہر سنت سے نا آشنا ہو گئے ہوں گے۔ اور ان کے نزدیک آپ کی احادیث کا مرتبہ محض بے سروپا داستان سرائی ہو گا۔ استغفراللہ ! پیش کرنے والے (حکام وقت کی رضا جوئی کے لئے) اسی نظریہ کو جو پیش کر رہے ہیں بتلایا جائے کہ فساد ذہن اور خلل دماغ کے سوا ' عقل اس کی کیا توجیہ کر سکتی ہے ؟ نعوذ باللّٰہ من لتنتہ الصلور۔

صحابہؓ کرام جنہوں نے ایک ہی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لئے بیوی بچوں سے جدا ہو جانا گوارا کیا۔ خویش و اقربا کو چھوڑا ' قبیلہ اور قوم سے منہ موڑا ' ملک بدر ہوئے ' جاہ و جلال اور زر و مال کو بھی خیرباد کہا ' الغرض جو پوری کائنات سے کٹ کر ایک ہی ذات کے قدموں میں آپڑے تھے ' جو جلوہ ہائے رنگا رنگ سے ہٹ کر ایک ہی جلوہ جہاں آرا پر نظریں جما چکے تھے ' جو ایک ہی مطاع کے سامنے مٹ کر اپنی زندگی کو ایک ہی زندگی میں فنا کر دینے کا عزم کر چکے تھے ' جو ایک ہی مقتدأ کی اتباع میں اپنی تمام خواہشات سے دست کش ہو جانے کا فیصلہ کر چکے تھے ' جن کی وارفتگی کو دیکھ کر حقیقت ناشناس ان کے بے عقل و ناداں اور رفتار زمانہ سے ناواقف ہونے کا طعنہ دیا کرتے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ کافر اور منافق لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھ کر کہتے تھے ﴿غَرَّ هٰؤُلَاءِ دِيْنُهُمْ﴾ " ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا "۔

﴿أَنُؤْمِنُ كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ﴾ (القرآن)

" کیا ہم نبی اور نبی کی ہر بات کو ایسا مان لیں جیسا یہ کم عقل مان بیٹھے ہیں " جن صحابہؓ کی جاں نثاری کا تماشہ وقت کے سب سے بڑے دشمن سے بھی خراج عقیدت

وصول کر لیا کرتا تھا۔

زید بن وثنہ کو جب بر سردار کھینچنے کے لئے میدان میں لایا گیا، تو ابوسفیان نے (جو بعد میں رضی اللہ عنہ کا مصداق بنے) کہا، صرف اتنا لفظ زبان سے کہہ دو کہ کاش میری جگہ "محمد رسول اللہ ہوتے" تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن کسی کی محبت میں تختہ دار جس کے لئے تیار کیا گیا تھا، جانتے ہو اس کی زبان سے کیا لفظ نکلا۔

«واللہِ مَا أحبُ إنَّ محمداً الآن فی مکانہ الذی ھُوَ فیہ تُصیبہ شوکۃٌ وأنا جالِسٌ فی أھلی

(الشفاء بتعریب حقوق المصطفیٰ قاضی عیاضؒ)

"بخدا مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ اب تشریف فرما ہیں، اس جگہ آپ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر بیٹھا رہوں۔"

اس جاں گداز فقرے کو سن کر پتھر دل مجمع تڑپ گیا۔
ابوسفیان کو اقرار کرنا پڑا اور اقرار صرف اس کے متعلق نہیں جس سے یہ فقرہ سنا گیا بلکہ پوری ایمانی برادری کے متعلق ابوسفیان کا اقرار ہے۔

«ما رأیتُ مِنَ النّاسِ یُحِبُ أحَداً کَحُبِ أصْحاب محمدٍ مُحمَداً ﷺ

"محمدؐ کے صحابہ محمد کے ساتھ جس قدر محبت کرتے ہیں، میں نے ایسی محبت کسی کو کسی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔"

جو حضرات اپنے باپ کا سر کاٹ لانے کے لئے محض آپؐ کے اشارہ چشم کے منتظر رہا کرتے تھے۔ جو عمر بھر گریبان کھلا رکھنے کے اس وجہ سے عادی ہو گئے تھے کہ کسی کو انہوں نے ایک دفعہ کھلے گریبان دیکھ لیا تھا، جو سر کے بال اس لئے نہیں کٹواتے تھے کہ کسی کا ہاتھ ایک دفعہ ان بالوں پر پھر گیا تھا۔ جو خاص قسم کی سبزی کے اس لئے

گرویدہ ہوگئے تھے کہ اس کی رغبت ان کو کسی میں محسوس ہوگئی تھی۔

سوچنا چاہئے کہ ان کا حال اس محبوبؐ کے ساتھ کیا ہوگا اور اس محبوب کے ارشادات کی ان کے نزدیک کیا قدر و قیمت ہوگی۔ سچ تو یہ ہے اور اس کا صحیح اندازہ بھی بیچارے بعد میں آنے والوں کو کب ہو سکتا ہے اور ان جذبات و احساسات کی پوری تصویر کشی بھی کب ممکن ہے۔ بالخصوص جب اس پر بھی نظر کر لی جائے کہ جس جلوہ جہاںؐ آرا کی زیارت سے دیدہ و دل کی روشنی کا سامان ان کو میسر ہوا کرتا تھا، اب وہی ان کی نظروں سے پردہ میں جا چکا تھا۔ جس شمع عالم افروز پر پروانہ وار جانثاری کا منظر وہ رات دن پیش کیا کرتے تھے۔ وہی شمع عالمتاب اب محفل سے اٹھائی جا چکی تھی۔ ان کے ہر درد کا درماں جس چہرۂ انور کی زیارت تھی۔ وہی ان کے سامنے سے اوجھل ہوگیا تھا۔ ان حالات میں ان کے زخمِ دل کا مرہم اور داغِ جگر کا مداوا بجز تکرار حدیث یار ہو بھی کیا سکتا تھا؟

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

راقم الحروف کو چند گھنٹوں کے لئے ایک معمر خاتون کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ ان کے والد ماجد ایک پختہ عالم اور درویش طبع انسان تھے۔ والد ماجد کی تعلیم سے زیادہ تربیت کا ان پر گہرا اثر تھا۔ اسی خاتون کو میں نے دیکھا کہ بار بار ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا۔ ابّا جی اسی طرح کیا کرتے تھے۔ ابّا جی یہ مسئلہ اس طرح بیان کیا کرتے تھے۔

میں تنہائیوں میں بار بار سوچتا ہوں کہ یا اللہ! جو خوش قسمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ تربیت یافتہ تھے بلکہ مجھے اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ جن حضرات کی تعلیم و تربیت کا سامان خود رب العزت جلّ مجدہ کی جانب سے کیا جا رہا تھا اور قدم قدم پر جن کی تربیت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار

ہدایات فرمائی جا رہی تھیں جیسا کہ قرآن حکیم کی آیات شاہد ہیں ' ملائکۃ اللہ کو جن کی تثبیت (ثابت قدم رکھنے) کے لئے بھیجا گیا تھا ' الغرض وحی اور صاحب وحی جس کی تربیت کے نگران تھے ان کی تربیت کا رنگ کتنا گہرا ' کتنا پختہ ' کتنا پائیدار اور کتنا انمٹ ہوگا؟ ﴿صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً﴾

سوچا نہیں جاتا جس آفتاب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی کرنیں ' آج چودہ صدیوں کے فاصلے پر بھی کروڑوں قلوب کو روشن اور تابناک کر رہی ہیں وہی آفتاب خوش قسمتی سے جن کے گھر طلوع رہا ان کے آئینہ قلب کی روشنی کا کیا عالم ہوگا۔ لمبی لمبی راتوں میں تڑپنے والے قلب کی حرارت جب ہزار سال بعد بھی بے شمار دلوں کو گرما اور تڑپا رہی ہے جن کے سامنے وہ تڑپایا جاتا تھا اور اس کے سینے سے ہنڈیا پکنے کی آواز جن کو ان نا سوتی کانوں سے سنائی دیا کرتی تھی ان کی گرمئی باطن اور سوزِ دروں کا کیا حال ہو گا ۔ ان باتوں کو کہاں تک بیان کیا جائے۔

نہ حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

بہر کیف عقلیں اگر ماؤف نہیں ہو گئیں . دماغوں سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں اگر بالکلیہ رخصت نہیں ہو گئیں تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان حالات میں جن کا ایک شمہ نقل کر چکا ہوں ' صحابہ کرامؓ کے متعلق کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے محبوب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ادائیں یکسر بھول گئے ہوں گے یا وہ ان کو قصہ کہانی سے زیادہ کوئی وقعت نہ دیتے ہوں گے لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا

لوگوں کو آج تعجب ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک جملہ حدیث کی تصدیق و تائید کے لئے ایک ایک ماہ کی طویل مسافت کیسے طے کیا کرتے تھے وہ طلب حدیث کے نشہ میں گرما و سرما کی شدتوں سے بے پروا کیسے ہو گئے تھے ' صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر جب آجاتا ان کا رنگ کیونکر بدل جاتا تھا ' ان کے بدن پر لرزہ کیونکر طاری ہو جاتا تھا ' ان پر گریہ وزاری اور رقت و بے قراری کی کیفیت کس لئے طاری ہو جاتی تھی!

ہائے! تعجب سے سر پیٹنے والے ان نادانوں کو کس طرح سمجھایا جائے کہ عشق نبویؐ کی جو آگ انکے دلوں میں لگا دی گئی تھی اس کا نتیجہ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا؟

حضرت صدیقؓ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

یہاں تک جو بیان کیا جا چکا ہے اس سے ہر ذی شعور عقل سلیم کی روشنی میں فیصلہ کر سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا تعلق حدیث اور صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسا تھا۔ اب اس طرف توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام تھا۔ صحابہ کرامؓ قرآن حکیم کے بعد حدیث نبوی کو دینی حجت قرار دیتے تھے۔ یعنی جس طرح قرآن کریم کا ہر فیصلہ ناطق ہر حکم واجب العمل اور ہر فرمان واجب الاطاعت ہے' (بشرطیکہ منسوخ نہ ہو) کتاب اللہ کے بعد ٹھیک یہی حیثیت صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث رسول کی تھی۔ ان کا ایمان اور عقیدہ یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فیصلہ ہر حکم ہر ارشاد اور ہر فرمان وحی خداوندی ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح قرآنی بینات سے اعراض کرنے والوں کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں صحابہ کرام کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ انہوں نے کسی حدیث کو صرف اس وجہ سے رد کر دیا ہو کہ معاذ اللہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ان کے لائے ہوئے دین میں کوئی مقام نہیں' اس لئے نہ ہمارا حدیث پر ایمان ہے نہ وہ ہمارے لئے دینی سند ہے۔ اس قسم کے نظریات کو صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرنے والے افترا پرداز جس ملحدانہ نجاست سے صحابہؓ کرام کے دامن کو آلودہ دیکھنا چاہتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی تدبیروں کے باوجود ناکام رہیں گے۔ (و ان کان مکرھم لتزول منہ الجبال)

واقعہ جیشِ اُسامہ (رضی اللہ عنہ)

نظر صحیح سے اگر کام لیا جاتا تو حضرت صدیقؓ کی خلافت میں پیش آنے والا صرف ایک واقعہ ہی حدیث سے متعلقہ تمام شکوک و شبہات کو دفع کرنے کے لئے کافی ثابت ہوتا۔ میرے نزدیک خلافت کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد حضرت صدیقؓ کا پہلا کارنامہ مرتبۂ حدیث کی تعیین اور مقام سنت کی تشخیص تھا۔ میرا اشارہ جیش اُسامہؓ کے واقعہ کی طرف ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری ایام میں سرحد شام کی طرف بھیجنے کے لئے حضرت اُسامہ بن زیدؓ کی امارت میں لشکر تیار فرمایا۔ مدینہ طیبہ سے کچھ فاصلہ پر مقام جرف میں یہ لشکر ابھی جمع ہو رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا سانحہ کُبریٰ پیش آیا۔ آپؐ کے وصال پر ملال کی خبر سن کر یہ سارا لشکر مدینہ طیبہ واپس آگیا۔

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت اسامہؓ کو دوبارہ تیاری کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

«أَنفِذْ فِيْ وجهكَ الذى وجهكَ فيه رَسُولُ الله»

(جس مہم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو روانگی کا حکم دیا تھا اس کے لئے روانہ ہو جاؤ)

چنانچہ لشکر دوبارہ اسی جگہ جمع ہونا شروع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حالات کس قدر نازک ہو چکے تھے اس کا کچھ اندازہ آج بھی تاریخی وثائق سے کیا جاسکتا ہے۔ حالات کی اسی نزاکت کے پیش نظر کبار صحابہؓ کو لشکر اسامہ کا بھیجا جانا شاق گذرا۔ حضرت عمرؓ عثمانؓ ابوعبیدہؓ سعد بن ابی وقاص اور

سعید بن زید رضی اللہ عنہم جیسے اہل حل و عقد صحابہ کا وفد بارگاہ خلافت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

" اے خلیفہ رسول اللہ ! عرب آپ پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے ہیں۔ اس مٹھی بھر لشکر کو منتشر کر دینا خلاف مصلحت ہے۔ براہ کرم اس لشکر کو مرتدین کے مقابلہ میں بھیجئے اور لشکر کا کچھ حصہ مدینہ طیبہ کی حفاظت کے لئے یہاں رکھیے۔ دشمن کی طرف سے براہ راست مدینہ طیبہ پر اگر حملہ کر دیا جائے جس کا ہر وقت اندیشہ ہے تو آپ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا کیا انتظام کریں گے ؟ روم سے سر دست ایسا کوئی خطرہ نہیں کہ ان کی طرف پیش قدمی ضروری ہو اس لئے بہ مقابلہ روم لشکر کشی میں اگر توقف کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے پہلے مرتدین سے نمٹ لیا جائے پھر آپ بصد خوشی اسامہ کو بھیج سکتے ہیں "۔

نہیں کہا جا سکتا کہ اراکین وفد نے حالات کی الجھن کو کس بے چینی کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا ہوگا۔ کس قدر مبسوط تقریریں ان کی جانب سے اس موضوع پر کی گئی ہوں گی اور کس قسم کے دلائل سے اپنا مؤقف سمجھانے کے لئے انہوں نے استدلال کیا ہوگا۔ البتہ روایت کے الفاظ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ارکان وفد کے پاس ترکش سخن کا کوئی تیر باقی نہیں رہ گیا تھا جس کو انہوں نے استعمال نہ کر لیا ان کی پوری تقریر سن کر خلیفہ اسلام نے استفسار فرمایا هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ يُرِيدُ أَنْ يَقُولَ شَيْئاً »

"آپ حضرات میں سے کوئی صاحب کچھ اور تو نہیں کہنا چاہتے"

وفد کے تمام ارکان نے بیک زبان کہا " نہیں " ہمیں جو کچھ کہنا تھا وہ آپ سن چکے ہیں۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا جواب سننے سے پہلے اس پر غور کیجئے کہ اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بھیجنے یا نہ بھیجنے کا مسئلہ بظاہر ایک وقتی اور ہنگامی قسم کا مسئلہ تھا پھر جن حالات میں یہ اکابر صحابہؓ لشکر اسامہ کو روک لینے کا مشورہ دے رہے تھے

ان حالات میں ان کا مشورہ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا جانشین جس کو بنایا گیا تھا اس کے نزدیک یہاں بحث کسی خاص لشکر کی نہیں بلکہ فیصلۂ نبوت کی تھی۔ عوام نہیں بلکہ جیساکہ میں نے عرض کیا اکابر صحابہؓ اور مہاجرین اولین کے نزدیک بھی صرف ایک لشکر کے نہ بھیجنے کا سوال تھا اور جن حالات میں یہ مشورہ ان کی طرف سے پیش کیا جا رہا تھا' بعد کے نتائج کو اگر سامنے نہ رکھا جائے تو ہر دیکھنے اور سننے والا ان کے اس مشورہ کو مبنی بر صواب قرار دینے پر مجبور ہو گا۔ لیکن نبی کے وصال کے بعد یتیم امت کا سربراہ اور متولی جس کو بنایا گیا تھا۔ اس کے نزدیک یہاں کسی لشکر کے بھیجنے یا نہ بھیجنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اصل سوال صرف یہ تھا کہ لشکر اُسامہؓ کو روم بھیجنے کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرما چکے ہیں اور حالات کچھ ہو جائیں، آسمان ٹوٹ پڑے' زمین شق ہو جائے' پہاڑ ہل جائیں اور دنیا تہہ و بالا ہو جائے لیکن پوری امت کے مقتداء اور پوری امت کے امام کے لئے کیا یہ گنجائش ہو سکتی ہے کہ فیصلۂ نبوت کو بدل دے۔ نہیں! ہرگز نہیں۔ یہی اکابر صحابہؓ جو نازک ترین حالات کا حوالہ دے کر لشکر اُسامہ کے روک لینے کا مشورہ دے رہے تھے، وہ وہی سن رہے تھے (خدا ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے کہ ان کے طفیل آج ہم اور آپ بھی سن رہے ہیں) کہ خلیفہ اسلام ان کے جواب میں فرما رہے ہیں۔

«والذی نفسی بیده لو ظننتُ أنَ السباعَ تأكُلني
بالمدينة لأنفذتُ هذا البعث ولا بُدَ أنْ يؤب مِنه
كيف ورسُولَ الله ﷺ ينزل عَليه الوحيُ مِن السماءِ
يقُولُ أنفِذُوا جَيش أسَامة»

(حیات الصحابہ ج-۱ صہ۱۰٤)

ترجمہ: " اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مجھے اندیشہ بھی ہو کہ اس لشکر کو بھیج دینے کی صورت میں مجھے درندے کھا جائیں گے تب بھی میں اس لشکر کو بھیج کر رہوں گا اور اسے وہاں سے ہو کر ہی آنا ہوگا میں اس لشکر کو بھیجنے سے کیسے رُک جاؤں، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آسمان سے وحی نازل ہو رہی تھی اور آپؐ فرماتے تھے، اُسامہؓ کے لشکر کو بھیجو"۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عقیدہ!

حضرت صدیقؓ کے اس پُر حکمت ارشاد میں اسلام کے کتنے بڑے اصول کو بیان کر دیا گیا۔ تفصیل تو اس کی شاید کسی دوسرے موقع پر کر سکوں گا لیکن اجمالاً اتنا تو یہاں بھی سمجھ ہی لینا چاہئے کہ نبی کی پوری امت اور اور علماء امت کا عقیدہ کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی جلی جِسے قرآن کہا جاتا ہے دوم وحی خفی جسے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل بھی وحی الٰہی میں مندرج ہے۔ آپ جو کچھ کہتے تھے اپنی خواہش اور رائے سے نہیں کہتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی اور مرضی خداوندی کی روشنی میں کہتے تھے۔ اسی طرح جو فعل بھی آپؐ سے صادر ہوتا تھا۔ وہ بھی ہوائے نفس اور تقاضائے ہوس سے نہیں بلکہ وحی خداوندی کے تحت ہوتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ معاذاللہ آپؐ کا کوئی فعل یا ارشاد رضائے خداوندی کے خلاف ہو اور وحی الٰہی خاموش رہے۔ اس لئے آپؐ کے جملہ اقوال و افعال جسے حدیث کہا جاتا ہے' کی حیثیت بھی وحی الٰہی کی ہے۔ بہرحال علماء اسلام کا یہ عقیدہ کہ حدیث نبوی وحی الٰہی وحی خفی ہے' کیا یہ عقیدہ کسی عجمی سازش کی پیداوار ہے؟ معاذ اللہ۔

•حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ « کیف ورسولُ اللہ ﷺ ینزِلُ

عليه الوحيُ مِن السماء۔

"اسامہ کا لشکر بھیجو۔ میں اس لشکر کو کیسے روک لوں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آسمان سے وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ فرما رہے تھے۔
«أنفِذُوا جَيشَ أُسَامة» اسامہؓ کا لشکر بھیجو۔"

میں کیا اس عقیدہ کا اظہار نہیں کیا جا رہا۔ انفذوا جیش اسامہ کا جملہ جو لسان نبوت سے صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی کسی آیت کا جزو نہیں لیکن امت کے سب سے پہلے خلیفہ سے آپ سن رہے ہیں کہ اکابر صحابہ کی موجودگی میں وہ اس کے وحی من السماء (آسمانی وحی) ہونے کا اعلان پوری قوت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلیفہ اسلام کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم اور ہر فیصلہ وحی من السماء میں داخل ہے اور جس طرح قرآن حکیم وحی الٰہی ہونے کے سبب ملت اسلامیہ کے لئے دینی حجت ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فیصلہ دینی سند ہے جس طرح قرآن حکیم کا منبع وحی الٰہی کا منبع ہے، اسی طرح حدیث نبویؐ کا منکر وحی من السماء (آسمانی وحی) کا منکر ہے۔ خلیفہ اول کے بیان کئے ہوئے اس عقیدہ کو عجمی سازش قرار دے کر پوری امت کو گمراہ قرار دینے والوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ خود ہی کسی شیطانی سازش کا شکار تو نہیں؟

صدیقی عقیدہ کہ احکام نبویہؐ نا قابل تغیر ہیں،

بہرحال حضرت صدیقؓ کے اس صدیقانہ جملہ سے ایک اصول تو یہی ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث "وحی من السماء" ہیں اس لئے امت کے لئے ان کا درجہ وہی ہوگا جو وحی الٰہی کا ہونا چاہئے۔ دوسرا قاعدہ جو اسی پہلے عقیدہ پر

مرتب ہوتا ہے۔ اس صدیقی ارشاد سے یہ ثابت ہوا کہ دین کی جن جزئیات کو وحی من السماء (آسمانی وحی) نے متعین کر دیا ہے۔ ان جزئیات میں تغیر و تبدّل اگر ہو سکتا ہے تو وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی نام نہاد مرکز ملت بصیرت قرآنی کے دعوے کے ساتھ ' ان جزئیات میں تغیر و تبدل کی جرأت کرے تو اسے وحی الٰہی میں تحریف کا مجرم قرار دے کر بیک بنی و دو گوش ملت اسلامیہ سے خارج قرار دیا جائے گا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر خلیفہ راشد کون ہوگا اور جن اکابر صحابہ کا مجمع آپ کے گرد جمع تھا ان سے بڑھ کر قرآنی بصیرت کسے حاصل ہو سکتی ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ لشکر اُسامہؓ کو روک لینے پر محض اس لئے راضی نہیں کہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اَنفذوا جَیشَ اُسامہ کی تحریف اس سے لازم آتی ہے۔

پس جبکہ ایک فوجی نوعیت کے جزوی حکم کو نہیں بدلا جا سکتا تو کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو احکام عبادات ' معاملات' خصومات اور اخلاق سے متعلق ہیں، ان کے کسی ایک شوشے کو دنیا کی کوئی قوت بدل سکتی ہے۔

سیدنا صدیق اکبرؓ کے ارشاد کے موافق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اقوال و ارشادات وحی من السماء ہیں تو اس وحی آسمانی کی متعین کردہ جزئیات میں تبدیلی کی جرأت کسی شیطان کو ہو تو ہو کسی مسلمان کو کب ہو سکتی ہے۔ اس جملہ سے ایک اور مطلب کی بات نکل آئی وہ یہ کہ جب حدیث رسول اللہ وحی آسمانی ہے اور اس کے متعین کردہ جزئیات اسی طرح ناقابل تبدیلی ہیں جس طرح قرآنی جزئیات تو اس سے ثابت ہوا کہ حالات کی تبدیلی کا سہارا لے کر اگر کوئی شخص احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلو تہی کرنا چاہے تو اس کی بھی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

حضرت صدیقؓ کا یہ جملہ کس قدر ایمان و یقین میں ڈوبا ہوا جملہ ہے کہ " اگر مجھے درندے بھی مدینہ میں کھا جائیں تب بھی میں اس لشکر کو بھیج کر رہوں گا۔" اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی آسمانی سے یہ حکم فرمایا ہے کہ اُسامہ

کے لشکر کو بھیجو اور یہ قصہ کیا یہیں ختم ہو گیا؟ جیسا کہ میں نے کہا ایک طرف اکابر صحابہؓ حالات کی نزاکت سے بے چین تھے۔ ان کے لئے یہ تصور بھی ناقابل برداشت تھا کہ حضرت اُسامہ کے ساتھ اہل اسلام کی عظیم جمعیۃ اگر مدینہ سے باہر دور دراز سفر کے لئے نکل گئی تو مدینۃ الرسول کی حفاظت کس طرح ہو گی۔ مدینہ طیبہ میں رہ جانے والے بیچاروں پر دشمن اگر حملہ کر دے تو ان کی مدافعت کا کیا سامان ہوگا اور مسلمانوں کے بیوی بچوں کے علاوہ خود اُمّہات المومنین کی حرمت کو خدانخواستہ خطرہ اگر لاحق ہو تو اس کے لئے کیا صورت کی جائے گی۔ حالات کی یہی پیچیدگی عام صحابہؓ کے علاوہ خود امیر جیش حضرت اُسامہؓ کو بھی بے چین کئے جا رہی تھی چنانچہ امیر لشکر نے پھر حضرت عمرؓ کو بھیجا کہ خلیفۂ رسول کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی طرف سے واپسی کی اجازت طلب کریں پیغام میں اسی بے چینی کا اظہار تھا۔

«فإن مَعِي وُجوهُهُم واعياءهم ولا أمن على خليفةِ رسُولِ الله وثَقَلُ رسول الله وأثقال المسلمين أن يتخطفهُم المشركون۔

" مدینہ کی تمام قوت میرے ساتھ ہے۔ اس صورت میں خلیفہ رسول اللہ اور ازواج مطہرات اور مسلمانوں کے بیوی بچوں کے معاملہ میں مجھے بے اطمینانی ہے کہ دشمن ان کو اچک نہ لیں"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر لشکر کا یہ پیغام لے کر چلے تو آتے ہوئے انصار نے ان سے کہا کہ اگر خلیفہ رسول اس لشکر کے بھیجے بغیر راضی نہ ہوں تو ان کی خدمت میں ہماری یہ درخواست پیش کر دیں کہ

أن يولي علينا رجُلا اقدمُ سناً من أسامة»

"اُسامہ کے بجائے کسی بڑی عمر کے آدمی کو ہم پر امیر مقرر کر دیں"۔

حضرت عمرؓ امیر لشکر کا پیغام لے کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے عام اندازہ یہی تھا کہ خلیفہ رسول اللہ سپہ سالار کے پیغام کو سن کر شاید نرم ہو جائیں گے۔ عام صحابہؓ کے علاوہ سالار جیش کے نزدیک بھی یہ لشکر کشی کا تقاضائے وقت سے چونکہ آہنگ نہیں تھی۔ اس لئے قوی امید کی جا سکتی تھی کہ خلیفہ اعظم اپنے حکم پر نظر ثانی فرمائیں گے اور لشکر کو واپسی کا حکم ہو جائے گا اس موقع پر صحابہؓ کی نظر ایک طرف تقاضائے حالات پر تھی تو دوسری طرف صدیق اکبر کا اصرار لشکر کشی ان کے لئے اچھا خاصہ معمہ تھا۔ لیکن حضرت صدیقؓ کی بصیرت ایمانی کا فیصلہ یہ تھا کہ اسلام یا مسلمانوں کی حفاظت کا راز کسی لشکر کے بھیج دینے یا روک لینے میں نہیں۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فیصلہ کی حفاظت میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کی حفاظت اگر کر لی گئی تو اسلام زندہ رہے گا اور مسلمان بھی محفوظ رہیں گے۔ خدانخواستہ جس دن فیصلۂ نبوت مسلمانوں کے ہاتھوں میں محفوظ نہ رہا اس دن نہ مسلمانوں کو کوئی لشکر دشمن سے بچا سکے گا' نہ غریب اسلام ہی کی حفاظت ہو سکے گی۔ حضرت عمرؓ نے خلیفہ رسول اللہ کی خدمت میں امیر لشکر کا پیغام جب نقل کیا تو سن کر فرمایا۔

«ولو اختطفنی الکلابُ والذیابُ لم أرد قضاءً قضاهُ رسُولُ اللهِ ﷺ»

"مجھے اگر کتے اور بھیڑیئے بھی گھسیٹ کر لے جائیں تب بھی میں اس بات کو تبدیل نہیں کر سکتا جس کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں"۔

یہاں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے لشکر بھیجنے کے لفظ ہی کو حذف فرما دیا۔ اصل بات نکھر کر سامنے آگئی کہ فیصلۂ نبوت نا قابل تبدیل ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت صدیقؓ لشکر اسامہ کے روک لینے پر کبھی رضا مند نہ ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے انصار کی درخواست پیش کی یعنی اسامہ کم عمر ہیں ان

کے بجائے کسی بڑی عمر کے آدمی کو لشکر کا امیر مقرر کر دیا جائے۔

وہی صدیق اکبرؓ جن کے حلم و بردباری ' متانت اور وقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر حلم خلیل اللہی کے ہمرنگ قرار دیا تھا، اس درخواست کو سن کر ان ہی پر دیکھا گیا کہ یکایک جلال موسوی طاری ہو گیا۔

«فوثب أبو بکر، وکان جالساً فأخذ بلحیته عُمر وقال ثکلتك أُمُّكَ وعَدَمتكَ أُمُّكَ یا ابن الخطاب استعمله رسولُ الله ﷺ وتأمُرُنی أن أنزعَه»

" ابوبکر بیٹھے تھے۔ اچانک اپنی جگہ سے اچھلے اور لپک کر عمر کی داڑھی پکڑ لی اور فرمانے لگے۔ اے خطاب کے بیٹے تیری ماں تجھے گم پائے اور تیری ماں تجھے مردہ پائے۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر بنایا ہے اور تو مشورہ دیتا ہے کہ میں اسے معزول کر دوں "۔

آج خلیفہ رسول کی جانب سے خلیفۃ اللہ (موسیٰ علیہ السلام) کی سنتِ جوش و جلال کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے غور کرو کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل قرآن کے ان الفاظ کی کیسی عمدہ تصویر ہے۔

«فأخذَ بلحیة أخیه یجرُّه إلیه»

" موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون کی داڑھی پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے"۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا پر جلال انداز اس وجہ سے تھا کہ ہارون علیہ السلام قوم کو گئو سالہ پرستی کی گمراہی میں مبتلا دیکھ کر پھر بھی اسی قوم میں رہنا کیسے برداشت کر سکے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اطلاع دی کہ :

قال یا هارونُ ما منعكَ إذْ رأیتَهم ضلّوا أنْ لا تتبعنِ،
أ فعصیتَ أمری ﴾

ترجمہ: "موسیٰ علیہ السلام نے ہارون سے فرمایا۔ "اے ہارون
جب تو نے قوم کو دیکھ لیا تھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تجھے کیا مانع
پیش آیا کہ تم قوم کو چھوڑ کر میرے پیچھے نہ آئے"۔

ادھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ غیظ و غضب اس لئے تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی فاروقی بصیرت نے ایسے پیغام کو کیوں گوارا کیا جس سے فیصلہ نبوت میں ادنی تبدیلی کا وہم پیدا ہو سکتا تھا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ پیغام بھیجنے والوں کے وہم و گمان میں تھا کہ اُسامہؓ کی معزولی سے فیصلۂ نبوت میں تبدیلی ہو جائے گی' نہ پیغام لانے والے کے خواب و خیال میں تھا کہ اس مشورہ پر عمل کرنے سے نبوت کے فیصلوں کو پس پشت ڈالنے کا دروازہ کھل سکتا ہے لیکن "صدیقی فراست" اس نکتہ کو پا رہی تھی اس لئے انہوں نے حضرت عمر کی داڑھی پکڑ کر اس فتنہ کا ہمیشہ کے لئے سد باب کر دیا تاکہ آئندہ کسی شکم سیر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ کی جرأت نہ ہو۔ اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے فیصلۂ نبوت کی حفاظت کے لئے اتنی شدت کا اظہار نہ کیا جاتا اور أسامہؓ کی جگہ کوئی دوسرا امیر مقرر کر دیا جاتا تو کہنے والوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ امیر کو معزول کر دیا تھا۔ اسی راستہ سے دین میں تراش و خراش اور فیصلۂ نبوت میں کتر بیونت کا موقع لوگوں کو مل جاتا۔ لیکن صدیق اکبرؓ پر خدا کی ہزاروں نعمتیں نازل ہوں پوری امت کی جانب سے ان کو جزائے خیر دی جائے کہ انہوں نے ہر شدت کو گوارا کیا۔ مگر حدیث نبوی کے حصار میں شگاف نہ آنے دیا۔ ہر آزمائش کا مقابلہ کیا مگر فیصلۂ نبوت میں ادنٰی تغیر کو برداشت نہ کیا۔ "فجزاہُ اللہ عنا"

حضرت صدیقؓ کے اس موسوی طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ حضرت صدیق کی قرآنی بصیرت میں حدیث نبوی سے اعراض اور فیصلۂ نبوت سے انحراف "گوسالہ پرستی کے ہمسنگ تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دعوے بے جا ہو گا۔

حضرت صدیق کی طرف سے اپنے بھائی و عمر کی داڑھی پکڑ کر کپکپاتے ہوئے جسم اور لرزتی ہوئی آواز میں جب کہا جا رہا تھا۔

«استعمله رسولُ الله ﷺ وتأمرني أن أنزعه»

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امیر مقرر کیا ہے تو مجھے کہتا ہے کہ میں اسے معزول کر دوں۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ کچھ زمانہ بعد ایسے "سامری صفت" بھی پیدا ہوں گے جو حکامِ وقت پر اللہ و رسول کا نام چسپاں کرتے ہوئے۔

﴿هٰذا إلٰهكم وإله موسىٰ فنسى﴾

(القرآن الحکیم)

"یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا، موسیٰ تو بھول کر طور پر چلا گیا" کا "سامریانہ" نعرہ لگائیں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے تمام بیّنات میں قطع و برید کر ڈالنا ہی ان کے نزدیک "قرآنی بصیرت" "سنت جاریہ" اور ملکۂ اجتہاد قرار پائے گا۔

«يقرأون القرآن ولا يجاوز تراقيهم»

"وہ قرآن پڑھیں گے لیکن کیا مجال کہ ان کے حلق سے نیچے اتر جائے"۔

اور لطف یہ کہ انہیں سامری صفت دجالوں کو ایسے سادہ لوح پرستار بھی مل جائیں گے جو اپنی عبادت کی وجہ سے اس نئے گؤ سالہ سامری "مرکز ملت" کو سچ مچ اللہ و رسول مان لیں گے اور چودہ صدیوں کے ہارون صفت علماء ربانی کی ہارونی نصیحت

«يا قوم إنما فتنتم به وإن ربكم الرحمن فاتبعوني

وأطیعوا أمری ﴾

(القرآن الحکیم: طٰہٰ)

" لوگو! تم فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تمہارا رب (یہ گؤ سالہ سامری نہیں بلکہ) وہ رحمان ہے جس کی رحمت زمین و آسمان کو محیط ہے۔ اس لئے خدارا تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو "۔

ان کے لئے بے اثر ثابت ہو گی ' اور یہ شاگردان سامری ' ہارون صفت علماء ربانیین کی اتباع کو انسان پرستی اور مذہبی اجارہ داری کا نام دیں گے!

بہرحال دور خلافت میں حضرت صدیقؓ کا پہلا کارنامہ میرے نزدیک یہی تھا کہ انہوں نے پوری قوت اور شدت سے مرتبۂ حدیث کو اجاگر کیا۔ اور " مقام سنت " کو واضح فرمایا اور حکمتِ الٰہی ان کے لئے ایسے اسباب بروئے کار لاتی رہی جن سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو مختلف عنوانات میں مرتبہ حدیث نبوی کی وضاحت کا موقع بار بار ملتا رہا۔

جَیش اُسامہ کے واقعہ میں تو ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت صدیق پر وجد اور حال کی سی رقت طاری تھی اور وہ اس واقعہ میں جرات و ہمت کے پیکر تھے۔ اسی واقعہ کا اور روح پرور اور ایمان افروز جز اور سنئے!

حضرت اُسامہؓ کا لشکر جب رخصت ہونے لگا تو خلیفہ رسول اللہ بنفس نفیس اُسامہ اور ان کے ہمراہیوں کو رخصت کرنے کے لئے مقام "جرف" میں تشریف لائے۔ واقعہ کے عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ اسامہ اپنی سواری پر تھے اور خلیفہ اسلام ان کے پہلو میں سواری موجود ہونے کے باوجود پیدل چل رہے تھے۔ اسامہ کی طرف سے ہر چند اصرار بھی کیا گیا۔

«یا خلیفةَ رسول اللہ لتركبن أو لأنزلن»

" خلیفہ رسول! یا آپ سوار ہو جائیں یا میں اتر جاؤں " لیکن جواب میں خلیفہ اسلام فرما رہے تھے :

«والله لا تَنزِل، ووالله لا أركبُ ومَا عليّ أنْ أغبّرَ قدميّ ساعةً فى سبيل الله فإنَ للغازى بِكُلِ خَطْوَةٍ يخطُوها سَبْعُ مائةِ حسَنةً تُكتَبُ لَهُ وسَبْعُ مائة درجة ترفَعُ له، وتُمحَى عَنه سَبْعُ مائةِ خطيئة»

(حيات الصحابه)

" خدا کی قسم نہ تم اترو گے اور خدا کی قسم نہ میں سوار ہوں گا میں اگر راہ خدا میں ایک ساعت کے لئے اپنے قدم غبار آلود کر لوں تو کیا مضائقہ ہے کیونکہ غازی کے لئے ہر قدم پر سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں ' سات سو درجے اس کے بلند کئے جاتے ہیں اور سات سو خطائیں اس کی مٹا دی جاتی ہیں "۔ (حیات صحابہ)

جو کہنا چاہتا ہوں وہ آگے آتا ہے۔ یعنی حضرت اُسامہ اور ان کی جماعت کو رخصت کر کے جب واپس آنے لگتے ہیں تو اسلام کا الوداعی جملہ اَستودِعُ اَللہ دِینک و اَمَانتک و خَواتیم عَملک (" تیرا دین امانت اور خاتمہ عمل اللہ کے سپرد کرتا ہوں") ادا کرنے کے بعد خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم امیر لشکر سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہے تھے :

«أن رسول الله أوصاك فأنفذ لأمر رسولِ ﷺ فإني لَستُ أمرك ولا أنهاك عَنه إنَما أنا مُنَفِذٌ لأمرِ أمَرَ به رَسُولُ الله ﷺ».

(حيات الصحابه)

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو وصیت فرما چکے ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم گرامی بجا لاؤ۔ بندہ نہ کسی بات کا آپ کو حکم کرتا ہے نہ کسی چیز سے منع کرتا ہے۔ میری حیثیت صرف یہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نافذ کرنے والا ہوں اور بس "۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس فقرہ کا مطلب یہی سمجھا ہوں اور شائد اس کے سوا دوسرا مطلب ہو بھی نہیں سکتا کہ حضرت صدیق ایک طرف " مرتبۂ فیصلۂ نبوت " بیان فرما رہے ہیں کہ اس میں ترمیم و تنسیخ صدیقی مسلک میں غیر صحیح ہے۔ دوسری طرف وہ خلیفۂ رسول یا بلفظ دیگر خلیفۂ اسلام کی حیثیت متعین کر رہے ہیں کہ اس کی حیثیت صرف احکام نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نافذ کرنے والے کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں میں تبدیلی کر دینا اس کا نہ منصب ہے نہ وہ اس کا مجاز ہے۔ کیوں نہ ہو جب خلیفۃ اللہ کو یہ منصب تفویض نہ کیا گیا کہ وہ اپنی رائے اور احکام اور فرامین میں رد و بدل کر ڈالے۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے۔

﴿يا داودُ إنا جعلناك خَلِيفَةً فِي الأرضِ فاحكُمْ بينَ الناسِ بالحقِ ولا تتبعِ الهَوى فيضلَّكَ عَن سبيلِ اللهِ﴾

(القرآن الكريم)

اے داؤد علیہ السلام ہم نے تمہیں اپنی زمین میں خلیفہ بنایا ہے اس لئے لوگوں کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کیا کرو۔ اور خواہش کی پیروی نہ کیجیو۔ ورنہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھکا دے گی۔

پس سوچنا چاہیے کہ اس بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے " خلیفہ راشد " کے لئے کب گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ صاحب وحی صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور ارشادات آپؐ کے احکام اور قضایا میں رد و بدل شروع کر دے۔ ایسی صورت میں وہ جانشین رسول اور خلیفہ نبی کہلانے کا کب مستحق ہو گا۔

حکیم الامت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ ضروریات خلافت پر بحث کرتے ہوئے

لکھتے ہیں۔

واجب است بر خلیفہ نگاہ داشتن دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم برصنفیکہ بسنت مستفیضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثابت شدہ و اجماع سلف صالحین براں منعقد گشتہ و انکار بر مخالف"

(ازالۃ الخفاء جلد ۱۔ ۲۹ طبع جدید)

"خلیفہ پر دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور نگہداشت اسی شکل میں لازم ہے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مستفیضہ سے ثابت ہے اور سلف صالحین کا اجماع اس پر منعقد ہو چکا ہے۔ اسی کے ساتھ خلیفہ کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ سنت مستفیضہ اور اجماع کی خلاف ورزی کرنے والوں پر گرفت کرے"۔

اسی مضمون کو حضرت صدیقؓ ان الفاظ میں بیان فرما رہے ہیں جو اوپر نقل کر چکا ہوں، یعنی

«إنما أنا مُنفِذٌ لأمرٍ أمَرَ به رَسُولُ الله ﷺ»

"میں تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نافذ کرنے والا ہوں"

یہ الفاظ تو خیر اسامہؓ سے فرمائے گئے جس سے ایک گونہ اپنے اصرار کی وجہ بیان کرنا اور دوسرے لوگوں کا مشورہ قبول کرنے سے معذوری پیش کرنا بھی مقصود تھا۔

پہلا صدیقی خطبہ کہ "دستور خلافت" کتاب و سنت ہوں گے

لیکن کیا مرتبہ حدیث اور منصب خلافت کی ذمہ داریوں کا بیان صرف اسی موقع

پر کیا گیا؟ جہاں تک صحابہؓ کے واقعات لوگوں کو مل سکتے ہیں ان کی روشنی میں ہر شخص یہی سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ نہ صرف حضرت صدیق بلکہ تمام اکابر و اصاغر صحابہؓ کے نزدیک "خلیفہ رسول اللہ" کی حیثیت احکام نبوت کی تنفیذ ہی کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک بدیہات میں داخل تھا۔ لیکن اس "بدیہی" مسئلہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بار بار کیوں بیان کر رہے تھے؟

مثلاً حضرت صدیق کا پہلا خطبہ جو منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم) کے کثیر مجمع کے سامنے پیش کیا گیا جس کو آج کی اصطلاح میں حلف وفاداری کہیئے تو بجا ہے اس میں بھی قرآن حکیم کے ساتھ "سنت" کو دین کی بنیاد کے طور پر انہوں نے پیش کیا۔ اور اسلام میں خلیفہ کا منصب کیا ہے؟ اور "کتاب و سنت" کے ساتھ خلیفہ کے تعلق کی نوعیت کیا ہو گی؟ اسی نکتہ کی وضاحت انہوں نے فرمائی۔ ابن سعد وغیرہ میں اس خطبہ کو ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

«يا أيها الناسُ قد وليتُ امركم ولستُ بخيركُمْ ولكنِ نزل القرآنَ وسن النبيُ ﷺ السُنن فَعلمنا وتعلمنا أيُهَا الناسُ إنما أنا مُتبعٌ ولَسْتُ بِمُبتدعٍ فإن أحسَنْتُ فأعينُونِي وأن زغتُ فَقَوموني»

(بحواله إعجاز القرآن للباقلانی)

"لوگو! مجھے تمہارے امور کا متولی بنا دیا گیا۔ مجھے تم سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں لیکن قرآن نازل ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتیں جاری فرمائیں۔ پس آپ نے تعلیم دی اور ہم نے تعلیم حاصل کی۔ لوگو! میں محض پیروی کرنے والا ہوں۔ نئی بات کو ایجاد نہ کروں گا۔ پس اگر میں صحیح راستہ پر

گامزن رہوں تو میری مدد کرنا اور اگر (بالفرض) کتاب و سنت سے
کجی اختیار کی تو مجھے سیدھا کر دینا"۔

یہ اسلام کے پہلے خلیفہ کا پہلا خطبہ ہے جس میں کتاب اور سنت کو دستور خلافت قرار دے کر دونوں سے وفاداری کا عہد و اقرار خلیفہ کی طرف سے کیا گیا اور تمام مہاجرین و انصار سے وہ اپیل کرتے ہیں کہ اگر خلیفہ اس حلف وفاداری پر قائم رہے تو ہر ممکن طریق سے اس کی مدد کی جائے اگر خدانخواستہ خلیفہ میں کتاب و سنت میں کجی نظر آئے تو پوری قوت سے اسے راہ راست پر لائیں۔ بلاشبہ حضرت صدیق کا یہ خطبہ اسلامی تاریخ میں دستور خلافت کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

صدیقی اعلانات پر ایک اہم سوال

بہرحال سوال یہاں یہی ہے کہ جن امور کو حضرت صدیق اپنے خطبات، مجالس اور خطوط میں با صرار و تکرار جہاں ان کو موقع ملتا تھا اور بتلا چکا ہوں کہ حکمتِ الٰہیہ ان کے لئے یہ موقع فراہم کر رہی تھی، بیان کرتے رہتے تھے۔ صحابہؓ کرام کے نزدیک جب ان امور کی حیثیت "بدیہیات اولیہ" اور "ضروریات دین" کی تھی۔ یعنی قرآن کے بیّنات سے انحراف جس طرح خلیفہ کے لئے صحیح نہیں ٹھیک اسی طرح سنّت نبویہ سے اعراض کی گنجائش بھی اس کے لئے نہیں، اور امت کے لئے قرآن جس طرح حجت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ جو احکام و فرامین چھوڑے ہیں اور دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کا ثبوت قطعی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کے لئے ان کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ امور جب صحابہؓ کے نزدیک "ضروریات" میں داخل ہیں تو امت کے پہلے خلیفہ کے لئے یہی "بدیہی مسئلہ" اس قدر اہمیت کیوں اختیار کر گیا تھا کہ کبھی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پایہ پکڑ کر کبھی اپنے بھائی (عمرؓ) کی داڑھی پکڑ کر، کبھی امیر جیش

(اسامہؓ) کی رکاب تھام کر وہ اسی کی تکرار ' اسی کا اعلان اسی کی منادی کیوں کئے جا رہے تھے کہ۔

۱۔ دستور خلافت کے لئے کتاب اللہ و سنت رسول بنیادی پتھر ہیں۔

۲۔ خلیفہ اسلام کی حیثیت متبع کی ہو گی۔ مبتدع کی نہ ہو گی۔

۳۔ میں اس لشکر کو روک لینے کا مجاز نہیں جس کے بھیجنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی سے فرما چکے ہیں۔

۴۔ میرا منصب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ امیر کو معزول کر دوں۔

۵۔ مجھ پر کیسے ہی حالات گزر جائیں لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں فیصلہ نبوت کو تبدیل کر دوں۔

۶۔ حدیہ کہ میں اس جھنڈے کو کھول دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باندھ چکے ہیں "ولا حلات لواء عقدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

(ہدایہ ج ۶ ـ ۳۰۵) بحوالہ حیات الصحابہ)

۷۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ:

"وأمَرَ مناديه يُنادي عُزمَةً مني أن لا يتخلَّف عن أسامَة من بعثه مَن كانَ انتَدبَ مَعَه فِي حياةِ رسولِ الله ﷺ"

حیات الصحابہ ـ ۴۱۰ ج ۱)

"جو شخص لشکر اسامہ میں حیات نبوی میں شریک ہو چکے تھے میں ان میں سے کسی کو عدم شرکت کی اجازت دینے کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔"

یہ اعلانات عام لوگوں کے نزدیک ممکن ہے کہ کسی اہمیت کے حامل نہ ہوں اور وہ صرف اتنا کہہ کر آگے گذر جانے کی کوشش کریں، کہ کوئی وقتی ضرورت اس اعلان

کی پیش آئی ہو گی۔ اس لئے جس طرح اور احکام خلافت کی طرف سے دیئے جاتے ہیں یا بہت سے اعلان کئے جاتے ہیں ' کسی ضرورت کے تحت یہ اعلان بھی کر دیا گیا ہو گا لیکن حضرت صدیقؓ کے ان پے در پے اعلانات میں ایمان و یقین کا نور ' عزم و احتیاط کی نزاکت اور دَرد دبے چینی کا سوز جو پایا جاتا ہے وہ کم از کم مجھے تو اجازت نہیں دیتا کہ نظر عمیق اور فہم صحیح سے کام لئے بغیر گزرنے والے سر سری طور پر اس مقام سے گزر جائیں اور ان صدیقی بیانات کو معمولی چیز قرار دے کر پہلو تہی کی کوشش کریں۔

منشاء صدیقؓ کی توضیح

ان " صدیقی کلمات " کا اصل منشاء کیا ہے اس کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس عالم میں رونق افروز تھے ، اس وقت آپؐ کی زبان ہی دین و شریعت تھی۔ لسان نبوت سے جو کچھ صادر ہوتا تھا سننے والوں کے لئے وہی دین اور اسلام تھا۔ آپؐ کے حکم کا تسلیم کر لینا ایمانی علامت اور آپؐ کے فیصلہ سے پہلو تہی کرنا علامت نفاق تھی' اہل ایمان کے لئے رضائے خداوندی ' ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کی فرمانبرداری میں منحصر تھی۔ اہل ایمان کے لئے آپؐ کا ہر قول و فعل وحی الہٰی کا تابع اور منشائے خداوندی کا ترجمان تھا ۔ اس لئے اہل اسلام کے لئے آخری مرجع ذات قدسی صفات تھی (صلی اللہ علیہ وسلم) حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں۔

> " اما چوں ایّام نبوت بود ' وحی مفترض الطاعت در قلب پیغمبرے رسید و شک و شبہ را آنجا ہیچ گنجائش نہ بود نہ در اول نہ در آخر۔ (ازالتہ الخفاء ۔ ۹۹۔ ج ۱)

" جب تک نبوت کا زمانہ تھا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر
وحی نازل ہوتی تھی جس کی اطاعت فرض ہے اور شک و شبہ کے
لئے وہاں قطعاً گنجائش نہ تھی۔ اول میں نہ آخر میں"۔

وصال نبویؐ کے بعد امّت ذہن و فکر کے دوراہے پر

لیکن وصال نبوی سے دور نبوت ختم اور دور خلافت شروع ہو گیا اور امت اس حادثہ میں یکایک ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہو گئی اس وقت امت ایک طرف اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سانحہ کبریٰ پر ماتم کناں دیوانہ وار تڑپ رہی تھی۔ خدا کے سوا کون تھا جو ان کی تعزیت کرے۔ دوسری طرف یہ فطری سوال کھڑا ہو گیا کہ آج کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہو گی؟ کیا امت کا رشتہ واطاعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کٹ گیا؟ یا بدستور باقی ہے۔ کیا آپؐ کے وصال کے بعد بھی آپؐ کے ارشادات کی پیروی امت کے لئے لازم ہو گی یا یہ قصہ وصال نبوی پر ختم ہو گیا؟ کیا آپ کی زبان ناطق بالوحی سے صادر شدہ ہر کلمہ اب بھی دین اسلام کا جزو سمجھنا ہو گا جیسا کہ آپ کی زندگی میں تھا یا "امیر جماعت" اور "مرکز ملت" اسلام کے جدید کل پرزے تیار کیا کرے گا؟ کیا رضائے خداوندی اتباع نبوی میں اب منحصر رہے گی، جس طرح آپؐ کے زمانۂ حیات میں تھی' یا یہ سعادت صرف آپ کے زمانۂ حیات تک تھی؟ کیا آپ کی ہر بات کو تسلیم کرنے والا مومن اور تسلیم نہ کرنے والا منافق اب بھی قرار دیا جائے گا؟ یا ایمان و کفر اور اخلاق و نفاق کا یہ معیاری فرق صرف آپ کی زندگی تک تھا؟

قرآن مبین کی سینکڑوں آیات میں آپ کی اطاعت ' فرمانبرداری اور امتثال امر کا

حکم جو دیا گیا ہے کیا قرآن کا یہ مطالبہ اب بھی موجود ہے یا یہ قرآنی مطالبہ وصال نبویؐ کے بعد مسلمانوں سے اٹھ گیا؟

کیا مسلمانوں کا خلیفہ ہدایات نبویؐ کا پوری طرح پابند ہو گا۔ یا آپ کا جانشین ٹھیک وہی منصب حاصل کرے گا جو زمانہ حیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا؟ معاذ اللہ

خلیفۂ اسلام کی پوزیشن صحیح کیا ہوگی؟ اسے خلافت کی بنیادوں کو کن خطوط پر استوار کرنا ہوگا؟ قرآن حکیم کے علاوہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا برتاؤ کیا ہوگا؟

وحی الٰہی کی نگرانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "دین قیمّ" کے جن نقوش کو چھوڑ گئے ہیں۔ جن جزئیات کی تعیین فرما گئے ہیں عقائد' عبادات' معاملات' خصومات اور اخلاق کا جو نظام آپؐ مرتب فرما گئے ہیں ان تمام چیزوں کو علےٰ حالہ باقی رکھنا خلیفہ کا فرض ہوگا یا فیصلہ نبوت سے ہٹ کر "دین قیمّ" کے نئے نقشے مرتب کرنے کی بھی اسے اجازت ہوگی؟

آسمانی پیغام کی حفاظت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال و حرام' صحیح اور غلط' جائز و ناجائز کی جو فہرست امت کے سامنے پیش کی تھی ان کو بلا تغیر و تبدّل بدستور قائم رکھ کر نافذ کرنا خلیفۂ اسلام کا منصب ہو گا یا ان میں ردوبدل بھی اس کے لئے جائز ہو گا۔

الغرض دور نبوت اور دور خلافت کے وسطی نقطہ میں جو اہم سوال پیدا ہونا چاہئے تھا۔ وہ یہی تھا کہ دور نبوّت کے ختم اور دور خلافت کے شروع ہو جانے کے بعد امّت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنّتِ رسول اللہ کا کیا مقام ہوگا اور جانشین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا ہو گی؟ عقلاً یہاں دو ہی صورتیں ممکن تھیں اول یہ کہ جسطرح ایک "سربراہ مملکت" کے فیصلے صرف اس کی حیات تک نافذ رہتے ہیں اس کی موت سے جیسے وہ خود بخود معزول ہو جاتا ہے اسی طرح اس

کے اوامر کی اطاعت بھی نہیں رہتی۔ بلکہ اس کی جگہ اس کا جانشین لے لیتا ہے ٹھیک یہی حال نبیؐ اور خلیفۂ نبیؐ کا ہو کہ معاذ اللہ وصال نبویؐ سے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم امت کی امانت سے معزول ہوگئی ۔ اب نہ آپؐ کو امت کے ساتھ امر ونہی کا تعلق رہا' نہ امّت کو آپ کے ساتھ سمع و طاعت کا بلکہ امر و نہی کے تمام اختیارات آپؐ کے بعد آنے والے خلفاء کی طرف منتقل ہو گئے۔ اب قرآن کا جو مفہوم یہ خلیفہ متعین کرے۔ پوری امت کے لئے اسی کا ماننا لازم ہو گا خواہ یہ مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مفہوم کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو اور اسلام کی جو تصویر خلیفہ پیش کرے گا اب وہی صحیح اسلامی تصویر کہلائے گی، خواہ یہ تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ نقشے کے کیسی ہی الٹ ہو (یہی آجکل کے مغرب زدہ طبقہ کا موقف ہے جس کا منشاء مقام نبوّت سے نا آشنائی ہے بلکہ یہ تصور انکار نبوت ہی کی ماڈرن شکل ہے)

دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور صاحب امرو نہی رہیں گے امّت کو بدستور آپؐ کے ساتھ سمع و طاعت کا تعلق باقی رہے گا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کا خلیفہ آپ کے ارشاد فرمودہ امرو نہی ' حلال و حرام جائز و جائز احکام و قضایا نافذ کرے گا۔ آپؐ کے کسی فیصلے کی خلاف ورزی نہ اس کے لئے جائز ہو گی اور نہ ملت کے لئے خلیفہ کے ایسے احکام کی تعمیل جائز ہو گی، جن میں آپ کی "سنت مستفیضہ" سے انحراف نہ کیا گیا ہو۔ قرآن کے مفہوم و معانی اور اسلام کے نقوش بدستور وہی باقی رہیں گے جو زمانہ نبویؐ میں تھے۔

حاصل یہ کہ خلیفہ مطاع مستقل نہیں ہوگا' بلکہ اس کی اطاعت صرف اسی لئے ہو گی اور اسی وقت تک ہو گی جب تک وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں احکام نبوّیہ کو نافذ کرتا رہے۔ اس کی حیثیت صرف یہ ہوگی کہ آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے احکام اور اوامرو نواہی کی تنفیذ کرے۔

بہرحال وصال نبویؐ کے بعد "رسول" اور جانشینِ رسولؐ" کا مرتبہ اسلام میں کیا

ہو گا اس کی یہی دو صورتیں جو میں نے ذکر کیں ہو سکتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت امت اور قیامت تک آنے والی امت، ذہن و فکر کے اسی دورایے پر کھڑی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ ہوئے تو وقت کا سب سے پیچیدہ مسئلہ اور امّت کے لئے سب سے اہم اصولی سوال یہی تھا جس کو بیان کرتا چلا آرہا ہوں۔ اس کی پیچیدگی کی وجہ یہ نہ تھی کہ صحابہ کرامؓ کے لئے یہ "علم" نیا تھا۔ آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ یہ مسئلہ صحابہ کرام کے نزدیک بدیہیات میں سے تھا۔ اصل وجہ اس سوال کی اہمیت کی یہ تھی کہ منشائے خداوندی جسے "خلیفہ اول اور بلاواسطہ جانشین رسول" بنا رہی تھی۔ یابی اللہ و المومنون الا ابابکر آنے والی پوری امت کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ آنے والے تمام خلفاء کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا طرز عمل قانونی اصطلاح میں "نظیر" اور شرعی اصطلاح میں "سنت خلیفۂ راشد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ اس کی ماہیت، اس کے حل و عقد اس کے انتظام و انصرام اور اس کے طرز عمل کا پہلا تجربہ زمیں والوں کو ہو رہا تھا۔ گویا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ اول بنائے جانے کا مطلب یہ تھا کہ صدیقی خلافت جن نقوش پر استوار کی جائے گی۔ آئندہ خلافت صحیحہ کے لئے وہی پتھر کی لکیریں بن جائیں گی۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں جو چیز دستور خلافت قرار پائے گی ہمیشہ کے لئے خلافت شرعیہ کا دستور وہی رہے گا۔ گویا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نحیف کندھوں پر ملت کے صرف موجودہ دور اور موجودہ افراد کا بوجھ نہیں تھا بلکہ خلافت کے "نقاش اول" کی حیثیت سے قیامت تک آنے والی تمام امت اور خلفاء کے لئے خلافت کے صحیح خطوط متعین کرنا اور غلط نقوش کو جو کبھی پیدا کئے جا سکتے تھے ایک ایک کرکے مٹانا بھی ابوبکرؓ کے فرائض میں شامل تھا۔ غرض یہ کہ حضرت صدیقؓ نے اس عقیدہ کو کہ "دستور خلافت" کتاب و سنت میں ہدایات کی آہنی زنجیر بنا دیا جسے کبھی توڑا نہیں جا سکتا۔

دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ کی نزاکتوں پر غور کرو تو صحیح اندازہ ہو گا کہ ان صدیقی

اعلانات میں کتنا زور ہے۔ بلاشبہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک " سنت رسول اللہ کا مقام " اور " خلیفۂ اسلام کا منصب " یہ دونوں چیزیں اپنے اندر کوئی خفا نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن حضرت ابوبکر اپنی آواز انہی تک محدود نہ رکھنا چاہتے تھے جو ان کے سامنے موجود تھے بلکہ وہ اپنی گرجتی ہوئی آواز کو قیامت کی دیواروں سے ٹکرا کر پوری امت کے خلفاء کو آگاہ کر دینا چاہتے تھے کہ خلیفہ اسلام کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

بسا اوقات ایک مسئلہ ایک زمانہ میں، بدیہیات میں شمار ہوتا ہے لیکن دوسرے زمانے کے لوگ اپنی غباوت کی وجہ سے اسے نظری بلکہ ناممکن بنا ڈالتے ہیں۔ کیا آج " دین قیمّ " کے واضح اور بدیہی مسائل " نظر و فکر " کی آماجگاہ بنانے کا تماشا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر چاہتے تھے کہ ان کی یہ آواز جو حلف وفاداری کی شکل میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نشر کی جا رہی ہے۔ قیامت تک کے لئے ہر آنے والے گوش زد ہو جائے۔ یعنی

«أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ»

" لوگو ! میں صرف قرآن و سنت کی پیروی کرنے والا ہوں نئی بات ایجاد کرنے والا نہیں ہوں "۔

تاکہ " مرتبہ حدیث " کے ساتھ ساتھ " منصب خلافت " کا مسئلہ جس طرح آج والوں کی لئے بدیہی ہے کل والوں کے لئے بھی بدیہی بن جائے۔ اور یوں اس مسئلہ کی " بداہت " ایسی آہنی زنجیر میں تبدیل ہو جائے کہ آنے والی کوئی بھی طاغوتی قوت اس کے توڑ ڈالنے پر قادر نہ ہو۔ الغرض یہ مسئلہ جیسے آج شک و شبہ سے بالا تر ہے، آئندہ ہر دور میں بھی اسے شک و تردد سے بالا تر سمجھا جائے یہ ذمہ داری جس قدر اہم تھی، اسی قدر فکران کو اس سے عہدہ برا ہونے کی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے کتنی محنت فرمائی۔ اس کی کچھ داستان آپ کے سامنے آچکی ہے۔ یعنی قرآن کے ساتھ سنت کو بنیاد خلافت قرار دے کر مختلف مجالس میں مختلف عنوانات سے اس کا بار

بار اعلان کر دیا اور عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اس قدر مضبوطی سے تھاما گویا جس قدر کارنامے حضرت ابو بکرؓ سے ظہور پذیر ہوئے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ظاہر ہو رہے تھے، ابو بکرؓ آلہ اور جارحہ کی طرف احکام نبویہ کی تنفیذ فرما رہے ہیں۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"ایام خلافت بقیہ ایام نبوت بودہ است گویا در ایام نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تصریحا بزبان مے فرمودہ ودر ایام خلافت بدست وسر اشارہ مے کرد"

"خلافت راشدہ کا دور دور نبوت ہی کا تھا کہنا چاہئے کہ زمان نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے تصریحاً فرماتے تھے اور ایام خلافت میں ہاتھ اور سر کے ساتھ اشارہ فرما رہے تھے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام تصریحیہ اور اشاریہ کی تنفیذ میں خلیفۂ اولؓ نے جس بیداری اور نزاکت احساس سے کام لیا بلا شبہ یہ انہیں کا حصہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابو بکرؓ کے اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ عملی کمزوریوں کے باوجود خلافت راشدہ کے بعد آنیوالے کسی حکمران کو بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ قانونی طور پر حدیث نبویؐ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "دینی سند" کی حیثیت سے تسلیم نہ کرے اور نہ قیامت تک انشاء اللہ کسی کو یہ جرأت ہو سکے گی۔ اسلام میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام ہے اور خلیفہ کا کیا منصب ہے یہ مسئلہ صدیقی محنت سے آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہوگیا فالحمد للہ أولا وآخراً ۔

تمت بالخیر

محمد یوسف عفا اللہ عنہ لدھیانوی

۱۰ ربیع الاول ۔ ۱۴۱۱ھ

عورت کی سربراہی

(۱)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی مخلوق کو مختلف قوتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کرکے مختلف مقاصد کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اور جس مقصد کے لیے کسی مخلوق کی تخلیق ہوئی ہے اسی کے مناسب اسے صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بینما رجل یسوق بقرۃ قد حمل علیها (وفی روایۃ: اذ رکبها فضربها) التفت الیہ فقالت انا لم نخلق لهذا، انا خلقنا للحرث، فقال الناس: سبحان اللہ! بقرۃ تتکلم، فقال انی اومن بهذا وابوبکر وعمر، وماهما ثم۔" (صحیح بخاری ص ۳۱۲ ج ۱، صحیح مسلم ص ۲۷۳ ج ۲)

"ایک شخص بیل پر بوجھ لاد کر اسے ہانک رہا تھا کہ بیل نے اس کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ ہم اس کام کے لیے پیدا نہیں کئے گئے۔ ہم کاشتکاری کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ لوگوں نے اس پر تعجب کیا کہ کیا بیل بھی گفتگو کرتا ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر میں ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکر و عمر بھی ایمان رکھتے ہیں (رضی اللہ عنہما)، راوی کہتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات اس مجلس میں موجود نہ تھے۔"

گویا بیل کی تخلیق سواری یا باربرداری کے لیے نہیں، بلکہ کاشتکاری کے لیے ہے۔ اور اس سے سواری یا باربرداری کا کام لینا اس مقصد کے خلاف ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق فرمائی ہے اور جن صلاحیتوں سے اسے بہرہ مند فرمایا ہے۔

عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں امتیاز

دیگر مخلوق کی طرح مرد و عورت کو بھی حق تعالیٰ شانہٗ نے جداگانہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

اور دونوں کو جداگانہ مقاصد کے لیے تخلیق فرمایا ہے' دونوں کی ساخت میں ایسا بنیادی فرق رکھا ہے جو دونوں کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا ہے۔ دونوں کی چال ڈھال' انداز نشست و برخاست لب ولہجہ' اخلاق وعادات' معاشرتی آداب' خیالات واحساسات اور میلانات ورجحانات یکسر مختلف ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک دونوں کی الگ الگ فطری وطبعی خصوصیات ہی عائلی زندگی کی بنیاد فراہم کرتی ہیں' شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"پھر جب کہ بالطبع عورت کو اولاد کی پرورش کے اچھے طریقے معلوم تھے وہ عقل میں کم' محنت کے کاموں سے جی چرانے والی' زیادہ حیادار' خانہ نشینی کی طرف مائل' ادنیٰ ادنیٰ امور میں خوب کوشش کرنے والی اور فرماں بردار تھی۔ اور مرد بہ نسبت عورتوں کے عقل مند' غیرت مند' باہمت' بامروت زور آور اور مقابلہ کرنے والا تھا' اس لیے عورت کی زندگی بغیر مرد کے ناتمام تھی اور مرد کو عورت کی احتیاج تھی۔"

(اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۸ ج ۱)

چونکہ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کی صنفی خصوصیات کے بغیر ناتمام اور نامکمل تھی اس لیے فطرت نے دونوں کو باہمی الفت وتعاون کے معاہدہ پر مجبور کر دیا۔ اس طرح انسانوں کی عائلی زندگی تشکیل پذیر ہوئی اور یہ انسانیت پر حق تعالیٰ شانہ' کا احسان عظیم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔"

(الروم، ۲۱)

"اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

مرد وعورت دونوں نے معاہدۂ الفت وتعاون میں منسلک ہو کر سفرِ معاشرت کا آغاز کیا تو ضرورت

پیش آئی کہ دونوں کے لیے حسنِ معاشرت کا دستور وضع کر دیا جائے جس میں دونوں کے حقوق وفرائض اور مرتبہ ومقام کا تعین کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں بڑی تفصیل سے ان اُمور کی تشریح فرمائی گئی ہے اور سب کا خلاصہ درجِ ذیل آیت شریفہ کے موجز ومعجز الفاظ میں سمو دیا گیا ہے:

"وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔" (البقرہ: ۲۲۸)

"اور عورتوں کا حق ہے، جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔"

(ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

دوسری جگہ اسی کی مزید وضاحت وصراحت اس طرح فرمائی گئی:

"اَلرِّجَالُ قَوّٰمُونَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۔"

(النساء: ۳۴)

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے، اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں، سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں مرد کی عدم موجودگی میں، بحفاظتِ الٰہی نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بددماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور

عظمت والے ہیں۔" (ترجمہ، حضرت تھانویؒ)

اس آیت شریفہ میں عورت پر مرد کی فضیلت کا اعلان کرتے ہوئے مرد کو قوّام، نگران اور حاکم قرار دیا ہے اور عورت کی صلاح و فلاح اس کی اطاعت شعاری اور اپنی عصمت کی پاسداری میں مضمر بتائی ہے۔ پس اس آیت کریمہ کی رُو سے وہ معاشرہ صحیح فطرت پر ہوگا جس میں مرد حاکم اور عورت اطاعت شعار ہو۔ اس کے برعکس جس معاشرہ کی حاکم عورت کو بنا دیا جائے وہ فطرت سے منحرف اور انسانیت سے برگشتہ معاشرہ قرار پائے گا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مرد کی حاکمیت کے دو اسباب بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ دوم یہ کہ عورت کے مہر اور نان و نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ امام رازیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثم انہ تعالیٰ لما اثبت للرجال سلطنۃ علی النساء ونفاذ أمر علیھن بین ان ذلک معلل بامرین احدھما: قولہ تعالیٰ (بما فضل اللہ بعضھم علی بعض) واعلم ان فضل الرجال علی النساء حاصل من وجوہ کثیرۃ، بعضھا صفات حقیقیۃ وبعضھا احکام شرعیۃ، أما الصفات الحقیقیۃ فاعلم أن الفضائل الحقیقیۃ یرجع حاصلھا الی امرین، الی العلم والی القدرۃ، ولاشک ان عقول الرجال وعلومھم اکثر، ولاشک أن قدرتھم علی الاعمال الشاقۃ أکمل، فلھذین السببین حصلت الفضیلۃ للرجال علی النساء فی العقل والحزم والقوۃ، والکتابۃ فی الغالب والفروسیۃ والرمی، وان منھم الانبیاء والعلماء، وفی الامامۃ الکبریٰ والصغریٰ والجھاد والاذان والخطبۃ والاعتکاف والشھادۃ فی الحدود والقصاص بالاتفاق، وفی الانکحۃ عند الشافعی رضی اللہ عنہ وزیادۃ النصیب فی المیراث، وفی تحمل الدیۃ فی القتل والخطاء، وفی القسامۃ والولایۃ فی النکاح والطلاق والرجعۃ وعدد الازواج، و إلیھم

الانتساب، فكل ذالك يدل على فضل الرجال على النساء۔
(والسبب الثانی) لحصول هذه الفضيلة: قوله تعالىٰ (و بما انفقوا من اموالهم) يعنی الرجل افضل من المرأة لأنه يعطيها المهر وينفق عليها"۔
(تفسیر کبیر، ص ۸۸، ج ۱۰)

"پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ ثابت فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر سلطنت حاصل ہے اور یہ کہ ان کا حکم ان پر نافذ ہے تو اس کے بعد یہ بیان فرمایا کہ مردوں کے عورتوں پر حاکم ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ کو اس ارشاد میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو یعنی مردوں کو بعض پر یعنی عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ مردوں کو بہت سی وجوہ سے فضیلت حاصل ہے ان میں سے بعض صفاتِ حقیقیہ ہیں اور بعض احکامِ شرعیہ۔ جہاں تک صفاتِ حقیقیہ کا تعلق ہے تو یہ واضح رہنا چاہیئے کہ فضائلِ حقیقیہ کا مرجع دو چیزیں ہیں، ایک علم، دوسری قدرت۔ اور اس میں شک نہیں کہ مرد عقل اور علم میں بڑھ کر ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اعمال شاقہ پر مردوں کی قدرت زیادہ کامل ہے۔ پس ان دو اسباب کی بنا پر مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ عقل میں، حزم میں، قوت میں، عام طور سے کتابت میں، شاہسواری میں، تیراندازی میں اور یہ کہ انہی میں نبی اور (بیشتر) علماء ہوتے ہیں اور درج ذیل مناصب بالاتفاق مردوں سے مخصوص ہیں۔ امامت کبریٰ، صغریٰ، جہاد، اذان، خطبہ، اعتکاف اور حدود و قصاص میں شہادت ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نکاح کی ولایت بھی مردوں ہی سے مخصوص ہے۔ علاوہ ازیں میراث میں مردوں کا حصہ زیادہ رکھا گیا ہے اور میراث میں عصبہ صرف مرد ہوتے ہیں۔ قتل خطأ میں دیت اور قسامۃ صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ نکاح کی ولایت، طلاق، رجعت اور تعدد ازواج کا اختیار صرف مردوں کو حاصل ہے۔ بچے کا نسب بھی مردوں سے جاری ہوتا ہے۔ یہ تمام امور دلالت کرتے ہیں کہ مردوں

کو عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور فضیلت کی دوسری وجہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمائی ہے: "اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں"۔ یعنی مرد عورت سے افضل ہے، کیونکہ وہ عورت کو مہر دیتا ہے اور عورت کا نان و نفقہ مرد کے ذمہ ہے۔"

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یقول تعالیٰ (الرجال قوامون علی النساء) ای الرجل قیّم علی المرأة ای هو رئیسها وکبیرها والحاکم علیها ومؤدّبها إذا اعوجت (بما فضل الله بعضهم علیٰ بعض) ای لأن الرجال أفضل من النساء والرجل خیر من المرأة و لهذا کانت النبوة مختصة بالرجال وکذالك الملك الاعظم لقوله صلی الله علیه وسلم "لن یفلح قوم ولّوا امرهم امرأة"۔ رواه البخاری (تفسیر ابن کثیر ص۴۹۱ ج۱)

"حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں "مرد عورتوں پر حاکم ہیں" یعنی مرد عورت پر نگران ہے، اس کا رئیس ہے، اس کا بڑا ہے، اس پر حاکم ہے اور جب عورت کجی اختیار کرے تو اس کا مؤدب ہے۔ "اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے"۔ یعنی اس وجہ سے کہ مرد، عورتوں سے افضل ہیں اور مرد عورت سے بہتر ہے، یہی وجہ ہے کہ نبوت مردوں کے لیے مختص ہے۔ اسی طرح سلطنت بھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "وہ قوم ہرگز کامیاب نہ ہوگی جس نے سلطنت کا کام عورت کے سپرد کر دیا۔ (صحیح بخاری)"۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صاحب روح المعانیؒ لکھتے ہیں:

"ولذا اختصوا بالرسالة والنبوة علی الأشهر، وبالامامة الکبریٰ والصغریٰ وإقامة الشعائر کالاذان والاقامة والخطبة الجمعة ۔ الخ۔" (روح المعانی ص۲۳ ج۵)

"اسی بنا پر مردوں کو مخصوص کیا گیا رسالت و نبوت کے ساتھ، امامت کبریٰ و صغریٰ کے

ساتھ اور اسلامی شعائر مثلاً اذان، اقامت اور خطبہ وجمعہ کے ساتھ .... وغیرہ"

اسی قسم کی تصریحات اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں دیگر مفسرین نے بھی فرمائی ہیں۔

الغرض مرد و عورت کے درجات کا تعین کرتے ہوئے قرآن کریم نے مرد کی حاکمیت کا واضح اعلان کیا، جس طرح اپنی فطری خصوصیات کی بنا پر عورت نبی و رسول نہیں ہو سکتی، نماز میں مردوں کی امام نہیں بن سکتی، مسجد میں اذان و اقامت کہنا، خطبہ دینا اور جمعہ وعیدین کا قائم کرنا اس کے لیے جائز نہیں، اسی طرح امامت کبریٰ (ملک کی سربراہی) کے فرائض انجام دینا بھی اس کی فطری و خلقی ساخت کے منافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ امْرَأَةً" (صحیح بخاری ص ۶۳۶ ج ۱)

"وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنی حکومت کا کام عورت کے سپرد کر دیا۔"

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم سے "فلاح" کی نفی فرمائی ہے جس کی حکمران عورت ہو۔ 'فلاح' کی تشریح کرتے ہوئے امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

"والفلاح الظفر وادراك بغية، وذالك ضربان دنيوىٌ واخروىٌ، فالدنيوىُّ الظفر بالسعادات التى تطيب بها حياة الدنيا وهو البقاء والغنىٰ والعزّ۔ وفلاح اخروىٌ وذالك اربعة اشياء. بقاء بلا فناء، وغنىً بلا فقر، وعزّ بلا ذُلّ وعلم بلا جهل." (مفردات قرآن)

"فلاح کے معنی ہیں کامیابی اور مقصود کو پالینا اور اس کی دو قسمیں ہیں، دنیوی و اخروی، پس دنیوی فلاح ان سعادتوں اور نیک بختیوں کے ساتھ کامیاب ہونا ہے جن کے ذریعہ دنیوی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ اور وہ تین چیزیں ہیں، بقا، غنیٰ اور عزت۔ اور ایک فلاح اُخروی ہے اور یہ چار چیزیں ہیں ایسی بقا جس کے بعد فنا نہیں، ایسی

غنیٰ جس میں فقر نہیں، ایسی عزت جس کے بعد ذلت نہیں اور ایسا علم جس میں جہل کا شائبہ نہیں۔"

'فلاح' کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ جس قوم پر عورت حکمران ہو وہ حرمان نصیب ہے۔ اسے نہ صرف اُخروی سعادتوں سے محرومی ہوگی بلکہ دنیوی سعادتوں اور برکتوں سے بھی محروم رہے گی۔ نہ اسے بقا نصیب ہوگی، نہ غنیٰ، نہ عز و وجاہت اور نہ زندگی کی خوشگواری اسے نصیب ہوگی بلکہ ایسی بدقسمت قوم کی زندگی موت سے بدتر ہوگی۔ اسی مضمون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے:

"اذا کان امراءکم خیارکم واغنیاءکم سمحائکم وامورکم شوریٰ بینکم فظهر الارض خیرلکم من بطنها۔ واذا کان امرأکم شرارکم واغنیاءکم بخلائکم، وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیرلکم من ظهرها۔

(ترمذی ص ۱۵ ج ۲۔ مشکوٰۃ شریف ۴۵۹)

"جب تمہارے حکام تم میں سب سے بہتر ہوں، تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں تو تمہارے لیے زمین کی پشت زمین کے پیٹ سے بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکام بُرے لوگ ہوں، تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے اس کی پشت سے بہتر ہے۔"

اس حدیث میں جو یہ فرمایا ہے کہ "تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے"۔ مطلب یہ کہ ایسی زندگی سے موت لاکھ درجہ اچھی ہے اور یہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے ہماری زبان میں کہا جاتا ہے کہ "اس سے تو ڈوب مرنا بہتر ہے"۔ اس میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ جب انسانی اقدار ملیامیٹ ہو جائیں کہ خود کمال وقاحت سے عورت کو اپنا حکمران تسلیم کرلیں تو وہ زندہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ انسان کی چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔

عورت حکمران نہیں بن سکتی اہل علم کی تصریحات

الغرض قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے واضح ہے کہ عورت کا حکمران بننا نہ صرف عورت کی فطرت

سے بغاوت ہے بلکہ یہ انسانی فطرت کے لیے موت کا پیغام ہے' قرآن وحدیث کی انہی تصریحات کے پیشِ نظر فقہائے امت اور علمائے ملت اس پر متفق ہیں کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اس مسئلہ پر اہلِ علم کی بے شمار تصریحات میں سے چند حوالے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

امام محی السنہ بغویؒ "شرح السنہ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی: "لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً" اپنی سند کے ساتھ روایت کرنے کے بعد اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"قال الإمام: اتفقوا على ان المرأة لاتصلح أن تكون اماماً ولا قاضياً. لأن الإمام يحتاج إلى الخروج لاقامة أمر الجهاد، والقيام بأمور المسلمين، والقاضي يحتاج إلى البروز لفصل الخصومات، والمرأة عورة لاتصلح للبروز، وتعجز لضعفها عند القيام باكثر الأمور، ولأن المرأة ناقصة، والامامة والقضاء من كمال الولايات، فلا يصلح لها إلا الكامل من الرجال." (شرح السنہ ص ۷۷، ج ۱۰ طبع بیروت)

"اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ عورت امام اور قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ امام کو ضرورت ہے امر جہاد کو قائم کرنے اور مسلمانوں کے مصالح کا اہتمام کرنے کیلئے باہر نکلنے کی، اور قاضی کے لیے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے سب کے سامنے آنا ضروری ہے اور عورت سراپا ستر ہے وہ عام مجمعوں میں نکلنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اور وہ اپنے ضعف کی وجہ سے اکثر امور کے انجام دینے سے قاصر رہے گی اور اس لیے بھی کہ عورت (ولایت میں) ناقص ہے اور امامت وقضا کامل ولایتوں میں سے ہے۔ پس اس کے لیے کامل مرد ہی صلاحیت رکھتے ہیں۔

امام قرطبیؒ آیتِ کریمہ "انی جاعل فی الارض خلیفة" کے ذیل میں خلیفہ کی شرائط ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"السابع ان يكون ذكراً...... واجمعوا على ان المرأة لايجوز ان تكون اماماً وان اختلفوا فی جواز كونها قاضية فيما تجوز شهادتها فيه."

(القرطبی: الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۲۷۰)

"ساتویں شرط یہ ہے کہ خلیفہ مرد ہو، اور اہلِ علم کا اجماع ہے کہ عورت امام (حکومت کی سربراہ) نہیں بن سکتی البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جن امور میں اس کی گواہی جائز ہے ان میں قاضی بن سکتی ہے یا نہیں۔"

شرح عقائد نسفی میں ہے:

ویشترط ان یکون من اھل الولایۃ المطلقۃ الکاملۃ ای مسلماً حراً ذکراً عاقلاً، بالغاً۔ الی قولہ۔ والنساء ناقصات عقل ودین۔

(شرح عقائد ص ۱۵۸، مطبوعہ مکتبہ خیر کثیر کراچی)

"امام (حکمران اعلیٰ) کے لیے شرط ہے کہ وہ کامل و مطلق ولایت کا اہل ہو۔ یعنی مسلمان، آزاد، مرد، عاقل اور بالغ ہو، اس کے بعد ہر شرط کے ضروری ہونے کی وجہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عورت اس لیے امام نہیں بن سکتی کیونکہ عورتیں دین و عقل میں ناقص ہیں۔"

علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"والاوضح الاستدلال بالحدیث عن ابی بکرۃ الثقفی قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا علیھم امرأۃ رواہ البخاری وایضاً ھی مامورۃ بالتستر وترک الخروج الی مجامع الرجال وایضاً قد اجمع الامۃ علیٰ عدم نصبھا حتی فی الامامۃ الصغریٰ"

(نبراس شرح شرح عقائد ص ۳۲۱۔ امدادیہ ملتان)

"(عورت کے حکمران اعلیٰ نہ ہوسکنے پر) زیادہ واضح استدلال اس حدیث سے ہے جو صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ ثقفیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنالیا تو آپؐ نے فرمایا: "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے اوپر عورت کو حاکم بنالیا۔" نیز یہ کہ عورت کو پردے کا حکم ہے اور یہ کہ مردوں کے مجمع میں نہ جائے۔ نیز یہ کہ اُمت کا اجماع ہے کہ عورت کو امام

بنانا صحیح نہیں حتیٰ کہ امامت صغریٰ میں بھی"۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "ازالۃ الخفا" میں شرائطِ خلافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"از انجملہ آنست کہ ذکر باشد نہ امرأۃ زیراکہ در حدیث بخاری آمدہ ما افلح قوم ولوا امرہم امرأۃ چون بسمع مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسید کہ اہل فارس دخترِ کسریٰ را بپادشاہی برداشتہ اند فرمود رستگار نشد قومی کہ والی امرِ پادشاہی خود ساختند زنے را و زیراکہ امرأۃ ناقص العقل والدین است و در جنگ و پیکار بیکار و قابلِ حضور محافل و مجالس نے پس ازوی کارہای مطلوب نہ برآید"۔ (ازالۃ الخفا ص ۳، ج ۱)

"اور من جملہ شرائط امامت کے ایک یہ ہے کہ امام مرد ہو، عورت نہ ہو کیونکہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک میں یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنالیا ہے تو فرمایا "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کردی"۔ اور اس لیے بھی کہ عورت عقل و دین کے اعتبار سے ناقص ہے اور جنگ و پیکار میں بیکار ہے۔ اور عام محفلوں اور مجلسوں میں حاضری کے قابل نہیں اس لیے حکومت کے مقاصد کو انجام نہیں دے سکتی"۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب "درمختار" میں ہے:

"ویشترط کونہ مسلماً حراً ذکراً عاقلاً بالغاً قادراً"۔ (درمختار ص ۵۴۸، ج ۱)

"اور امامتِ کبریٰ (ملک کی حکمرانی) میں امام کا مسلمان، آزاد، مرد، عاقل، بالغ اور قادر ہونا شرط ہے"۔

فقہ مالکی کی مستند کتاب 'منح الجلیل شرح مختصر الخلیل' میں ہے:

"(الامام الاعظم) الخلیفۃ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی امامۃ الصلوٰۃ الخمس والجمعۃ والعیدین والحکم بین المسلمین وحفظ الاسلام واقامۃ حدودہ وجہاد الکفار والامر بالمعروف والنہی عن المنکر، فیشترط فیہ العدالۃ والذکورۃ والفطنۃ والعلم"۔ (منح الجلیل ص ۲۶۳، ج ۸)

"امام اعظم (سربراہِ حکومت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے نماز پنجگانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت میں، مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں، اسلام کی پاسبانی اور اس کی حدوں کو قائم کرنے میں، کفار سے جہاد کرنے میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجالانے میں۔ اس لیے اس میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا شرط ہے عادل ہو، مرد ہو، سمجھ دار ہو، عالم ہو۔"

فقہ شافعی کی کتاب 'مجموع شرح مہذب' میں ہے:

"ولایجوز أن یکون امرأة لقوله صلی اللہ علیہ وسلم: ما أفلح قوم أسندوا أمرهم الی امرأة، ولأنه لا بد للقاضی من مجالسة الرجال من الفقهاء والشهود والخصوم والمرأة ممنوعة من مجالسة الرجال لما یخاف علیهم من الافتتان بها۔" (تکملہ مجموع شرح مہذب ص ۱۲۷، ج ۲۰)

"اور جائز نہیں کہ قاضی عورت ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی"۔ اور اس لیے بھی کہ قاضی کے لیے مردوں کے ساتھ ہم نشینی لازم ہے، فقہا کے ساتھ، گواہوں کے ساتھ اور مقدمہ کے فریقوں کے ساتھ اور عورت کو مردوں کی ہم نشینی ممنوع ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے حق میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔"

فقہ حنبلی کی کتاب 'المغنی' میں ہے:

"وجملته انه یشترط فی القاضی ثلاثة شروط (احدها) الکمال وهو نوعان کمال الاحکام وکمال الخلقة، أما کمال الاحکام فیعتبر فی أربعة اشیاء أن یکون بالغاً عاقلاً حراً ذکراً، وحکی عن ابن جریر انه لا تشترط الذکوریة لان المرأة یجوز ان تکون مفتیة فیجوز ان تکون قاضیة، وقال أبوحنیفة یجوز ان تکون قاضیة فی غیر الحدود لانه یجوز ان تکون شاهدة فیه۔

ولنا قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "ما أفلح قوم ولوا أمرهم امرأة".
ولأن القاضی یحضره محافل الخصوم والرجال ویحتاج فیه الی کمال الرأی وتمام العقل والفطنة والمرأة ناقصة العقل قلیلة الرأی لیست اهلا للحضور فی محافل الرجال لا تقبل شهادتها ولو کان معها الف امرأة مثلها ولم یکن معهن رجل وقد نبه الله تعالیٰ علیٰ ضلالهن ونسیانهن بقوله تعالیٰ: ان تضل احدٰهما فتذکر احداهما الاخریٰ، ولا تصلح للامامة العظمیٰ ولا لتولیة البلدان ولهذا لم یول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا احد من خلفائه ولا من بعدهم امرأة قضاء ولا ولایة بلد فیما بلغنا ولو جاز ذلك لم یخل منه جمیع الزمان غالباً۔" (المغنی ص ۳۸۰، ج ۱۱)

"خلاصہ یہ کہ قاضی کے لیے تین شرطیں ہیں۔ ایک کمال، اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک کمالِ احکام، دوسرا کمالِ خلقت۔ اور کمالِ احکام چار چیزوں میں معتبر ہے وہ یہ کہ بالغ ہو، عاقل، آزاد ہو، مرد ہو۔ ابنِ جریر سے نقل کیا جاتا ہے کہ قاضی کا مرد ہونا شرط نہیں، کیونکہ عورت مفتی ہو سکتی ہے تو قاضی بھی ہو سکتی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ عورت حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے امور میں قاضی بن سکتی ہے کیونکہ ان امور میں گواہ بھی بن سکتی ہے۔

ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے امرِ حکومت عورت کے سپرد کر دیا۔" اور اس لیے بھی کہ قاضی کے پاس مقدمہ کے فریقوں اور مردوں کا جھمگٹا رہتا ہے اور وہ فیصلے میں کمالِ رائے، تمام عقل اور زیرکی کا محتاج ہے، جب کہ عورت ناقص العقل اور قلیل الرائے ہے۔ مردوں کی محفلوں میں حاضری کے لائق نہیں، اور جب تک مرد ساتھ نہ ہو تنہا عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں، چاہے ہزار عورتیں گواہی دے رہی ہوں اور اللہ تعالیٰ نے

ان کے بھول چوک جانے پر اس ارشاد میں تنبیہ فرمائی ہے: کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے"۔ عورت امامتِ عظمیٰ (حکومت کی سربراہی) اور صوبوں اور شہروں کی حکومت کی صلاحیت نہیں رکھتی؛ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، خلفائے راشدین نے اور ان کے بعد کے سلاطین نے نہ کسی عورت کو کبھی عہدہ قضا پر مقرر کیا، نہ کسی شہر کی حکومت پر۔ اور اگر یہ جائز ہوتا تو پورا زمانہ اس سے غالباً خالی نہ رہتا"۔

اہلِ ظاہر کے امام حافظ ابن حزم اندلسیؒ، 'المحلیٰ' میں لکھتے ہیں:

"واما من لم یبلغ والمرأة فلقول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رفع القلم عن ثلاث وذکر الصبی حتی یبلغ ولان عقود الاسلام الی الخلیفة ولا عقد علیہ۔ و......عن ابی بکرة رضی اللّٰہ عنہ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: لن یفلح قوم اسندوا امرھم الی امرأة"۔ (المحلیٰ ص ۳۶۰ ج ۹)

"نابالغ اور عورت کو خلیفہ بنانا صحیح نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تین شخصوں سے قلم اٹھا لیا گیا"۔ ان تین میں بچے کو ذکر فرمایا جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے اور اس لیے بھی کہ اسلام کے عقود خلیفہ کے سپرد ہیں اور نابالغ بچے کا کوئی عقد صحیح نہیں اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے حوالے کر دی"۔ (لہٰذا عورت کی خلافت بھی صحیح نہیں)"

ان حوالوں سے واضح ہے کہ تمام اہلِ علم اور مذاہب اس پر متفق ہیں کہ حکومت و مملکت کی سربراہی کے لیے مرد ہونا شرط ہے۔ لہٰذا زمامِ حکومت کسی عورت کے ہاتھ میں تھما دینا جائز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ عورت کو حکومت کا سربراہ بنانا تو جائز نہیں لیکن اگر اسے اس منصب پر فائز کر دیا جائے تو کیا وہ سربراہ بن جائے گی یا نہیں؟ اور شرعاً اس کا حکم نافذ ہوگا یا نہیں؟ علامہ شامیؒ امام

ابوالسعودؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ چونکہ عورت میں اس کی اہلیت ہی سرے سے نہیں پائی جاتی اس لیے شرعاً اس کی امامت منعقد نہیں ہوگی۔ علامہ شامیؒ کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

"تنبیہ" واما تقریرھا فی نحو وظیفۃ الامام فلا شک فی عدم صحتہ لعدم اھلیتھا خلافاً لما زعمہ الجھلۃ انہ یصح وتستنیب لان صحۃ التقریر یعتمد وجود الاھلیۃ وجواز الاستنابۃ فرع صحۃ التقریر اھ ابوالسعود۔"

(شامی ص ۲۰۹ ج ۵)

"تنبیہ: رہا امام کے منصب اور اس جیسے دیگر منصب پر عورت کا تقرر، سو اس کے صحیح نہ ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتی بخلاف اس کے جو بعض جاہلوں نے سمجھا ہے کہ حاکم کے منصب پر اس کا تقرر صحیح تو ہے لیکن وہ کسی مرد کو نائب بنا کر کام چلائے (یہ جاہلانہ بات اس لیے غلط ہے) کیونکہ نائب بنانے کی بات تو تب کی جائے کہ پہلے عورت کا تقرر صحیح ہو اور تقرر کا صحیح ہونا موقوف ہے اہلیت کے پائے جانے پر۔ پس جب عورت میں اہلیت مفقود ہے تو اس کا تقرر ہی صحیح نہ ہوا۔ اور جب تقرر صحیح نہ ہوا تو نائب بنانے کی بات بھی غلط ہوئی۔"

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مملکت کی سربراہی کے لیے مرد کا شرط ہونا اور عورت کا حکومت کی سربراہی کے لیے اہل نہ ہونا صرف اہلِ اسلام کا اجماعی مسئلہ نہیں بلکہ تمام عالم کے عقلاً کا متفق علیہ فیصلہ ہے۔ چنانچہ فیلسوفِ اسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "حجۃ اللہ البالغہ" میں باب "سیرت الملوک" میں لکھتے ہیں:

"بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں پسندیدہ اخلاق ہوں ورنہ وہ شہر برباد ہو جائے گا۔ اگر وہ شجاع نہیں ہے تو اپنے مخالفوں سے پورا مقابلہ نہ کرسکے گا، رعیت اس کو حقارت کی نظر سے دیکھے گی۔ اگر وہ بُردبار نہیں ہے تو اپنی سطوت سے لوگوں کو برباد ہی کر ڈالے گا، اور اگر صاحبِ حکمت نہیں ہے تو نفع بخش تدبیر

کو عمل میں لانے سے عاجز رہے گا اور بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ عقل مند، بالغ، آزاد، مرد ہو، صاحب رائے، بینا، شنوا اور گویا ہو، لوگ اس کے شرف اور اس کے خاندان کے اعزاز کو تسلیم کرتے ہوں، اس کے اور اس کے آباء و اجداد کے فضائل کو لوگ دیکھ چکے ہوں اور خوب جانتے ہوں کہ بادشاہ مصالح ملکی کی پاسبانی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا۔ یہ سب امور عقل کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اور تمام بنی آدم اس پر متفق ہیں خواہ ان کے شہروں میں کیسا ہی بُعد کیوں نہ ہو اور وہ کسی ہی مذہب کے کیوں نہ ہوں کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ کے مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ بغیر امورِ بالا کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر بادشاہ ان امور میں فروگزاشت کریگا تو لوگ اس کو خلافِ مقصود جانیں گے اور ان کے دل اس سے بیزار ہو جائیں گے اور اگر خاموش بھی رہیں گے تو در پردہ غصہ میں رہیں گے۔" (حجۃ اللہ البالغہ مترجم ص ۲۹ ج ۱)

اور "خلافت" کے عنوان کے تحت حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"واضح ہو کہ خلیفہ کے اندر عاقل، بالغ، آزاد، مرد، شجاع، صاحب رائے، سننے والا اور دیکھنے والا اور گویا ہونا شرط ہے اور اس کا ایسا شخص ہونا شرط ہے کہ لوگ اس کی اور اس کے نسب کی شرافت کو تسلیم کرتے ہوں اور اس کی فرمانبرداری سے عار نہ کرتے ہوں اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہو کہ وہ سیاستِ مدنیہ میں حق کا اتباع کرے گا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر عقل دلالت کرتی ہے اور باوجود ملکوں کے اور دینوں کے اختلاف کے تمام بنی آدم کا خلیفہ کے اندر ان تمام باتوں کی شرط ہونے کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ خلیفہ کے مقرر کرلے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ بغیر ان امور کے تمام نہیں ہو سکتی اور ان امور میں سے جب کبھی کوئی امر رہ گیا ہے تو انہوں نے اس کو نامناسب خیال کیا ہے، اور اس کا خلیفہ ہونا ان کے دلوں کو ناگوار گزرا ہے اور غصہ کی حالت میں بظاہر سکوت کیا ہے، چنانچہ جب اہلِ فارس نے ایک عورت

کو اپنا بادشاہ بنایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جس قوم نے عورت کو اپنے اوپر حاکم بنایا اس کو ہرگز فلاح نہ ہوگی" اور ملت مصطفویہ نے نبی کے خلیفہ ہونے میں ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی معتبر رکھی ہیں۔ از آں جملہ اسلام اور علم اور عدالت ہے"۔

(حجۃ اللہ البالغہ مترجم ص ۴۲۵ ج ۲)

حضرت شاہ صاحب کی ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوا کہ پوری دنیا کے اہل عقل، کیا مومن اور کیا کافر، ہر زمانے میں اس پر متفق رہے ہیں کہ عورت کارِ مملکت کی انجام دہی کے لیے موزوں نہیں؛ اس کے باوجود اگر تاریخ عالم میں چند ایسی خواتین کے نام آتے ہیں جنہوں نے زمام حکومت ہاتھ میں لی تو اول تو یہ شاذ و نادر مثالیں ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح بعض اوقات انسانوں کے گھر میں بعض عجیب الخلقت بچے جنم لیتے ہیں۔ ایسی شاذ مثالیں کبھی سند کا درجہ نہیں رکھا کرتیں؛ نہ عقلاً و شرعاً ان سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح صحت مند بدن پر پھوڑے پھنسیوں کا نکل آنا بھی ایک معمول ہے مگر اہل عقل اس کو لائق رشک نہیں سمجھتے، بلکہ اسے فسادِ خون کی علامت سمجھ کر اس کے علاج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کسی معاشرہ میں عورت کا حکمران بن جانا بھی لائق رشک یا لائق تقلید نہیں بلکہ اہل عقل اس کو فساد معاشرہ کی علامت سمجھتے ہیں؛ اور یہ کہ اگر اس فساد کی طرف توجہ نہ کی گئی تو اس کا انجام وہی ہو سکتا ہے جس کو حکیم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے "بطن الارض خیر لکم من ظہرھا" (تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے) میں بیان فرمایا ہے۔

نعوذ باللہ من الحور بعد الکور۔

چند شبہات کا جواب

گزشتہ سطور میں ہم نے قرآن وحدیث اور ائمۂ دین کے حوالوں سے واضح کیا ہے کہ عورت سربراہِ حکومت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بعض حضرات کی تحریروں میں اس سلسلہ میں چند شبہات کا اظہار کیا گیا ہے، مناسب ہوگا کہ علمی انداز میں ان پر بھی غور کرلیا جائے۔

الرّجال قوّامون علی النسأ پر شبہ:

بعض حضرات نے آیت کریمہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: ۳۴) کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ آیت صرف ازدواجی زندگی اور تدبیر منزل (گھریلو مسائل) کے بارے میں ہے، امورِ مملکت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے۔ شوہر کے اخراجات کا ذمہ عورت پر نہیں۔ اس کی وجہ سے عورت کو مرد سے دفادار رہنا چاہیئے۔

ان حضرات نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ جب ازدواجی زندگی اور تدبیر منزل میں قرآن کریم نے مرد کو نگران اور حاکم اور عورت کو اس کے تابع اور مطیع قرار دیا ہے تو امورِ مملکت میں قرآن کریم عورت کو حاکم اور مردوں کو اس کا مطیع و فرمانبردار کیسے قرار دے سکتا ہے؟ اس نکتہ کی وضاحت یہ ہے کہ مرد و عورت، شریعت کے مقرر کردہ دستور کے مطابق ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں تو اس سے ایک "گھر" وجود میں آتا ہے۔ یہ انسانی تمدن کا پہلا زینہ ہے۔ یہیں سے تدبیر منزل (گھریلو مسائل) کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر چند گھروں سے مل کر ایک بستی آباد ہوجاتی ہے اور یہاں سے "سیاستِ مدینہ" کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ انسانی تمدن کا گویا دوسرا زینہ ہے۔ پھر چند شہروں کے مجموعہ سے ایک ملک وجود میں آتا ہے اور اس سے "امورِ مملکت" کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ یہ انسانی

تمدن کا تیسرا مرحلہ ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تمدن کے پہلے قدم اور پہلے مرحلہ پر ہی قرآن حکیم اعلان کردیتا ہے "اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ"۔ گویا قرآن کریم کی نظر میں انسانی تمدن کے پہلے مرحلہ کا فطری نظام یہ ہے کہ مرد حاکم ہو اور عورت اسکی مطیع و فرمانبردار ہو۔ اس کے برعکس اگر عورت حاکم اور مرد اس کا مطیع و فرمانبردار ہو تو یہ نظام قرآن کریم کی نظر میں غیر صالح اور خلافِ فطرت ہوگا۔ اب غور فرمائیے کہ جب تمدن کی پہلی اکائی اور اولین قدم پر عورت حاکمیت کی صلاحیت نہیں رکھتی تو تمدن کے آخری زینہ (ملکی سیاست) میں عورت کی حاکمیت کا مقام قرآن کریم کی نظر میں کیا ہوگا۔ آپ اسے مختصر الفاظ میں یوں تعبیر کرلیجئے کہ قرآن کریم جب ایک چھوٹے سے گھر میں (جس کی ابتدائی تشکیل صرف دو افراد سے ہوتی ہے) عورت کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا تو کروڑوں انسانوں کی آبادی کے ملک میں عورت کی حاکمیت کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے؟

اور پھر ان حضرات نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ عائلی زندگی میں مرد کی حاکمیت کا اعلان کرتے ہوئے قرآن کریم نے اس کی پہلی وجہ مرد کی فضیلت قرار دی۔ "بما فضل اللہ بعضھم علٰی بعض"۔ اس توجیہہ و تعلیل میں صراحت کردی گئی ہے کہ مرد کی حاکمیت کا اصل سبب اسکی فضیلت ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ مردوں اور عورتوں کے مجموعہ پر مشتمل ہو جس کی بالکل ابتدائی شکل تدبیر منزل ہے اور اس کی آخری شکل سیاستِ ملکیہ ہے، اس میں مرد بوجہ اپنی فضیلت کے حاکم ہوگا! اور عورت اس کے تابع فرمان ہوگی۔ "فالصّٰلحٰت قٰنِتٰت" الآیہ۔

اور مرد کی حاکمیت کا دوسرا سبب یہ بیان فرمایا ہے کہ مردوں پر عورتوں کے مہر اور نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے، عورتوں پر مردوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری تو کیا ہوتی خود ان کے اپنے نان و نفقہ کی ذمہ داری بھی ان پر نہیں ڈالی گئی، ایسا کیوں کیا گیا؟ اس لیے کہ کسبِ معاش کے لیے گھر سے باہر جانے اور کھلے بندوں پھرنے کی ضرورت ہے، اس کی صلاحیت صرف مرد رکھتا ہے۔ عورت اپنی صنفی خصوصیات کی بنا پر اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لیے قرآن کریم، انکے

نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں کے کندھوں پر ڈال کر خود ان پر گھر میں رہنے اور حجاب و تستر اختیار کرنے کی پابندی عائد کر دیتا ہے۔

"وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی" (الاحزاب: ۳۳)

"اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔" (ترجمہ: حضرت تھانویؒ)

اب انصاف فرمائیے کہ جو قرآن گھر میں عورت کو حکمران تسلیم نہیں کرتا، جو مرد کی فضیلت کا حوالہ دیکر اس کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے، جو عورت کے نان ونفقہ کا بار مرد پر ڈال کر عورت پر حجاب وستر اور گھر میں جم کر بیٹھنے کی پابندی عائد کرتا ہے۔ کیا یہ عقل ودانش کی بات ہوگی کہ وہی قرآن عورت کو ملک کی حاکم اعلیٰ بن کر سب کے سامنے بے حجابانہ گھومنے پھرنے اور ساری دنیا کے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے کی اجازت دے؟

الغرض آیتِ کریمہ مرد کی قوامیت کا اعلان کرتے ہوئے عورت کی حکومت وولایت کی نفی کرتی ہے۔ اکابرامت نے آیت کا یہی مفہوم سمجھا ہے جیسا کہ متعدد اکابر مفسرین کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی کتاب 'احکام القرآن' کا حوالہ مزید پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"القوام والقیم واحد والقوّام ابلغ وهو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب وعلّل ذلك بامرین وهبی وکسبی فقال "بما فضّل الله بعضهم علیٰ بعض" یعنی فضّل الرجال علی النساء فی اصل الخلقة وکمال العقل وحسن التدبیر وبسطة فی العلم والجسم ومزید القوة فی الاعمال وعلو الاستعداد۔ ولذلك خصوا بالنبوة والامامة والقضاء والشهادة فی الحدود والقصاص وغیرهما ووجوب الجهاد والجمعة والعیدین والاذان والخطبة والجماعة وزیادة السهم فی الارث ومالکیة النکاح وتعدد المنکوحات

والاستبداد بالطلاق وکمال الصوم والصلوٰۃ من غیر فتور، وغیر ذلک،
وھذا امر وھبی ثم قال وبما انفقوا من اموالھم فی نکاحھن من المھور،
والنفقات الراتبۃ وھذا امر کسبی"۔ (احکام القرآن ج ۲، ص ۱۸۶)

"قوّام اور قیم کے ایک ہی معنیٰ ہیں اور قوام زیادہ بلیغ ہے۔ قوام وہ ہے جو کسی کے مصالح، تدبیر اور تادیب کا ذمہ دار ہو۔ "مرد عورتوں کے قوام ہیں" اس کی دو وجہیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک وہبی اور دوسری کسبی۔ چنانچہ فرمایا "اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔" یعنی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو فضیلت دی ہے اصل خلقت میں، کمال عقل میں، حسن تدبیر میں، علم و جسم کی فراخی میں، اعمال کی مزید قوت میں اور استعداد کی بلندی میں! اسی بنا پر درج ذیل امور مردوں سے مخصوص ہیں نبوت، امامت، قضا، حدود و قصاص وغیرہ پر شہادت دینا، وجوب جہاد، جمعہ، عیدین، اذان، خطبہ، جماعت، وراثت میں زیادہ حصہ ملنا، نکاح کا مالک ہونا، ایک سے زیادہ نکاح کرنا، طلاق دینے کا اختیار، بغیر وقفہ کے نماز روزہ کا پورا کرنا وغیرہ ذالک۔ اور یہ امر وہبی ہے۔ پھر فرمایا: "اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔" یعنی نکاح میں مہر اور نان و نفقہ مردوں پر لازم ہے اور یہ کسبی امر ہے۔"

اگر کسی کو قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ معنی و مفہوم پہنانے اور خود ہی اپنے ذہنی خیالات کو قرآن کریم سے اگلوانے کی ضد ہو اس کا مرض تو لاعلاج ہے ورنہ قرآن کریم کا بالکل سیدھا سادا مفہوم سامنے رکھیے اور پھر بتائیے کہ کیا قرآن مردوں پر عورت کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے یا اس کے برعکس اس کا اعلان یہ ہے کہ "مرد حاکم ہیں عورتوں پر"۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے معاشرہ میں مرد و عورت کے مقام و منصب کا جو تعین کیا ہے اور خواتین کے بارے میں نکاح، طلاق، عدت اور ستر و حجاب کے جو تفصیلی احکام

دیئے ہیں اگر کوئی شخص ان سے واقف بھی ہے اور ان پر ایمان بھی رکھتا ہے تو اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ قرآن کریم کی خصوصی ہدایات کی روشنی میں عورت کے سربراہِ مملکت و سربراہِ حکومت بننے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں! جو شخص احکام و ہدایات سے واقف ہی نہ ہو وہ بے چارہ اپنے جہل کی وجہ سے معذور ہے۔

"لن یفلح قومٌ ولّوا امرہم امرأۃ" پر شبہات:

۱: کیا یہ حدیث موضوع ہے؟

بعض حضرات نے حدیثِ نبویؐ "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کردی" کو موضوع قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ان حضرات پر اس حبشی کی حکایت صادق آتی ہے جسے راستہ میں کہیں آئینہ پڑا ہوا مل گیا۔ اسے اٹھایا تو اپنی مکروہ شکل نظر آئی اسے پتھر پر مار کر توڑ دیا اور کہا کہ تو ایسا ہی بدشکل تھا تبھی تو تجھے کسی نے یہاں پھینک دیا۔ ان حضرات کو بھی حدیث نبویؐ کے آئینہ میں اپنی شکل بھیانک نظر آئی تو انہوں نے اس حدیث کو ہی مجروح کرنے کی کوشش کی۔ یہ حدیث نہ موضوع ہے نہ کمزور بلکہ اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ اس حدیث کے لیے درج ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیے:

- صحیح بخاری، جلد ۱ ص ۶۳۷ (باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ وقیصر۔ جلد ۲ ص ۱۰۵۲، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر)
- نسائی، جلد ۲ ص ۳۰۴ (باب النہی عن استعمال النساء فی الحکم)
- ترمذی، جلد ۲۔ ص ۵۱ (قبیل ابواب الرؤیا)
- مستدرک حاکم، جلد ۳۔ ص ۱۱۹
- سنن کبریٰ للبیہقی: جلد ۳ ص ۹۰ باب لا یأتم رجل بامرأۃ۔ جلد ۱۰ ص ۱۱۸ باب لا یولی الوالی امرأۃ الخ)

○ مسند احمد: جلد ۵۔ ص ۳۸، ۴۳، ۴۷، ۵۱۔

اس حدیث کا صحیح بخاری میں ہونا ہی اس کی صحت کی کافی ضمانت ہے۔ امام حاکمؒ اس کو نقل کر کے "صحیح علیٰ شرط الشیخین" فرماتے ہیں۔ اور امام ذہبیؒ تلخیص مستدرک میں اس کو صحیح علیٰ شرط الشیخین تسلیم کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث کو بے شمار ائمہ حدیث اور فقہائے امت نے نقل کیا، اس سے اہم ترین مسائل کا استخراج کیا ہے مگر کسی نے کبھی یہ بحث نہیں اُٹھائی کہ یہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں؟ آج اس حدیث کی صحت کے بارے میں وہ لوگ شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں جو ابوبکرؓ اور ابوبکرہؓ کے درمیان فرق نہیں کر سکتے۔ اور یہ محض اس لیے کہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خواہشِ نفس کے خلاف ہے۔ اسی مضمون کی دوسری حدیث مستدرک حاکم (جلد ۴ ص ۲۹۱) میں ہے:

"عن ابی بکرۃ رضی اللّٰہ عنہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اتاہ بشیر یبشرہٗ بظفر خیل لہٗ وراسہ فی حجر عائشۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا، فقام، فخرّ للّٰہ تعالیٰ ساجداً فلما انصرف انشاء یسأل الرسول، فحدثہٗ، فکان فیما حدثہٗ من امر العدو: وکانت تلیھم امرأۃ فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ھلکت الرجال حین اطاعت النساء۔" (قال الحاکم ھذا صحیح الاسناد ولم یخرجاہ۔ واقرہ الذھبی۔)

"حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قاصد اس لشکر کی کامیابی کی خوشخبری لے کر آیا جو آپؐ نے کسی مہم پر بھیجا تھا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سرِ مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ آپؐ اٹھے اور خوشخبری سُن کر سجدۂ شکر بجالائے۔ سجدہ سے اُٹھے تو قاصد سے حالات دریافت فرمانے لگے۔ اس نے دشمن کے حالات بتاتے ہوئے یہ بھی

بتایا کہ ان کی حکمران ایک عورت تھی' یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہلاک ہو گئے مرد جب انہوں نے عورتوں کی ماتحتی قبول کر لی"۔

امام حاکم اس حدیث کی تخریج کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے' امام ذہبی حاکم کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

۲: کیا ابوبکر بن العربیؒ نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے:

ایک صاحب نے تو اس حدیث کو موضوع ثابت کرنے کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ و محدّث قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کا حوالہ بھی دے ڈالا' وہ لکھتے ہیں:

> "علامہ ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب "عواصم القواصم" میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی احتجاجی مہم کو ان کا غلط فیصلہ ثابت کرنے کے لیے یہ حدیث وضع کی گئی"۔ (روزنامہ جنگ کراچی ص۷' ۲۴ دسمبر ۸۸ء)

جن حضرات نے قاضی ابوبکر ابن العربیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) کی "العواصم من القواصم" کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہو گا کہ اس پوری کتاب میں زیرِ بحث حدیث کا کہیں ذکر نہیں آیا اور جس حدیث کا کتاب میں ذکر ہی نہ آیا ہو اس پر کلام کرنے یا اس کو موضوع و مجروح قرار دینے کا کیا سوال؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قصہ میں قاضی ابوبکر ابن العربیؒ نے حدیث حوأب' کو ذکر کر کے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> "واما الذی ذکرتم من الشهادة علیٰ ماء الحوأب' فقد بؤتم فی ذکرها باعظم حوب' ما کان قط شیٔ مما ذکرتم' ولا قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذالك الحديث"۔ (العواصم من القواصم ص ۱۶۱)
>
> "اور یہ جو تم نے "ماءِ حوأب" پر شہادت کا ذکر کیا ہے' اس کو ذکر کر کے تم نے سب سے بڑے گناہ (جھوٹی شہادت) کا ارتکاب کیا ہے' جو واقعہ تم نے ذکر کیا ہے وہ کبھی ہُوا ہی نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہ حدیث کبھی ارشاد فرمائی"۔[1]

مضمون نگار کی اس خیانت و بد دیانتی اور بہتان طرازی کی داد دیجئے کہ محض جھوٹا اور صریح غلط حوالہ دے کر ایک صحیح حدیث کو (نعوذ باللہ) موضوع ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مضمون نگار نے صحیح حدیث کو ردّ کرنے کے لیے قاضی ابوبکر بن العربیؒ پر جو بہتان باندھا ہے اس کی تردید کے لیے خود قاضی ابوبکرؒ کی اپنی تصریحات کافی ہیں، قاضی ابوبکر ابن العربیؒ اپنی کتاب 'احکام القرآن' میں سورۃ النمل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"فیھا ثلاث مسائل .... المسألة الثالثة: روی فی الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال حین بلغہ ان کسریٰ لما مات ولّی قومہ ابنتہ: "لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأة"___ وھذا نص فی ان المرأة لا تکون خلیفة ولاخلاف فیہ"۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۴۵۶)

"اس آیت میں تین مسئلے ہیں...... تیسرا مسئلہ: صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ کسریٰ کے مرنے پر اس کی قوم نے حکومت اس کی بیٹی کے حوالے کر دی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا" وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی"۔ اور یہ ارشادِ نبویؐ اس مسئلہ میں نصِ صریح ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی۔ اور اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں"۔

---

[1]: 'حدیث حوأب' کے بارے میں بھی یہ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی ذاتی رائے ہے، یہ حدیث مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۲۰، صحیح ابن حبان (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان جلد ۹ ص ۲۵۹ حدیث نمبر ۶۶۹۷، موارد الظمآن ص ۴۵۳ حدیث نمبر ۱۸۳۱) میں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: اخرج ہذا احمد وابو یعلیٰ والبزار والحاکم، وسندہ علیٰ شرط الصحیح (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۵۵)۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: ہذا اسناد علیٰ شرط الصحیحین ولم یخرجوہ (البدایہ والنہایہ جلد ۶ ص ۲۱۲)، حافظ شمس الدین ذہبیؒ فرماتے ہیں: ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجوہ (سیر اعلام النبلاءُ جلد ۲ ص ۱۷۸)، حافظ نور الدین ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ احمد و ابو یعلیٰ والبزار ورجال احمد رجال الصحیح (مجمع الزوائد جلد ۷ ص ۲۳۴)۔

اور شرح ترمذی میں قاضی ابوبکر ابن العربیؒ لکھتے ہیں:

"ذکر عن ابی بکرۃ قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: "لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ" (العارضہ) ھذا یدل ان الولایۃ للرجال لیس للنساء فیھا مدخل بالاجماع" (عارضۃ الاحوذی بشرح صحیح الترمذی جلد ۹ ص ۱۱۹)

"امام ترمذیؒ نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی"۔ یہ ارشادِ نبویؐ اس اجماعی مسئلہ کی دلیل ہے کہ حکومت مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں"۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دونوں کتابوں میں قاضی ابوبکر ابن العربیؒ اس مسئلہ پر اجماع نقل کر رہے ہیں کہ عورت، حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکور الصدر ارشاد کو اس کی دلیل اور نص صریح قرار دے رہے ہیں۔

کیا یہ حدیث عمومی حکم نہیں رکھتی؟

انہی مضمون نگار صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے:

"علاوہ ازیں یہ حدیث ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اس سے عمومی حکم ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔"

کس آیت اور حدیث سے عمومی حکم ثابت ہوتا ہے اور کس سے نہیں؟ اس کو ائمہ مجتہدین اور فقہائے اُمت بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی کتاب کے نام کی املا صحیح نہیں لکھ سکتے اور "العواصم من القواصم" کی جگہ "عواصم القواصم" لکھ جاتے ہیں اور جو "ابنِ عربی" اور "ابن العربی" کے درمیان فرق نہیں جانتے وہ کسی آیت یا حدیث کے عموم و خصوص کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔ اور اگر ہم اپنی ذاتی خواہش پر ایسے فیصلے

صادر بھی کریں تو ہمارے علم و فہم اور ہماری دیانت و امانت کے پیشِ نظر ایسے فیصلوں کی کیا قیمت ہوگی؟ اہلِ علم اس سے خوب واقف ہیں۔ تعجب ہے کہ جو شخص ایک حوالہ بھی صحیح نقل نہیں کرتا اور جو کتاب اور مصنف کے نام تک غلط لکھتا ہے وہ (تمام ائمہ فقہاء کے علی الرغم) حدیثِ نبویؐ میں اجتہاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں بلکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔
حالانکہ بہت موٹی سی بات ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حدیث میں صرف اہلِ ایران کے عدمِ فلاح کو بیان کرنا ہوتا تو اس کے لیے ایک لفظ کافی تھا یعنی "لَنْ یُفْلِحُوْا" (کہ یہ لوگ کبھی فلاح نہیں پائیں گے)۔ اس چھوٹے سے مضمون کو ادا کرنے کے لیے اتنا طویل فقرہ استعمال نہ فرمایا جاتا۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس حدیث میں "قوم" کا لفظ نکرہ ہے جو سیاق نفی میں واقع ہے اور یہ قطعی عموم کا فائدہ دیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوّل سے آخر تک تمام اہلِ علم نے اس حدیث سے بالاجماع یہ سمجھا ہے کہ یہ حکم عام ہے اور یہ کہ اس ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں یہ طے شدہ امر ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ "اس میں عمومی حکم نہیں بلکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے" ارشادِ نبویؐ کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہے، جسے کسی بھی طرح مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔

کیا خبرِ واحد حلال و حرام میں حجّت نہیں؟

یہی صاحب اپنے مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

"علاوہ ازیں یہ حدیث خبرِ واحد ہے۔ متواتر یا مشہور حدیث نہیں، خبرِ واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ کسی عمل کو مکروہ ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں۔"

اس عبارت میں تین دعوے ہیں اور تینوں غلط ہیں۔ موصوف کا یہ دعویٰ کہ "یہ حدیث خبر واحد ہے متواتر یا مشہور حدیث نہیں"۔ اس لیے غلط ہے کہ اس حدیث کے مضمون پر امت کا اجماع ہے، جیسا کہ امام قرطبیؒ، ابوبکر ابن العربیؒ، علامہ عبدالعزیز فرہارویؒ اور دیگر اکابر کی تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے اور جس حدیث پر اُمت کا اجماع ہو اور اُمت نے اُسے بالاتفاق قبول کیا ہو وہ حدیث حجت قطعیہ بن جاتی ہے اور اسے تواتر معنوی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ اپنی بے نظیر کتاب "احکام القرآن" میں ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وقد استعملت الامة هذين الحديثين في نقصان العدّة وان كان وروده من طريق الاحاد فصار في حيز التواتر لان ما تلقاه الناس بالقبول من اخبار الاحاد فهو عندنا في معنى التواتر لما بيناه في مواضع"۔

(احکام القرآن جلد ۱ ص ۳۸۶)

"اُمت نے نقصان عدت کے مسئلہ میں ان دونوں حدیثوں سے استدلال کیا ہے، اگرچہ یہ حدیث خبرِ واحد کے طریق سے وارد ہوئی ہے لیکن یہ متواتر کے درجہ میں ہے کیونکہ جس خبرِ واحد کو تمام لوگوں نے قبول کیا ہو وہ ہمارے نزدیک متواتر کے حکم میں ہے جس کی وجہ ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں"۔

علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ جب خبر واحد کے حکم پر اجماع ہو جائے تو وہ حکم قطعی ہو جاتا ہے اور اس حدیث کے ثبوت وعدم ثبوت کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحلیم لکھنویؒ نور الانوار کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"وفائدة الاجماع بعد وجود السند سقوط البحث وصيرورة الحكم قطعيا"۔

(حاشیہ نور الانوار ص ۲۲۲)

"اور سند اجماع کے وجود کے بعد اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ بحث ختم ہو جاتی ہے

اور وہ حکم قطعی ہو جاتا ہے۔"

شیخ یحییٰ ہارون مصری، شرح منار لابن ملک کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"وفائدة الاجماع بعد وجود السند سقوط البحث عن الدليل وحرمة المخالفة وضرورة كون الحكم قطعيا۔"

(شرح المنار وحواشیہ من الاصول جلد ۲ ص ۷۰۵)

"اور سند اجماع کے بعد اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ دلیل کے بارے میں بحث ختم ہو جاتی ہے، اس کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے اور حکم بدیہی طور پر قطعی ہو جاتا ہے۔"

اوپر گزر چکا ہے کہ حدیث نبویؐ: "لن يفلح قوم ولّوا امرهم امرأة" کو تمام علمائے اُمّت اور ائمہ دین نے قبول کیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے بالاتفاق یہ فیصلہ دیا ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی جس طرح نماز میں مردوں کی امام نہیں بن سکتی پس جب یہ حدیث تمام اہلِ علم اور ائمہ دین کے اجماع کی سند ہے تو اس کو خبر واحد کہہ کر رد کر دینا ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ساتھ ناروا گستاخی ہے اور دوسری طرف تمام ائمہ دین کے اجماع کو باطل قرار دینا ہے۔ امام فخر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں:

"ومن انكر الاجماع فقد ابطل الدين كله لان مدار اصول الدين كلها ومرجعها الى اجماع المسلمين۔" (اصول بزدوی ص ۲۴۷)

"اور جس شخص نے اجماع کا انکار کر دیا اس نے پورے دین کو باطل کر دیا کیونکہ دین کے تمام اصول کا مدار و مرجع مسلمانوں کا اجماع ہی ہے۔"

مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ "خبرِ واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا" قطعاً غلط اور مہمل ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی سوجھ بوجھ بھی ہو وہ جانتا ہے کہ دینِ اسلام کے بے شمار مسائل اخبار آحاد ہی سے لئے گئے ہیں۔ موصوف کے نظریئے سے یہ تمام مسائل باطل قرار پائیں گے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے بقول:

"ایں اعتقاد نکند مگر جاہلے کہ از جہل خود بے خبر است یا زندیقے کہ مقصودش ابطالِ شطر دین است"۔ (مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۵۵)

خبر واحد کا جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں حجت ہونا اہلِ حق اور ائمہ ہُدیٰ کا مسلّمہ اصول ہے علم اصول کے مبتدی طلبہ کو بھی یہ فقرہ یاد ہوگا:

"خبر الواحد یوجب العمل لا العلم"۔

"خبر واحد عمل کو واجب کرتی ہے۔ یقین کا فائدہ نہیں دیتی"۔

مضمون نگار کا تعلق اگر منکرینِ حدیث سے نہیں تو انہیں غلط سلط اصول گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ردّ کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔

موصوف کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ "مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں"۔ یہ بھی غلط اور مغالطہ آمیز ہے۔ کیونکہ مکروہ کا لفظ کبھی حرام کے لیے بولا جاتا ہے، کبھی مکروہ تحریمی کے لیے اور کبھی مکروہ تنزیہی کے لیے۔ مکروہ تحریمی حرام کے قریب ہے اور مکروہ تنزیہی جائز کے قریب ہے۔ علامہ شامیؒ مکروہاتِ وضو کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"(قوله ومكروهه) هو ضد المحبوب، قد يطلق على الحرام كقول القدوری فی مختصره: ومن صلی الظهر فی منزله یوم الجمعة قبل صلاة الامام ولا عذر له كره له ذلك، وعلى المكروه تحريما وهو ما كان الى الحرام اقرب، ويسميه محمد حراماً ظنياً۔ وعلى المكروه تنزيهاً: وهو ما كان تركه اولى من فعله ويرادف خلاف الاولى كما قدمناه"۔ (شامی، ردالمحتار جلد ۱: ص ۱۳۱)

"مکروہ کا لفظ محبوب کی ضد ہے۔ یہ کبھی حرام پر بولا جاتا ہے کبھی مکروہ تحریمی پر اور مکروہ تحریمی وہ ہے جو حرام سے قریب تر ہو۔ امام محمد (رحمۃ اللہ علیہ) اسی کو "حرام ظنی" فرماتے ہیں۔ اور کبھی مکروہ تنزیہی پر بولا جاتا ہے، اور مکروہ

تنزیہی وہ ہے جس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر ہو۔ اسی کو خلافِ اولیٰ بھی کہتے ہیں۔"

اور مکروہ کا لفظ جب جائز و ناجائز کے باب میں مطلق بولا جائے تو اس سے مکروہِ تحریمی مراد ہوتا ہے جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الحظر والاباحۃ میں تصریح کی ہے۔ (جلد ۶ ص ۳۳۷)

اس لیے موصوف کا مطلقاً یہ کہنا کہ "مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں" نہ صرف مغالطہ ہے بلکہ لوگوں کو مکروہاتِ شرعیہ کے ارتکاب پر جری کرنے والا ہے۔

ملکۂ سبأ کے قصّہ سے استدلال:

بعض حضرات نے ملکۂ سبأ کے قصہ سے، جو قرآن مجید میں مذکور ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس قصّہ سے استدلال نہایت عجیب ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک مشرک قوم کی ملکہ تھیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے "فھم لا یھتدون"۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر وہ آپؑ کے تابع فرمان ہو گئی تھیں اور کسی صحیح روایت میں یہ وارد نہیں ہے کہ ان کے اسلام لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکومت پر برقرار رکھا تھا۔ امام قرطبیؒ نے اس سلسلہ میں اسرائیلی قصے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

"لم یرد فیہ خبر صحیح لا فی انہٗ تزوّجھا ولا فی انہ زوّجھا"

(قرطبی: الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۳ صفحہ ۲۱۱)

"اس بارے میں کوئی صحیح روایت وارد نہیں ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے خود شادی کرلی تھی اور نہ یہ کہ کسی دوسرے سے شادی کردی تھی۔"

جب تک کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکومت

پر برقرار رکھا تھا تب تک یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ کم از کم حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں عورت کو حکومت کا سربراہ بنانا جائز تھا۔

علاوہ ازیں انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات سے استدلال اس وقت جائز ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں ہمیں اس سے کوئی مختلف ہدایت نہ فرمائی ہو۔ زیرِ بحث مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت موجود ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں ہو سکتی اور اسی پر امتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا اب اگر کسی قطعی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبأ کو حکومت پر برقرار رکھا تھا تو ہدایتِ نبویؐ اور اجماع امت کے بعد اس سے استدلال کرنا صریح طور پر غلط ہوگا۔

حضرتِ اقدس مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی (سابق مفتی اعظم پاکستان) نے احکام القرآن میں اس آیت پر بہت نفیس کلام فرمایا ہے جو بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کا ضروری اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"المرأة لا تصلح تكون ملكة او اماماً":

"فعلم ان المرأة لا تصلح ان تكون ملكة فى شريعة محمد صلى الله عليه وسلم وكان واقعة بلقيس من عمل الكفرة فلا يحتج به على ما قاله الألوسى۔ وان قيل ان اسلوب القرآن الحكيم فى عامة مواضعه انه اذا ذكر فعلا منكراً من الكفار صرح عليه بالانكار۔ فعدم الانكار عليه فى هذه الآية لعله كان مشيراً الى الجواز، قلنا اولاً لا يعلم عموم ما قيل وثانياً لا يلزم ان يكون التصريح بالانكار فى ذلك الموضع بل يكفى الانكار عليه فى شيئ من آياته ولو فى موضع آخر بل فى حجة من حجج الشرعية فاذا ورد الانكار عليه فى حديث البخارى كفى لبيان كونه منكراً كما يرشدك النظر فى امثال هذه المواضع افاده شيخنا

دامت عوارفہ ویوید حدیث البخاری ماروا الذہبی فی تلخیص المستدرک عن ابی بکرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتاہ بشیر یبشر بظفر جیل له وراسه فی حجر عائشة رضی اللہ عنہا فقام فخر للہ ساجداً فلما انصرف انشاء یسال الرسول فحدثه فکان فیما حدثه من امر العدو وکانت تلیہم امرأۃ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم هلکت الرجال حین اطاعت النساء قال الذهبی صحیح" (مستدرک ۲۹۱ ج ۴) (مفتی محمد شفیعؒ۔ احکام القرآن جلد ۵ ص ۱۸)

عورت ملکہ یا امام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی :

در روح المعانی اور در مختار کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں عورت ملکہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بلقیس کا واقعہ کافروں کا عمل ہے' لہٰذا اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آلوسیؒ نے کہا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ قرآن کریم کا انداز عام مقامات میں یہ ہے کہ جب وہ کفار کے کسی منکر فعل کا ذکر کرتا ہے تو اس پر صراحتہً انکار کرتا ہے' اس آیت میں اس فعل پر انکار نہ کرنا شاید جواز کی طرف مشیر ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اول تو قرآن کریم کا جو اسلوب اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کا عموم معلوم نہیں۔ علاوہ ازیں ضروری نہیں کہ انکار کی تصریح اسی موقع پر کر دی جائے بلکہ اس کی کسی آیت میں انکار کا پایا جانا کافی ہے۔ خواہ کسی دوسری جگہ ہو۔ بلکہ دلائل شرعیہ میں سے کسی دلیل میں انکار کا پایا جانا بھی کافی ہے۔ پس جب کہ صحیح بخاری میں عورت کی حکمرانی پر نکیر آ چکی ہے' تو اس فعل کے 'منکر' ہونے کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ اس قسم کے مواقع میں نظر کرنا تمہاری رہنمائی کرے گا۔ یہ ہمارے شیخ (حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ) دامت عوارفہ کا افادہ ہے صحیح بخاری کی حدیث کی تائید تلخیص مستدرک کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے"۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے استدلال :

بعض حضرات نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر جنگِ جمل کے واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگِ جمل میں قیادت کی تھی۔ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہؓ نے ان کی قیادت کو تسلیم کیا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کو نہ اس موقع پر خلافت و امارت کا دعویٰ تھا، نہ انہیں کسی مہم کے لیے کسی نے امیر منتخب کیا تھا، نہ ان کے سیاسی مقاصد تھے اور نہ وہ جنگ و قتال کے لیے نکلی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے موقع پر وہ دیگر امہات المومنین کے ساتھ حج پر گئی ہوئی تھیں۔ اکابر صحابہ وہاں جمع ہوئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ مادرِ مشفق کی حیثیت سے انہیں اُمت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے اور ہولناک صورتِ حال کی اصلاح کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی لائق صد احترام شخصیت اس فتنہ کو فرو کرنے میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے ___ اس وقت نہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی امارت کسی کے گوشۂ ذہن میں تھی اور نہ کسی کو خیال تھا کہ انہیں حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے لڑا دیا جائے گا۔ چنانچہ بصرہ پہنچنے کے بعد جب قعقاع بن حکیمؒ نے ان سے تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو انہوں نے فرمایا :

"اے بُنَیَّ! لاصلاح بین الناس !"

"بیٹا! میرے آنے کا مقصد لوگوں کے درمیان اصلاح کرانا ہے۔"

اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی مصالحتی گفتگو میں "اصلاح بین الناس" کا نقشہ مرتب بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن مفسدوں کو اس میں اپنی موت

نظر آئی اور انہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعہ رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا۔ اس طرح اصلاح کی مخلصانہ کوشش "جنگ جمل" میں تبدیل کر دی گئی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

" فان عائشة لم تقاتل ولم تخرج لقتال وانما خرجت بقصد الاصلاح بین المسلمین وظنت ان فی خروجها مصلحة للمسلمین...... ولم یکن یوم الجمل لهؤلاء قصد فی القتال، ولکن وقع الاقتتال بغیر اختیارهم، فانه لما تراسل علی وطلحة والزبیر وقصدوا الاتفاق علی المصلحة، وانهم اذا تمکنوا طلبوا قتلة عثمان اهل الفتنة......فخشی القتلة ان یتفق علیٰ معهم علیٰ امساك القتلة فحملوا علی عسکر طلحة والزبیر، فظن طلحة والزبیر ان علیاً حمل علیهم، فحملوا دفعاً عن انفسهم، فظن علیٌ انهم حملوا علیه فحمل دفعاً عن نفسه، فوقعت الفتنة بغیر اختیارهم وعائشة راکبة، لا قاتلت ولا امرت با لقتال هکذا ذکره غیر واحد من اهل المعرفة بالاخبار"۔ (منہاج السنہ جلد ۲، ص ۱۸۵)

"کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہ قتال کیا اور نہ قتال کے لیے نکلی تھیں وہ تو اصلاح بین المسلمین کے قصد سے تشریف لائی تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ ان کی تشریف آوری میں مسلمانوں کی مصلحت ہے.... اور جنگِ جمل کے دن ان حضرات کا قتال کا قصد نہیں تھا لیکن ان کے اختیار کے بغیر قتال کی نوبت آئی۔ قصہ یہ ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرات طلحہؓ و زبیر رضی اللہ عنہما سے مراسلت ہوئی اور انہوں نے مصالحت پر اتفاق کرنے کا عزم کر لیا اور یہ طے ہوا کہ جب قدرت ہوگی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین اہلِ فتنہ پر گرفت ہو سکے گی...... قاتلین عثمانؓ کے لیے یہ

خطرہ کی گھنٹی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمانؓ پر گرفت کرنے میں ان حضرات کے ساتھ متفق ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے کیمپ پر شبخون مارا، طلحہؓ و زبیرؓ یہ سمجھے کہ علیؓ نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ انہوں نے مدافعانہ حملہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ ان لوگوں نے حملہ کیا ہے انہوں نے اپنی مدافعت میں جنگ شروع کر دی۔ یوں ان کے اختیار کے بغیر یہ فتنہ برپا ہو کر رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (ہودج میں) سوار تھیں، وہ نہ لڑیں نہ انہوں نے لڑنے کا حکم دیا۔ بہت سے مؤرخین نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔"

مسند الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ نے 'تحفہ اثنا عشریہ' میں اس کو مفصل لکھا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اکابر صحابہؓ کے اصرار کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"و عائشہؓ را نیز باعث شدند کہ تا رفع فتنہ و حصول امن و درستیِ امورِ خلافت و ملاقات ما با خلیفۂ وقت ہمراہ ما باش، تا بپاس ادب تو کہ مادر مسلمانی و حرم محترم رسولؐ و از جملہ ازواج محبوب تر و مقبول بودہ ایں اشقیا قصد ما نکنند و مارا تلف نہ سازند، ناچار عائشہؓ بقصد اصلاح و انتظام امور امت و حفظ جان چندے از کبرا صحابہ رسولؐ کہ ہم اقارب او بودند بسمت بصرہ حرکت فرمود۔"

(تحفہ اثنا عشریہ ص: ۴۴۴، مطبوعہ سہیل اکیڈمی۔ لاہور)

"ان حضرات نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی اصرار کیا کہ جب تک فتنہ نہیں اُٹھ جاتا امن کامل نہیں ہو جاتا، امورِ خلافت درست نہیں ہو جاتے اور خلیفۂ وقت سے ہماری ملاقات نہیں ہو جاتی آپؓ بھی ہمارے ساتھ رہیں کیونکہ آپ مسلمانوں کی مادرِ مشفق ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائق صد احترام حرم ہیں۔ اور ازواج مطہرات میں سب سے محبوب و مقبول تھیں، اس لیے

آپ کے پاسِ ادب کی وجہ سے یہ اشقیاء ہمارا قصد نہیں کریں گے، ہمیں تلف نہیں کریں گے۔ لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے لوگوں کے درمیان صلح کرانے، امورِ امت کو نظم میں لانے اور چند اکابر صحابہؓ، جو آپ کے عزیز بھی ہوتے تھے، ان کی جان کی حفاظت کی خاطر بصرہ کا رُخ کیا۔"

الغرض حضرت امّ المؤمنین رضی اللہ عنہا اس لشکر کی نہ امیر تھیں، نہ سپہ سالار، نہ ان کے سیاسی مقاصد تھے اور نہ حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ سے مقابلہ ومقاتلہ ان کا مقصود تھا۔ ان کو اکابر صحابہؓ نے مادرِ مشفق کی حیثیت سے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کیا تاکہ ان کی لائقِ صد احترام شخصیت کی وجہ سے اصلاحِ احوال میں سہولت ہو۔

اس کے باوجود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی۔ راستہ میں جب ایک مقام 'حواب' پر پہنچیں تو واپسی کا ارادہ فرمایا، لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکیں:

قیس بن ابی حازم البجلی کا بیان ہے:

"لما اقبلت عائشة، فلما بلغت میاہ بنی عامر لیلاً نبحت الکلاب، فقالت: ای ماءٍ ھذا؟ قالوا: ماء الحوأب، قالت: ما اظننی الا اننی راجعة، قال بعض من کان معها: بل تقدمین فیراك المسلمون، فیصلح اللّٰه ذات بینهم، قالت: ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال ذات یوم: کیف باحداکن تنبح علیها کلاب الحوأب؟" (سیر اعلام النبلاء جلد:۲، ص: ۱۷۷)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب مکہ سے بصرہ روانہ ہوئیں، دورانِ سفر جب رات کے وقت بنو عامر کی آبادی میں پہنچیں تو کتے بھونکے، دریافت فرمایا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بتایا گیا کہ یہ 'حواب' ہے، فرمایا: میرا خیال ہے کہ مجھے یہیں سے واپس لوٹنا ہے۔ آپ کے بعض ہمراہیوں نے کہا کہ نہیں آپ کو آگے چلنا چاہیئے۔ آپ کو دیکھ کر مسلمان متفق ہو جائیں گے، اس طرح آپ کی

برکت سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت کی اصلاح فرما دیں گے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا تھا، "تم (ازواجِ مطہراتؓ) میں سے ایک کی کیا حالت ہوگی، جب کہ اس پر 'حواٗب' کے کتے بھونکیں گے"۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" حضرت عائشہ درین اصرار معذور بود زیرا کہ وقت خروج از مکہ نمیدانست کہ درین راہ چشمۂ حواٗب نام واقع خواہد شد و برآن گزشتن لازم خواہد آمد و چون برآن آب رسید و دانست ارادہ رجوع مصمم کرد لکن میسرش نشد زیرا کہ کسے از اہل لشکر ہمراہ او در رفاقت در رجوع نہ کرد و در حدیث نیز بعد از وقوع واقع ہیچ ارشاد نہ فرمودہ اند کہ چہ باید کرد ناچار بقصد اصلاح ذات البین کہ بلاشبہہ مامور بہ ست پیشتر روانہ شد پس حالت حضرت عائشہ درین مرور حالت شخصی لست کہ طفلے را از دور دید کہ میخواہد در چاہے بیفتد بے اختیار برائے خلاص کردن او دوید و در اثنائے دویدن بے خبر محاذی نماز گزارندہ مرور واقع شدہ او را در وقت محاذات اطلاع دست داد کہ من محاذی نماز گزارندہ ام پس اگر بر عقب میگردد آن طفل در چاہ می افتد این مرور واقع شدہ را تدارک نمیتواند شد ناچار قصد خلاصی طفل خواہد کرد این مرور را در حق خود معفو خواہد شناخت"۔

(تحفہ اثنا عشریہ، ص ۳۳۲)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس اصرار میں معذور تھیں کہ مکہ سے نکلتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس راستے میں حواٗب نامی چشمہ واقع ہوگا، اور اس پر سے گزرنا پڑے گا، اور جب اس پر پہنچیں اور علم ہوا تو واپسی کا پختہ ارادہ کر لیا، لیکن واپسی میسر نہ آئی۔ کیونکہ اہل لشکر میں سے کسی نے رجوع میں ان کے ساتھ رفاقت نہیں کی اور حدیث (حواٗب) میں بھی کوئی ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ واقعہ کے وقوع

میں آنے کے بعد کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے ناچار اصلاح ذات البین کی غرض سے، جو بلاشبہ مامور بہ ہے، آگے روانہ ہوئیں ۔۔۔ پس اس گزرنے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے کہ جس نے دُور سے کسی بچے کو دیکھا کہ کنویں میں گرا چاہتا ہے، دیکھتے ہی اس کو بچانے کے لیے دوڑ پڑا، اور دوڑتے ہوئے بے خبری میں کسی نمازی کے سامنے سے مرور واقع ہوا اور مین سامنے آنے کے وقت معلوم ہوا کہ میں نمازی کے آگے سے گزر رہا ہوں۔ اب اگر پیچھے ہٹتا ہے تو وہ کنویں میں گر جائے گا، اور یہ جو نمازی کے سامنے آچکا ہے اس کا تدارک نہیں ہوسکتا، ناچار اس نے بچے کو بچانے کا قصد کیا اور اس گزرنے کو اپنے حق میں لائق عفو سمجھا۔"

بعد میں بھی جب انہیں 'جنگِ جمل' کا واقعہ یاد آتا تو نہایت افسوس کرتیں، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"ہر گاہ یوم الجمل را یاد می فرمود آن قدر میگریست کہ معجر مبارکش بأشک تر می گشت بسبب آنکہ در خروج عجلت فرمود و ترک تأمل نمود و از پیشتر تحقیق نہ فرمود کہ آب حوأب در راہ واقع است یا نہ تا آنکہ این قسم واقعہ عظمٰی رو داد۔"

(تحفہ اثنا عشریہ، ص: ۳۳۵)

"آپؓ جب یوم الجمل کو یاد کرتیں تو اتنا روتیں کہ آنچل مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتا کیونکہ اس کا سبب یہ تھا کہ خروج میں عجلت فرمائی، تامل نہیں فرما سکیں اور پہلے سے تحقیق نہ فرمائی کہ آب 'حوأب' راہ میں واقع ہے یا نہیں، یہاں تک کہ اس قسم کا واقعہ عظمٰی رونما ہوا۔"

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ثم تبین لها فیما بعد ان ترك الخروج كان اولٰی فكانت اذا ذكرت

خروجها تبکی حتی تبل خمارها۔" (منہاج السنۃ جلد۲، ص ۱۸۵)

"پھر بعد میں ان کو ظاہر ہوا کہ ترکِ خروج بہتر تھا۔ چنانچہ جب اپنے خروج کو یاد کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آنچل بھیگ جاتا۔"

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ولا ریب ان عائشۃ ندمت ندامۃً کلیۃً علی مسیرها الی البصرۃ و حضورها یوم الجمل، وماظنّت ان الامر یبلغ ما بلغ۔"

(سیر اعلام النبلاء، جلد۲، ص ۱۷۷)

"اس میں شک نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بصرہ جانے اور جنگِ جمل کے دن وہاں موجود ہونے پر کلّی ندامت ہوئی! انہیں یہ وہم و خیال بھی نہ تھا کہ معاملہ کی نوبت یہاں تک پہنچے گی۔"

اظہارِ ندامت کے طور پر فرماتی تھیں:

"وددت انی کنت ثکلت عشرۃ مثل الحارث بن هشام وانی لم اسر مسیری مع ابن الزبیر۔" (مستدرک حاکم جلد۳، ص ۱۱۹)

"میں آرزو کرتی ہوں کہ میرے حارث بن ہشام جیسے دس لائق بیٹے پیدا ہو کر مر گئے ہوتے اور میں ابن زبیر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ (بصرہ) نہ جاتی۔"

کبھی فرماتی تھیں:

"وددت انی جلست کما جلس غیری فکان احب الیّ من ان اکون ولدت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشرۃ کلهم مثل عبد الرحمٰن بن الحارث بن هشام۔" (فتح الباری جلد۱۳، ص ۵۵ —— قال الحافظ اخرجه الطبرانی وفیه ابومعشر نجیح المدنی، وفیه ضعف، وقال الهیثمی رواه الطبرانی وفیه ابومعشر نجیح، وهو ضعیف، یکتب حدیثه، وبقیۃ رجاله ثقات۔ مجمع الزوائد جلد۷، ص: ۲۳۸)

"میں آرزو کرتی ہوں کہ میں گھر میں بیٹھی رہتی جیسا کہ دوسری ازواجِ مطہرات بیٹھی رہیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ محبوب تھی کہ میرے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس بیٹے پیدا ہوتے اور وہ سب عبدالرحمٰن بن حارث جیسے بیٹے ہوتے۔"

اور کبھی فرماتی تھیں:

"وددت انی کنت غصناً رطباً ولم اسر مسیری ھذا۔"

(ازالۃ الخفا، جلد ۲، ص ۲۸۰، مطبوعہ سہیل اکیڈمی۔ لاہور)

"میں آرزو کرتی ہوں کہ اے کاش! میں ہری شاخ ہوتی اور اس سفر پر نہ نکلتی۔"

اسی طرح متعدد صحابہ کرامؓ نے بھی ان کے خروج پر نکیر فرمائی (جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے)۔

اب انصاف فرمائیے کہ جس واقعہ میں حضرت ام المومنین اور ان کے رفقاء (رضی اللہ عنہم) کے ذہن میں حکومت و امارت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، بلکہ ام المومنینؓ اُمت کی ماں کی حیثیت سے اُمت کے درمیان جوڑ پیدا کرنے نکلی تھیں۔ جس واقعہ پر اکابر صحابہؓ نے نکیر فرمائی اور جس پر خود حضرت ام المومنینؓ نے افسوس اور ندامت کا اظہار فرمایا، کیا اس کو "حکومت کے لیے عورت کی سربراہی" کے جواز کی دلیل بنانا صحیح ہے؟

اور یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس پورے سفر میں حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا 'ہودج' میں پردہ نشین رہیں، اور آپ کے محارم آپ کے ساتھ رہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جنگِ جمل کے اختتام کے بعد اعیان و اشراف حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے۔ ایک شخص نے ہودج کے اندر جھانکا، حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا:

"الیك لعنك اللّٰہ، ھتك اللّٰہ سترك، وقطع یدك وابدیٰ عورتك۔"

"پرے ہٹ! اللہ تجھ پر لعنت کرے، تیرا پردہ فاش کرے، تیرے ہاتھ کاٹ ڈالے اور

تیرے ستر کو عریاں کر دے۔"

یہ شخص بصرہ میں قتل ہوا، اس کے بعد اس کے ہاتھ کاٹے گئے اور اس کی برہنہ لاش ویرانے میں ڈال دی گئی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷، ص: ۲۴۵)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ پورا سفر اپنے محرموں کی معیت میں ہودج کے اندر ہوا اور اس ہولناک جنگ میں بھی وہ اپنے ہودج کے اندر پردہ نشین رہیں۔ کسی کو ان کے ہودج کے اندر جھانکنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے کہ آپؓ کے گرد کا پورا مجمع (کیا موافق اور کیا مخالف) آپ کو "ماں" سمجھتا تھا۔ آپ کو اسی احترام و تقدس کا مستحق سمجھتا تھا جو نیک اولاد کے دل میں سگی ماں کا ہوتا ہے۔

ایک طرف اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھیئے۔ دوسری طرف دورِ حاضر کی ان خواتین کے حالات پر غور کیجئے جن کی تعلیم و تربیت اور ذہنی تخلیق مغربی یونیورسٹیوں کی آزاد فضاؤں میں ہوتی ہے جو کسی پردے وردے کی قائل نہیں، جو گھر کی چار دیواری کو جیل سے تشبیہ دیتی ہیں اور چادر اور دوپٹے کو طوق و سلاسل تصور کرتی ہیں، جن کے نزدیک محرم و نامحرم کا امتیاز دقیانوسیت کی علامت ہے۔ اور جلوت و خلوت میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے پر فخر کرتی ہیں، کیا ان خواتین کے لیے حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی مثال پیش کرنا عقل و دانش اور حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟

رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی بیگمات:

بعض حضرات عورت کی سربراہی کا جواز پیش کرنے کے لیے التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ، بیجاپور کے حکمران کی بیوہ چاند بی بی اور بیگماتِ بھوپال کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مگر اہلِ فہم پر روشن ہے کہ کتاب و سنت اور اجماعِ امت کے مقابلے میں ان مثالوں کی کیا قیمت اور حیثیت ہے، مسلمانوں میں دینِ اسلام کے خلاف سیکڑوں منکرات و بدعات رائج ہیں۔ زنا، چوری، شراب

نوشی، سود و قمار اور رشوت جیسے کبائر تک میں لوگ مبتلا ہیں، مگر مسلمانوں میں ان چیزوں کے رواج ہو جانے کو ان کے جواز و اباحت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اگر عورت کی حکمرانی کے شاذ و نادر واقعات پیش آئے ہیں تو انہیں قرآن و سنت اور اجماعِ امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے 'بدعت سیئہ' کہا جائے گا۔ ان واقعات کو عورت کی حکمرانی کے جواز میں پیش کرنا اہلِ عقل و فہم سے نہایت بعید ہے۔

چونکہ عورت کی سربراہی انسانی و نسوانی فطرت کے خلاف ہے اس لیے میں نے ان واقعات کو اُن عجیب الخلقت بچوں کے ساتھ تشبیہ دی تھی جو کبھی مادۂ فطرت کے نقص کی وجہ سے جنم لیتے ہیں، یا ان کی مثال ان پھوڑے پھنسیوں کی ہے جو فسادِ خون کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

ان واقعات پر غور کرتے ہوئے اہلِ فہم کو یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ خواتین کی حکمرانی کے یہ واقعات نظامِ 'شہنشاہیت' کے شاخسانے تھے۔ مثلاً بتایا جاتا ہے کہ سلطان التمش کا لڑکا فیروز نالائق تھا، اور اس کی بیٹی رضیہ بڑی لائق و فائق تھی! اس لیے سلطان نے اپنے بیٹے کے بجائے بیٹی کو تخت کی وارث بنا دیا۔ یہی صورت بیجاپور اور بھوپال کی ریاستوں میں بھی پیش آئی کہ 'تخت کا وارث' کوئی مرد نہیں رہا تھا۔ اس لیے ان خواتین کو اس وراثت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف پرستارانِ جمہوریت اُٹھتے بیٹھتے شہنشاہیت کے سب و شتم کا وظیفہ پڑھتے ہیں، دوسری طرف اسی شہنشاہیت کی نہایت مکروہ اور بگڑی ہوئی شکل کو بطور معیار پیش کر کے اس سے عورت کی حکمرانی کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔

اب دیکھیئے کہ التمش کے تخت کا وارث نالائق تھا اس لیے بامر مجبوری اس نے اپنی بیٹی کو تخت کی وارث بنا دیا — کیا پاکستان کے حالات پر اس واقعہ کو چسپاں کرتے ہوئے ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مرد نالائق تھے اس لیے شہنشاہِ پاکستان کی بیٹی کو پاکستان کے

تخت کی وارث بنایا گیا؟

بیجاپور اور بھوپال کی ریاستوں میں شاہی خاندانوں میں کوئی مرد باقی ہی نہیں رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً بے چاری خواتین کو ریاست کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ کیا پاکستان کے حالات پر ان کی مثال چسپاں کرلے کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس ملک کے سارے مرد مرچکے ہیں اس لیے "دخترِ پاکستان" کو حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ "غرض آدمی کی بصیرت کو اندھا کردیتی ہے"۔ جو حضرات عورت کی حکمرانی کا جواز اس قسم کے واقعات میں تلاش کرتے ہیں۔ ان پر یہ مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔

مس فاطمہ جناح:

بعض حضرات عورت کی سربراہی پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ صدر ایوب خان کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لیے نامزد کیا گیا تھا اور بڑے بڑے علماء نے اس کی تائید کی تھی۔ اس وقت یہ فتوے کہاں چلے گئے تھے؟

لیکن یہ صریح مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ علمائے اُمت اور اہلِ فتویٰ نے اس وقت بھی کھل کر مخالفت کی تھی، کسی ایک مفتی کا نام بھی پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔ (اور جو شخص اجماعِ امت کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت کرے اس کو مفتی کہنا ہی غلط ہے) چنانچہ مولانا مفتی محمودؒ نے اسی بنا پر نہ ایوب خان کے حق میں ووٹ دیا اور نہ فاطمہ جناح کو۔ انہوں نے اپنا ووٹ ہی استعمال نہیں کیا۔

اور جن سیاسی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی تنظیموں نے محض سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر اس منصب کے لیے مس فاطمہ جناح کا انتخاب کیا تھا وہ بھی ان کی سیاسی مجبوری تھی۔ انکے خیال میں پاکستان میں وہ واحد شخصیت تھی جو ایوب خان کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ اور مس فاطمہ جناح نے ان لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ایوب خان کے ہٹائے جانے کے بعد ان کو تین مہینے میں اپنا صدر کوئی دوسرا منتخب کرنا ہوگا۔ الغرض اہلِ فتویٰ کے نزدیک تو مس فاطمہ جناح کی نامزدگی بھی

خلافِ شرع اور ناجائز تھی۔ اور اہلِ سیاست کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی اضطراری کیفیت تھی جس طرح اضطراری کیفیت متذکرہ بالا خواتین کے شاہی خاندانوں کو پیش آئی۔

حضرت تھانویؒ کا فتویٰ

بعض حضرات، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک فتویٰ کا حوالہ دیتے ہیں جو... امداد الفتاویٰ (جلد ۵، ص ۹۹۔۱۰۰) میں شامل ہے۔ اس فتویٰ سے ان حضرات کا استدلال کہاں تک صحیح ہے؟ اس پر غور کرنے کے لیے چند اُمور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ امت کے اس اجماعی فیصلے کے ساتھ پوری طرح متفق ہیں کہ اسلام میں عورت کو سربراہِ حکومت بنانا جائز نہیں، چنانچہ تفسیر بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

(۱) "اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا۔ دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرعِ محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔"

(بیان القرآن جلد ۸، ص: ۸۵)

(۲) اوپر حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ آچکا ہے جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے زیرِ اشراف لکھی گئی اور جس میں خود حضرتؒ ہی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ عورت کا سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں اور بلقیس کے قصہ سے اس کے جواز پر استدلال کرنا غلط ہے۔

(۳) اور خود اسی فتویٰ میں، جس کو عورت کی سربراہی کے لیے پیش کیا جاتا ہے حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرات فقہاء نے امامتِ کبریٰ میں ذکورۃ (مرد ہونے) کو شرطِ صحت اور قضا میں گو شرطِ صحت نہیں، مگر شرطِ صون عن الاثم فرمایا ہے۔" (امداد الفتاویٰ جلد ۵، ص: ۱۰۰)

(۴) اور پر شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی کتاب 'احکام القرآن' کا حوالہ بھی گزر چکا ہے جس میں امامت کبریٰ و صغریٰ کو مرد کی خصوصیت قرار دیا گیا ہے' احکام القرآن کا یہ حصّہ بھی حضرت حکیم الامتؒ کی نگرانی میں مرتب ہوا۔

ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے نزدیک بھی یہ اصُول مسلّم ہے کہ کسی اسلامی مملکت میں حکومت کی سربراہ عورت نہیں ہو سکتی۔

دوم : حضرت نے جس سوال کے جواب میں یہ فتویٰ تحریر فرمایا اس کا پس منظر پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے' صورتِ حال یہ تھی کہ انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے بعد بعض مورُوثی ریاستوں کو برقرار رکھا گیا تھا۔ اور ان کی حیثیت نیم خود مختار ریاستوں کی تھی۔ ان میں بعض مسلم ریاستیں ایسی تھیں جن میں پردہ نشین خواتین کے سوا کوئی قانونی وارث باقی نہیں رہا تھا۔ اب دو صورتیں ممکن تھیں' ایک یہ کہ ان پردہ نشین خواتین کو جنہیں انگریزی قانون ریاست کی قانونی وارث سمجھتا تھا، والیٔ ریاست تسلیم نہ کیا جاتا۔ اس صورت میں ان ریاستوں کی نیم آزادانہ حیثیت ختم ہو جاتی اور یہ انگریزی قلمرو میں مدغم ہو جاتیں' ظاہر ہے کہ یہ ضررِ عظیم تھا۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ محض مشیر کی حیثیت سے ان خواتین کو والیٔ ریاست تسلیم کیا جاتا اور ریاست کا انتظام و انصرام ان خواتین کے مشورہ سے مردوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا۔ ان ریاستوں میں عملاً یہی صورت اختیار کی گئی تھی اور سوال کرنے والے نے اسی صورت کے بارے میں سوال کیا تھا کہ آیا یہ ریاستیں اس حدیث کا مصداق ہیں یا نہیں؟

سوم : اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے حضرتؒ کے فتویٰ پر غور کیجئے۔ حضرت لکھتے ہیں :

"حکومت کی تین قسمیں ہیں' ایک قسم وہ جو تام بھی ہو' عام بھی ہو۔ تام سے مراد یہ کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم کی منظوری کی ضرورت نہ ہو' گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو — اور عام

یہ کہ اس کی محکوم کوئی محدود قلیل جماعت نہ ہو۔

دوسری قسم وہ جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو، تیسری قسم وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو ــــــ مثال اوّل کی کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔ مثال ثانی کی کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلا شرکت ہو۔ مثال ثالث کی کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والیٔ صوری درحقیقت والی نہیں بلکہ ایک رکن مشورہ ہے، اور والیٔ حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے، حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے۔" (امداد الفتاویٰ جلد ۵، ص: ۹۹)

حضرت کی اس تحریر سے واضح ہے کہ صرف ایسی ریاستیں حدیث مذکور کی وعید سے مستثنیٰ ہیں جن میں والیٔ ریاست خواتین کی حیثیت محض مشیر یا رکنِ مشورہ کی ہو اور احکام کے نفاذ کے اختیارات ان کے ہاتھ میں نہ ہوں۔ چنانچہ اس کی وجہ ذکر کرتے ہوئے حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے، اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔" (ص: ۱۰۰)

اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان میں وزارتِ عظمیٰ کا جلیل القدر منصب محض مشیر یا رکنِ مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے (اور یقیناً نفی میں ہے) تو حضرتؒ کی تحریر سے استدلال کرنے والے حضرات خود ہی انصاف فرمائیں کہ ان کا استدلال کہاں تک صحیح ہے؟

پاکستان میں جو پارلیمانی نظام نافذ ہے اس میں وزیر اعظم کا منصب بے اختیار قسم کا محض علامتی منصب نہیں بلکہ وزیر اعظم ملک کی حکومت اور انتظامیہ کا با اقتدار و خود مختار سربراہ ہے۔ آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ملکی نظم و نسق پر اس کو مکمل کنٹرول حاصل ہے، وہ اپنی کابینہ کی تشکیل میں آزاد و خود مختار ہے، اور تمام شعبوں اور وزارتوں کی کارکردگی کا ذمہ دار ہے، وہ اپنی کابینہ سے مشورہ ضرور کرتا ہے لیکن کسی مشورے کا پابند نہیں، وہ جس وزیر یا مشیر کو جس وقت چاہے اس کے منصب سے فارغ کر سکتا ہے۔ اس لیے اس کے تمام وزرا اور مشیران

اس کی رائے اور خواہش کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اپنی ہر حرکت و عمل میں وزیرِ اعظم کے اشارہ چشم و ابرو پر نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ اور وہ کسی ایسے اقدام کی جرأت نہیں کر سکتے جس سے وزیرِ اعظم کے نازک مزاج شاہی کو خدا نخواستہ گرانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عرفِ عام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ ملک میں وزیرِ اعظم کی حکومت ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں وزیرِ اعظم کے دورِ حکومت میں یہ ہوا۔

جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، سب جانتے ہیں کہ وزیرِ اعظم قانون ساز ادارے میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر اور قائدِ ایوان کہلاتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنی رائے اور خواہش کو قانون کی شکل دیکر قانون ساز ادارے سے منظور کرا لیتا ہے۔ اپنی پارٹی کے ارکان پر اسے اعتماد و اطمینان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر کبھی اس قسم کا اندیشہ لاحق ہو تو اپنی پارٹی کے نام خاص ہدایت (حکم) جاری کر سکتا ہے اور اس ہدایت کے جاری ہونے کے بعد پارٹی کے کسی رکن کو وزیرِ اعظم کی خواہش کے خلاف 'چوں' کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء (مسلمانوں کے عائلی قوانین) کے معاملے میں پیش آئی۔ اس کی تفصیلات مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خود نوشت سوانح 'کاروانِ زندگی' حصہ سوم باب چہارم میں ملاحظہ کی جائیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی تحریک اور انتھک محنت و کوشش کے نتیجہ میں وزیرِ اعظم راجیو گاندھی کو اس پر آمادہ کر لیا گیا کہ حکومت ان قوانین کو "بل" کی شکل میں اسمبلی سے منظور کرائے گی، اسمبلی میں 'بل' پیش ہونے کا مرحلہ آیا تو چونکہ ہندوستان کا متعصب پریس اس بل کے خلاف زہر اُگل رہا تھا اور اسمبلی کے اندر بھی مسلمانوں کے خلاف تعصب کی فضا تھی۔ اس لیے شدید خطرہ تھا کہ ہندو اور نام نہاد مسلمان اس بل کی مخالفت کریں گے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"وزیرِ اعظم نے 'وہپ' (حکم) جاری کر دیا کہ پارٹی کے ہر ممبر کو اس کی تائید کرنی ہے۔ مخالفت کی صورت میں وہ پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔ اگر بلا عذر کوئی ممبر اس دن شریک اجلاس نہیں ہوا تو وہ بھی خارج کر دیا جائے گا۔"

(کاروانِ زندگی جلد ۳، ص ۱۴۱)

وزیر اعظم کے اس دہپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بل پر بحث و تمحیص کے بعد:

"رات پونے تین بجے بل پر ووٹنگ عمل میں آئی اور بل کی مخالفت میں ۵۴ ووٹوں کے مقابلہ میں بل کی حمایت میں ۲۷۳ ووٹ آئے، بل کی کامیابی پر چہکتے ہوئے کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، دوسری طرف اپوزیشن کے بل مخالف ممبران تھکے تھکائے ہال سے باہر جا رہے تھے۔" (ایضاً ص ۱۴۷)

یہ صحیح ہے کہ اسمبلی میں حزبِ اختلاف بھی موجود ہوتی ہے اور وہ اقتدار کے مست ہاتھی کو قابو رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے، لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ حزبِ اختلاف کی دھواں دھار تقریروں اور تمام تر شور و غوغا کے باوجود وزیر اعظم اپنی اکثریت کے نشہ میں حزبِ اختلاف کو خاطر میں نہیں لاتا اور وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر جو قانون چاہتا ہے، منظور کرا لیتا ہے۔ دور کیوں جائیے، حزبِ اختلاف کے لائق صد احترام قائد کو ایوان سے باہر پھنکوا کر من مانے قانون منظور کرانے کا تماشا تو خود ہمارے ملک میں دکھایا جا چکا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوری حکومت میں وزیر اعظم کوئی بے اختیار نمائشی بت نہیں ہوتا بلکہ بااختیار صاحبِ حکومت، انتظامیہ کا حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کا بادشاہ شمار ہوتا ہے۔ اور قانون سازی کے دائرے میں بھی وہ قریب قریب مطلق العنان ہوتا ہے۔ اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہونے کی وجہ سے جو قانون چاہے نافذ کر سکتا ہے۔ (اور اگر اسے ایوان میں دو تہائی اکثریت کی حمایت حاصل ہو تو آئین کا تیا پانچہ بھی کر سکتا ہے)

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وزیر اعظم کا منصب محض والئ صوری کا منصب ہے اس لیے حضرت تھانویؒ کے اس فتویٰ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"والئ صوری درحقیقت والی نہیں، بلکہ ایک رکن مشورہ ہے۔"

اور یہ کہ:

"راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔"

جن حضرات نے عورت کی وزارتِ عظمیٰ کے لیے حضرت تھانویؒ کے اس فتوے سے استدلال کی کوشش کی ہے ان کی خدمت میں اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

کیا عورت قاضی بن سکتی ہے؟

بعض حضرات نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورت قاضی بن سکتی ہے تو وزیرِ اعظم کیوں نہیں بن سکتی؟

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ استدلال میں دو غلطیاں ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے جو منقول ہے کہ حدود و قصاص کے علاوہ باقی امور میں عورت کا قاضی بننا صحیح ہے، اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ عورت کو عہدہ قضا پر مقرر کرنا بھی جائز ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ عورت چونکہ اہلِ شہادت ہے اور اسے فی الجملہ ولایت حاصل ہے۔ اس لیے اگر بالفرض اس کو قاضی بنا دیا جائے یا دو فریق، کسی قضیہ میں اس کو حَکَم مان لیں تو حدود و قصاص کے علاوہ دیگر امور میں اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ بشرطیکہ وہ فیصلہ شریعت کے موافق ہو۔۔۔ یہ مطلب نہیں کہ عورت کو قاضی بنانا بھی جائز ہے، نہیں! بلکہ اگر کسی جگہ عورت کو قاضی بنایا جاتا ہے تو بنانے والے بھی گنہ گار ہوں گے، اور منصبِ قضا کو قبول کرنے والی بھی گنہ گار ہوگی۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی عبارت اوپر گزر چکی ہے کہ:

"حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورۃ (مرد ہونے) کو شرطِ صحت اور قضا میں گو شرطِ صحت نہیں، مگر شرطِ صون عن الاثم فرمایا ہے۔" (امداد الفتاویٰ جلد ۵ ص ۱)

حضرت حکیم الامتؒ کے ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ عورت کو قاضی بنانا فقہائے احناف کے نزدیک بھی گناہ ہے مگر اس کے قاضی بنا دیئے جانے کے بعد اس کا فیصلہ غیر حدود و قصاص میں نافذ ہو جائیگا۔

ابوبکر بن العربی المالکیؒ نے بھی حضرت امامؒ کے قول کی یہی توجیہہ کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ونقل عن محمد بن جریر الطبری امام الدین انہ یجوز ان تکون المرأۃ قاضیۃ ولم یصح ذالک عنہ، ولعلہ کما نقل عن ابی حنیفۃؒ انہا انما تقضی فیما تشہد فیہ۔ ولیس ان تکون قاضیۃ علی الاطلاق، ولا بان یکتب لہا منشور بان فلانۃ مقدمۃ علی الحکم الا فی الدماء والنکاح، وانما ذالک کسبیل التحکیم او الاستبانۃ فی القضیۃ الواحدۃ بدلیل قولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم "لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ" وھذا ھو الظن بابی حنیفۃ وابن جریر۔" (احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۴۵)

"امام محمد بن جریر طبریؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت کا قاضی ہونا صحیح ہے مگر یہ نقل صحیح نہیں، شاید یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت جن امور میں شہادت دے سکتی ہے ان میں فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علی الاطلاق قاضی بن جائے، یا یہ کہ اس کے نام پروانہ جاری کر دیا جائے کہ فلانی عورت کو غیر حدود و نکاح میں منصب عدالت پر مقرر کیا جاتا ہے۔ عورت کے فیصلہ کے صحیح ہونے کی بس یہی صورت ہو سکتی ہے کہ کسی معاملہ میں دو فریق اس کو حَکَم بنا لیں یا کبھی کسی قضیہ میں اس کو نائب بنا دیا جائے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے امر حکومت عورت کے سپرد کر دیا۔" امام ابوحنیفہؒ اور امام ابن جریرؒ کے بارے میں یہی گمان کیا جا سکتا ہے۔

حضرت امامؒ کے قول کی قریباً یہی توجیہہ شیخ ابو حیانؒ نے البحر المحیط (۷۔ ۶۷) میں کی ہے جسے صاحب روح المعانی نے بھی نقل کیا ہے۔ (روح المعانی جلد ۱۹، ص ۱۸۹-۱۹۰)

در مختار میں ہے:

"والمرأة تقضی فی غیرحد وقود وان اثم المولی لها، لخبر البخاری لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأة" (رد المحتار جلد ۵، ص ۴۴۰)

"اور عورت غیر حدود و قصاص میں فیصلہ کر سکتی ہے اگرچہ عورت کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے: وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے عورت کو اپنے معاملات سپرد کر دیئے۔"

علامہ ابن ہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

"قولہ: "ویجوز قضاء المرأة فی کل شئی الا فی الحدود والقصاص"

وقال الائمة الثلاثة لا یجوز۔ لان المرأة ناقصة العقل۔ لیست اھلاً للخصومة مع الرجال فی محافل الخصوم۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم: لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأة۔ رواہ البخاری........... والجواب ان ما ذکر غایة ما یفید منع ان تستقضی وعدم حلہ، والکلام فیما لو ولیت واثم المقلد بذالک او حکمھا خصمان فقضت قضاء موافقا لدین اللہ اکان ینفذ ام لا؟ لم ینتھض الدلیل علی نفیہ بعد موافقتہ ما انزل اللہ۔ الا ان یثبت شرعاً سلب اھلیتھا۔ ولیس فی الشرع سوی نقصان عقلھا ومعلومٌ انہ لم یصل الی حد سلب ولایتھا بالکلیة۔ الا تری انھا تصلح شاھدةً وناظرةً فی الاوقاف، ووصیةً علی الیتامی۔ وذالک النقصان بالنسبة والاضافة، ثم ھو منسوب الی الجنس فجاز فی الفرد خلافہ۔ الا تری الی تصریحھم بصدق قولنا: "الرجل خیر من المرأة" مع جواز کون بعض افراد النساء خیراً من بعض افراد الرجال ولذالک النقص الغریزی نسب صلی اللہ علیہ وسلم لمن یولیھن عدم الفلاح فکان الحدیث متعرضاً للمولین ولھن۔ بنقص الحال۔ وھذا حقٌ۔ لکن الکلام فیما لو ولیت فقضت بالحق لماذا یبطل ذالک الحق"

(فتح القدیر جلد ۵، ص ۴۸۶)

مصنف فرماتے ہیں کہ "عورت کی قضا ہر چیز میں صحیح ہے، مگر حدود و قصاص میں نہیں"۔ ـــــــــ

اور ائمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ صحیح نہیں. کیونکہ عورت ناقص العقل ہے۔ وہ خصوم کی محفلوں میں مردوں کے ساتھ خصومت کی اہل نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیئے۔ (صحیح بخاری)۔ . . . .

اور جواب یہ ہے کہ جو دلائل ذکر کئے گئے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ عورت کو قاضی بنانا ممنوع ہے حلال نہیں، اور ہماری گفتگو اس صورت میں ہے کہ اگر عورت کو قاضی بنا دیا گیا اور بنانے والا گنہگار ہوا ہو، یا دو فریقوں نے اسے حَکم بنالیا اور عورت نے ایسا فیصلہ کر دیا جو دین خداوندی کے عین مطابق ہے تو کیا اس کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟ اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی، جبکہ وہ فیصلہ ما انزل اللہ کے موافق بھی ہے اور یہ فیصلہ کا عدم نفاذ اس کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا کہ ثابت ہو جائے کہ شرعاً اس کی اہلیت مسلوب ہے اور شرع میں صرف عورت کا ناقص العقل ہونا ثابت ہے اور سب جانتے

ہیں کہ اس کا نقصانِ عقل اس حد تک نہیں کہ اس کی ولایت کو کلی طور پر سلب کرلے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ عورت گواہ بن سکتی ہے۔ اوقاف کی نگران بن سکتی ہے، اور یتیم کی وصی بن سکتی ہے، عورت کا ناقص العقل ہونا مردوں کی نسبت سے ہے۔ پھر یہ نقصانِ عقل منسوب ہے جنس کی طرف۔ لہٰذا کسی فرد میں اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں کہ اس مقولہ کو بالکل سچا سمجھا گیا ہے کہ "مرد عورت سے بہتر ہے۔" حالانکہ بعض عورتیں بعض مردوں سے بہتر ہوتی

ہیں اور عورتوں کے اس فطری اور خلقی نقص کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم فلاح کو ان لوگوں کی طرف منسوب کیا ہے جو اُن کو والی بنائیں۔ پس حدیث نے ان والی بنانے والوں کے حق میں عدم فلاح کا اور عورتوں کے حق میں نقص حال کا فیصلہ فرمایا ہے اور یہ فیصلہ برحق ہے۔ لیکن اس میں ہماری گفتگو نہیں، بلکہ گفتگو اس صورت میں ہے کہ عورت کو قاضی بنا دیا گیا ہو، پھر وہ حق کے مطابق فیصلہ کرے تو یہ حق، باطل کیوں ہو جائے گا۔"

اکابر کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی عورت کو قاضی بنانا جائز نہیں، بلکہ ——— حرام ہے اور ایسا کرنے والے گنہ گار ہیں، مگر چونکہ عورت اہل شہادت ہے اس لیے اگر اس نے فیصلہ کر دیا، بشرطیکہ وہ فیصلہ شریعت کے موافق ہو، تو نافذ ہو جائے گا۔

ان حضرات کے استدلال میں دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے قیاس کر لیا کہ عورت جب قاضی بن سکتی ہے تو حکمران بھی بن سکتی ہے حالانکہ اول تو یہ قیاس قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ علاوہ ازیں ملک کی حکمرانی کے لیے ولایت مطلقہ شرط ہے جو عورت میں بوجہ نقصانِ عقل و دین کے نہیں پائی جاتی۔ جب کہ قضا کے لیے صرف اہلِ شہادت ہونا شرط ہے اس لیے امامت کبریٰ کو قضا پر قیاس کرنا غلط ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورت کو وزیر اعظم کے منصب پر فائز کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ اس کا عزل واجب ہے۔

سانپ گزر چکا ہے لکیر پیٹنے سے فائدہ؟

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سانپ گزر چکا ہے، اب لکیر پیٹنے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا، سو ہو چکا، اچھا ہوا یا بُرا ہوا، اب علمائے کرام کا واویلا بے از وقت ہے۔

ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اہلِ علم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا صحیح مسئلہ لوگوں کو بتاتے رہیں، اور اگر کوئی غلط اور منکر رواج پائے تو اپنے امکان کی حد تک اس کے

خلاف جہاد کریں۔ اور قوم کو اصلاح کی طرف متوجہ کریں، کسی منکر کو دیکھ کر اس پر سکوت اختیار کر لینا ان کے لیے جائز نہیں۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جب دین کی ایک مسلمہ روایت سے انحراف کیا جا رہا ہو تو اہلِ علم پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے 'حجۃ اللہ البالغہ' میں غلط رسوم کے رائج ہونے کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور بُری رسوم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی وہ لوگ سردار ہوتے ہیں جن پر جزئی رائیں غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلیہ سے بعید ہوتے ہیں تو وہ درندوں کے سے کام کرنے لگتے ہیں......... ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے کوئی ان کو بُرا نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد فاسق فاجر لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان اعمال کے پھیلانے میں بڑی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایک قوم ایسی آتی ہے جن کے دلوں میں نہ اعمالِ صالحہ کا قوی میلان ہوتا ہے نہ اعمالِ فاسدہ کا۔ پس اپنے رؤسا کی حالت دیکھ دیکھ کر ان میں بھی انہی امور کی آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی ان کو نیک باتوں کا پتہ ہی نہیں چلتا اور ایسے خاندانوں کے آخر میں ایسے لوگ باقی رہا کرتے ہیں جن کی فطرتیں درست ہوتی ہیں وہ ان سے میل جول نہیں رکھتے اور غصہ کی حالت میں خاموش رہتے ہیں۔ پس ان کی خاموشی سے بُری رسمیں قائم اور مستحکم ہو جاتی ہیں۔ کامل العقل لوگوں کا فرض ہے کہ حق کے پھیلانے و جاری کرنے میں اور باطل کے نابود کرنے میں پوری کوشش کریں اور بسا اوقات یہ بات بغیر جھگڑے اور لڑائیوں کے ممکن نہیں ہوتی۔ پس یہ لڑائی جھگڑے تمام نیک کاموں میں افضل شمار ہوں گے۔"

(حجۃ اللہ البالغہ مترجم جلد اص ۱۰۰)

ایک خاتون کو اسلامی مملکت میں حکومت کی سربراہ بنانا بھی ایک بُری رسم ہے لیکن جو لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کے بقول "مصالح کلیہ سے بعید ہیں" وہ اس پر فخر کر رہے ہیں کہ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جس نے تاریخ میں ایک خاتون کو وزیر اعظم بنانے کا شرف حاصل کیا۔ اگر

ان حضرات کی نظریں دوررس ہوتیں تو ان کو صاف نظر آتا کہ یہ امر پاکستان کے لیے لائق فخر نہیں، بلکہ لائق شرم ہے کہ اس نے قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف اور امتِ اسلامیہ کے اجماعی فیصلے کے علی الرغم اسلامی تاریخ کی ایک مسلمہ روایت کو توڑنے کی جرأت کی ہے، پاکستان میں اس بدعت سیئہ کی اختراع اور 'منکر' اور بُری رسم کا اجرار ملت اسلامیہ کا سر شرم سے جھکا دینے کے لیے کافی ہے۔ اس بدعت کو جاری کرنیوالے گنہ گار ہیں۔ اس برائی کا ازالہ ملتِ اسلامیہ کا فرض ہے اور اس برائی کے خلاف جہاد حضرت شاہ صاحب کے بقول افضل ترین عبادت ہے۔

ونعوذ باللہ من الحور بعد الکور ومن امارۃ السفہاء
والنساء والغلمان وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا
محمد النبی الامی وآلہ وصحبہ واتباعہ وبارک وسلم.

ضمیمہ

شجرۃ الدر

مصر کی ایک خاتون جو شہزادے کو قتل کر کے برسرِ اقتدار آئی اور حدیث نبوی پڑھکر مستعفی ہوگئی

> بعض لوگوں نے شجرۃ الدر کی حکومت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی محمد عمران اشرف عثمانی کا ایک مضمون "البلاغ" میں شائع ہوا ہے جسے بطور ضمیمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

عورت کی سربراہی کے جواز سے متعلق حال ہی میں بعض حضرات کے چند بیانات شائع ہوئے تھے اور اس سلسلے میں ایک دلیل یہ بھی دی گئی تھی کہ شجرۃ الدر نام کی ایک عورت مصر کی حاکم بنی تھیں جو مسلمانوں کا مشہور ملک ہے اور کسی نے بھی اس پر تنقید نہیں کی۔ اور اس نے بحسن وخوبی مملکت کو چلانے کے فرائض انجام دیئے۔ ذیل میں ہم شجرۃ الدر کے حالات پیش کر رہے ہیں تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ آیا اس قسم کی حکمران عورت (یعنی شجرۃ الدر) کے منصب حکومت پر فائز ہونے سے کوئی شرعی استدلال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

شجرۃ الدر ابتداء میں ایک خوبصورت کنیز تھیں جن سے بعد میں مصر کے بنی ایوب خاندان کے آٹھویں بادشاہ ملک صالح (نجم الدین ایوب ابن الکامل محمد بن العادل الکبیر) نے نکاح کر لیا تھا۔ ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام خلیل رکھا گیا۔ اسی وجہ سے شجرۃ الدر کو ام خلیل کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد ملک صالح کا انتقال ہو گیا۔

شجرۃ الدر فطرۃً ذہین عورت واقع ہوئی تھی۔ بادشاہ کی موت کو اس نے عام لوگوں سے چھپایا اور امراء سلطنت کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ اپنا خلیفہ اپنے بیٹے توران شاہ کو نامزد کر گئے ہیں۔ اور توران شاہ جو ابھی سفر پر ہیں ان کو بلاتی ہوں آپ ان کی اطاعت کا حلف اٹھائیں۔ ادھر توران شاہ کو لانے کے لئے ایک غلام بھیجا۔ جب وہ منصورہ پہونچا تو شجرۃ الدر نے اپنے بعض بحری کارندوں کے ذریعہ توران شاہ کو قتل کرا دیا۔ اور قتل بھی اس بیدردی سے کرایا گیا کہ پہلی ضرب سے اس کی انگلیاں کاٹی گئیں، پھر اس پر جلتا ہوا تیل پھینک دیا گیا وہ شور مچاتا رہا کہ مجھے سلطنت اور مملکت نہیں چاہیئے۔ توران شاہ کے اس قتل کی سازش کا کسی کو علم نہ ہوا اور شجرۃ الدر پر اس سازش کا اس وجہ سے شبہ نہ ہوا کہ اس نے تو بظاہر اس کی سلطنت کے لئے کوششیں کی تھیں۔

توران شاہ کے قتل کا واقعہ محرم ۶۴۸ھ میں پیش آیا اور اس کے بعد ۲ صفر ۶۴۸ھ کو شجرۃ الدر بادشاہ بن گئی، یہ مملکت مصر میں، بنی ایوب کے خاندان کی نویں حکمران تھیں۔ شجرۃ الدر نے مملکت سنبھالنے کے بعد عزالدین ایبک کو سپہ سالار مقرر کیا۔

اس نے امراء اور عوام کو خوش کرنے کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے اور بڑی بڑی، زمینوں کی جاگیریں دیں اور ان پر دولت کی بارش کر دی [2] اس طرح لوگوں کے منہ بند کر دیئے گئے۔

جب خلیفہ وقت ابوجعفر مستنصر باللہ کو جو بغداد میں تھا یہ خبر پہونچی کہ اہل مصر نے سلطنت ایک عورت کو سونپی ہوئی ہے تو اس نے امراء مصر کے نام ایک پیغام بھیجا:

---

[1] فوات الوفیات لابن شاکر الکتبی ج ۱ ص ۲۶۴ [2] اعلام النساء ج ۲ ص ۲۸۸

اعلمونا ان کان ما بقی عندکم فی مصر من الرجال من یصلح للسلطنۃ فنحن نرسل لکم من یصلح لھا أما سمعتم فی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال : لَا أَفْلَحَ الْقَوْمُ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ اِمْرَءَةً ۔

یعنی :— اے اہل مصر ہمیں بتاؤ کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا مرد باقی نہیں رہا جو سلطنت کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہو؟ اگر ایسا ہے تو ہم ایک ایسا مرد بھیج دیتے ہیں جو سلطنت سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ کیا تم نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں سنی کہ حضور ؐ نے فرمایا ۔ لا أفلح القوم الخ یعنی وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات کسی عورت کو سپرد کر دئے ہوں ۔"

مؤرخین اس خط کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

وأنکر علیھم انکارا عظیما وھددھم وحضھم علی الرجوع عن تولیتھا لمصر ۔

" اور مستنصر باللہ نے ان پر شدید نکیر کی ۔ ان کو ڈرایا اور اس بات کی ترغیب دی کہ وہ مصر کی سربراہی عورت سے واپس لیں ۔"

جب اس پیغام کی خبر شجرۃ الدر کو پہونچی تو اس نے بخوشی اپنے آپ کو خود معزول کر دیا ۔ اور امراء اور قاضیوں کو حکم دیا کہ عزالدین ایبک جو پہلے سپہ سالار تھا ۔ اس کو میری جگہ بادشاہ بنایا جائے اور ساتھ ساتھ اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وہ عزالدین سے نکاح کرنا چاہتی ہے ۔ چنانچہ عزالدین کو حاکم بنایا گیا اور اس نے شجرۃ الدر سے نکاح بھی کر لیا ۔ شجرۃ الدر جس وقت معزول ہوئیں اس وقت ان کی حکومت قائم ہوئے ابھی تین ماہ بھی مکمل نہ ہوئے تھے ، گویا بنی ایوب خاندان کی اس خاتون حاکم کی کل حکومت تین ماہ سے بھی کم تھی ۔ اس کے بعد عزالدین ایبک مصر کے ترکی حکمرانوں میں پہلا

بنی ایوب خاندان کی اس خاتون حاکم کی کل حکومت تین ماہ سے بھی کم تھی۔

حکمران تھا جو اخیر ربیع الاول ۶۴۸ھ میں برسراقتدار آیا۔ اس کا لقب "ملک عزیز" ہے۔ لیکن اس کی حکمرانی بھی چند دنوں پر محیط رہی کیونکہ اس کو قتل کر دیا گیا اور اس کی قاتل اس کی بیوی شجرۃ الدر ہی تھی۔ کیونکہ اُسے کچھ اس طرح کی اطلاعات پہونچی تھیں کہ اس کا شوہر موصل کے والی ملک الرحیم (بدرالدین لؤلؤ) کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس شبہ کی وجہ سے اس نے اپنے شوہر کے قتل کی سازش نہایت خفیہ طور پر تیار کی بایں طور کہ پہلے اس نے اپنے خصوصی معتمد صفی الدین ابراھیم بن مرزوق کو بلایا اور اُسے وزارۃ عظمیٰ کی پیش کش کر کے اس کو قتل کرنے کے لئے کہا، لیکن اس نے بات نہ مانی اور قتل سے انکار کیا اور خود اس کو بھی اس کام سے روکا۔ لیکن شجرۃ الدر کو قتل کی سوجھ گئی تھی جس کی وجہ سے اُس نے پھر اپنے خاص خدام اور غلاموں کو بلا کر عزالدین کو قتل کرنے کا حکم دیا اور ان پر مال و زر کی بارش کرنے کا وعدہ کیا انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل کا وعدہ کر لیا۔ اور منصوبہ تیار ہو گیا۔ چنانچہ منگل کے روز ۲۳ ربیع الاول ۶۴۸ھ کو معز جب شام کو گیند کھیل کر واپس قلعہ آیا۔ اور بغرض غسل حمام میں داخل ہوا تو اس پر کچھ افراد کود پڑے اور اُسے اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔

قتل کے بعد شجرۃ الدر نے ابن مرزوق کو بلایا اور اُسے قتل کی اطلاع دی تو وہ سخت برہم ہوا اور اُس نے کہا کہ میں نے تو آپ کو پہلے ہی اس کام سے منع کیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تو شجرہ نے پریشان ہو کر اپنے دو معتمد امیر جمال الدین ابن ایدغدی بن عبداللہ عزیزی اور عزالدین ایبک حلبی کو بلوایا اور ان کو سلطنت کی پیش کش کی، انہوں نے بھی انکار کیا، اس طرح یہ ہفتہ پورا اسی پریشانی میں گذر گیا۔ اگلے پیر ۲۹ ربیع الاول ۶۴۸ھ کو اس نے اپنے آپ کو عزالدین کے وارثوں کے حوالے کر کے تاج و تخت بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اور شجرۃ الدر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح وہ دارالسلطنہ سے برج احمر میں قید ہو گئی۔ اس دوران مملکت کا حاکم منصور کو بنا دیا گیا۔ جو ملک معز الدین[1]

---

[1] : ان کو عزالدین اور معزالدین ایبک دونوں کہا گیا ہے۔

کا بیٹا تھا ۔

ادھر معزالدین ایبک کے اقربار اور عوام کی طرف سے یہ مطالبات ہوئے کہ شجرۃ الدر اور قاتلین معز کو قتل کر دیا جائے اور اُن سے قصاص لیا جائے ۔ لیکن چونکہ شجرۃ صالحی خاندان کی ایک فرد تھی اس وجہ سے صالحی خاندان (جو پہلے ملک مصر پر حاکم رہا) نے شجرۃ الدر کی حمایت کی اور اس کو قتل کرنے سے روکا اور ان مخالف امرا سے قسم لی کہ شجرہ سے کوئی تعرض نہ کریں گے ۔ لیکن یہ حمایت زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئی ۔

اور ہفتے کے روز ۱۱ ربیع الثانی کو شجرۃ الدر کو قلعہ کے باہر مقتول پایا گیا، قتل سے قبل شجرہ نے اپنے سب مال و متاع اور قیمتی جواہر کو اس خوف سے جلا دیا کہ ملک منصور بن معز اور اس کی ماں اس پر قابض نہ ہو جائے ۔ کیونکہ اسے ان دونوں سے نفرت تھی ۔

شجرۃ الدر کو اسی مقبرے میں دفن کیا گیا جو اس نے اپنے عہد حکومت میں اپنے لئے بنوایا تھا اور یہ مقبرہ مصر (قاہرہ) میں سیدہ نفیسہ (جو حضرت امام حسنؓ کی پوتی یا پڑپوتی ہیں) کے مقبرے کے قرب میں واقع ہے [1] ۔

اس واقعے سے واضح ہے کہ:

(۱) شجرۃ الدر سازش کے ذریعے مرحوم بادشاہ کے بیٹے کو قتل کر کے ناجائز طور پر برسر اقتدار آئی
(۲) خلیفۂ وقت نے عورت کی سربراہی پر شدید اعتراض کیا اور حدیث نبویؐ کے حوالے سے انہیں اس ناجائز اقدام سے باز آجانے کی تاکید کی ۔
(۳) خلیفۂ وقت کے دلائل اس قدر مضبوط تھے کہ خود شجرۃ الدر کو بھی استعفا دینا پڑا ۔
(۴) بالآخر اس نے اپنے سپہ سالار کو سلطنت سونپ کر بادشاہ کے بجائے بادشاہ کی بیوی بننے کو

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ۔ اعلام النساء ج ۲ صـ۲۸۶ و مرآۃ الجنان للیافعی ج [illegible] صـ۱۲۷ و فوات الوفیات لابن شاکر الکتبی ج ۱ صـ۲۶۴ ۔

ترجیح دی اور بعد میں اُسے بھی قتل کر دیا ، جس کے نتیجے میں خود بھی قتل ہوئی ۔

کیا واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد کوئی بھی ہوش مند شخص اس واقعہ سے قرآن و سنت کے صریح احکام کے خلاف عورت کو سربراہ بنانے کے جواز پر استدلال کر سکتا ہے ؟

صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین

اللھم اغفرلی ولوالدیّ ولمن سعیٰ فیہ ۔

عورت کی سربراہی

جناب کوثر نیازی کے جواب میں

چند اہم نکات کی فہرست

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ،

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

مکرم ومحترم جناب حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہ العالی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ناچیز نے آپ کا رسالہ عورت کی سربراہی پڑھا تھا جس سے اس موضوع سے متعلق خلجان دور ہوگیا تھا لیکن آج کے جنگ اخبار مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں مولانا کوثر نیازی صاحب نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر پھر کچھ پریشانی لاحق ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے جو مثالیں عورتوں کی سربراہی کی رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور شجرۃ الدر کی دی ہیں، وہ بے چاری عورتیں بہت ناکام اور مختصر عرصے کے لئے سربراہ رہیں۔ ان کی رقابتیں اور اخلاقی کمزوریاں، تاریخ دانوں کے لئے بہت اندوہ گیں ہیں۔ شیکسپیئر کا قول ان پر صادق آتا ہے: "FRAILTY! THY NAME IS WOMAN." "کمزوری! تیرا نام عورت ہے۔" تینوں بُری طرح قتل ہوئیں۔ مولانا کوثر نیازی کی زیادہ تر مثالیں اہل کفر کی ملکاؤں کی ہیں جن کی مسلمان معاشرہ پر تطبیق درست نہیں۔

اہل علم حضرات تو چاہے ان کا تعلق علم دین سے ہو، چاہے ان کا مطالعہ ومشاہدہ سیکڑوں ممالک کی ہزاروں سال کی تاریخ پر محیط ہو، مولانا کوثر نیازی کی مثالوں کو چند انگی چنی دور از کار مستثنیات کا درجہ دیں گے۔ لیکن ہمارے عام مسلمان موصوف کی شرح تفسیر وحدیث سے ضرور شبہات کا شکار ہوسکتے ہیں۔ اس لئے آنجناب کا عوام الناس پر بڑا احسان ہوگا اگر آپ مولانا کوثر نیازی صاحب کے فقہی ارشادات کی تصحیح فرمادیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزا۔

ڈاکٹر ظہیر الدین کراچی۔

ج۔ اس مضمون کا مختصر جواب، روزنامہ جنگ کراچی (۶ نومبر ۱۹۹۳ء) میں لکھ چکا ہوں، مفصل جواب حسب ذیل ہے:

اس مسئلہ کے اہم ترین پہلو یہ ناکارہ اپنے رسالہ "عورت کی سربراہی" میں لکھ چکا ہے۔

اس کا مطالعہ غور و تدبر کے ساتھ ایک بار پھر کر لیجئے۔ انشاء اللہ شکوک و شبہات کا بھوت کبھی قریب نہیں پھٹکے گا اور ہمیشہ کے لئے اس "آسیب" سے نجات مل جائے گی۔ تاہم آنجناب کے خط کے حوالے سے مولانا کوثر نیازی کے مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے چند امور کا بطور "اصول موضوعہ" ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

پہلا اصول: جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بُعد ہو رہا ہے اور قرب قیامت کا دور قریب آ رہا ہے اسی رفتار سے فتنوں کی بارش تیز سے تیز تر ہو رہی ہے، ان فتنوں کے طوفان بلاخیز میں سفینۂ نجات بس ایک ہی چیز ہے، اور وہ یہ کہ سلفِ صالحین کی تشریحات کے مطابق کتاب و سنت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا جائے اور اس بارے میں ایسی اولوالعزمی اور ایمان کی پختگی کا مظاہرہ کیا جائے کہ فتنوں کی ہزاروں آندھیاں بھی ہمارے ایمان و یقین کو متزلزل نہ کر سکیں، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ "علیکم بدین العجائز"۔

دوسرا اصول: تمام فقہائے امت جو کتاب و سنت کے فہم میں حجت اور سند کا درجہ رکھتے ہیں اس پر متفق ہیں کہ کسی خاتونِ خانہ کو سربراہِ مملکت بنانا حرام ہے، کیونکہ شرعاً وہ جس طرح نماز کی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتی، جس کو امامتِ صغریٰ (چھوٹی امامت) کہا جاتا ہے، اسی طرح وہ امامتِ کبریٰ یعنی ملک کی سربراہی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی، اگر کوئی مرد عورت کی اقتداء میں نماز ادا کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر عورت کو حاکم اعلیٰ بنا دیا جائے تو شرعاً اس کی حکومت لائق تسلیم نہیں ہوگی۔ اس سلسلہ میں اس ناکارہ نے اپنے رسالہ "عورت کی سربراہی" میں اکابر امت کے جو حوالے نقل کئے ہیں ان کو ایک بار پھر ملاحظہ فرما لیجئے۔

تیسرا اصول: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واجب الاذعان برحق ہے کہ "وہ قوم ہرگز فلاح کو نہیں پہنچے گی جس نے زمامِ حکومت عورت کے سپرد کر دی" اس حدیث شریف کو تمام فقہائے امت اور اکابر ملت نے قبول کیا ہے، امامت و قضا کے مسائل میں

اس سے استناد کیا ہے اور اسی پر اپنے اجماع و اتفاق کی بنیاد رکھی ہے اور اصول یہ ہے کہ جس حدیث کو تمام فقہائے امت نے قبول کر لیا ہو اور جس پر اجماع امت کی مہر ثبت ہو وہ حجت قاطعہ بن جاتی ہے اور ایسی حدیث کو "حدیث متواتر" کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔
امام ابوبکر جصاص رازی "احکام القرآن" (ص ۲۸۶ جلد اوّل) میں لکھتے ہیں:

"جس خبر واحد کو تمام لوگوں نے قبول کر لیا ہو وہ ہمارے نزدیک متواتر کے حکم میں ہے جس کی وجہ ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں"

پس ایسی حدیث جو سب کے نزدیک مسلّم الثبوت ہو اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی اور نہ امت کے مسلّم الثبوت مفہوم کو بدلنے کی۔

چوتھا اصول: دینی مسائل میں اجماع امت مستقل حجت شرعیہ ہے، خواہ "سند اجماع" (یعنی قرآن و حدیث سے اس اجماعی مسئلہ کا ثبوت) ہمیں معلوم نہ ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ پس اجماعی مسائل "سبیل المؤمنین" ہیں اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اپنانے کی کسی کے لئے گنجائش نہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

"اور جو شخص رسولؐ کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہو لیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنّم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے جانے کی"
(النساء: ۱۱۵)

پس جو شخص اجماع امت کے خلاف کوئی نظریہ پیش کرے اس کا نظریہ لائق التفات نہیں، ہر شخص کو ایسے نظریات سے پناہ مانگنی چاہیے جن کا نتیجہ دنیا میں اہل ایمان کے راستہ سے انحراف اور آخرت میں جہنّم ہو۔

پانچواں اصول: دلائل شرعیہ، جن سے شرعی مسائل کا ثبوت پیش کیا جاتا رہا ہے۔ (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اجماع امت اور (۴) ائمہ مجتہدین کا اجتہاد و استنباط۔ ان چار چیزوں کو چھوڑ کر کسی اور چیز سے شرعی مسائل پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

چھٹا اصول: اللہ تعالیٰ نے دین قیم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اور وعدۂ خداوندی کے مطابق یہ دین اصولاً و فروعاً ۔ الحمدللہ ۔ آج تک محفوظ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ مختلف ادوار میں ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگوں نے دین کے مسلّمہ مسائل میں نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی لیکن الحمدللہ ان کی کوششیں ناکام ہوئیں ورنہ آج تک یہ دین مسخ ہو چکا ہوتا، جس طرح پہلی قوموں نے اپنے دین کو مسخ کر لیا تھا، آج بھی جو لوگ دین کے مسلّمہ اجماعی مسائل کو بدلنا چاہتے ہیں، اطمینان رکھیئے کہ ان کی کوششیں بھی ناکامی سے ہمکنار ہوں گی اور اللہ کا دین انشاء اللہ جوں کا توں محفوظ رہے گا۔

ساتواں اصول: مومن کا کام یہ ہے کہ اگر وہ گناہ سے نہ بچ سکتا ہو تو وہ کم سے کم گناہ کو گناہ تو سمجھے، اور اگر کسی بُرائی کے خلاف جہاد نہ کر سکتا ہو تو دل سے بُرائی کو بُرائی ہی جانے۔ یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ کسی گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھنا اور کسی بُرائی کو بُرائی سمجھنے کے بجائے اس کو بھلائی ثابت کرنے کی کوشش کرنا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے اور یہ بڑی خطرناک حالت ہے۔

آٹھواں اصول، جو شخص کسی غلطی میں بتلا ہو اس کا منشا کبھی تو ناواقفی اور غلط فہمی ہوتی ہے اور کبھی اس کا منشا "جہل مرکب" ہوتا ہے کہ آدمی کسی بات کو ٹھیک سے نہ سمجھتا ہو مگر اس خوش فہمی میں بتلا ہو کہ وہ اس مسئلہ کو سمجھتا ہے، دوسرے نہیں سمجھتے۔ ان دونوں حالتوں میں چند وجہ سے فرق ہے:

اوّل یہ کہ ناواقف آدمی حقیقت کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے اور جو شخص جہل مرکب میں بتلا ہو وہ باطل کو حق سمجھ کر حق کی تلاش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

دوم یہ کہ ناواقف آدمی کو اگر صحیح مسئلہ بتا دیا جائے تو بصد شکریہ اس کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جہل مرکب کا مریض چونکہ اپنے قلب میں قبول حق کی استعداد و صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے وہ اپنی غلطی پر تنبہ پر اپنی اصلاح کرنے کی بجائے غلطی کی نشاندہی کرنے والوں پر خفا ہوتا ہے۔

سوم: جہل بسیط یعنی ناواقفی کا علاج ہے اور وہ ہے اہل علم سے رجوع کرنا اور ان سے صحیح مسئلہ معلوم کرلینا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

" سو پوچھ لو اہل علم سے، اگر تم کو علم نہیں ." (النحل: ۴۳)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

" جب ان کو علم نہیں تھا تو انہوں نے کسی سے پوچھا کیوں نہیں؟ کیونکہ مرض جہل کا علاج تو پوچھنا ہے ." (ابوداؤد ص ۴۹ ج ۱)

لیکن "جہل مرکب" ایک لاعلاج بیماری ہے، اس کا علاج نہ لقمان حکیم کے پاس ہے، نہ سقراط و بقراط کے پاس۔ دنیا بھر کے علماء و فضلاء، غوث قطب اور نبی و ولی اس کے علاج سے عاجز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناواقفی و لاعلمی کا منشا تو غفلت ہے، سوتے کو جگا دینا اور بے علم کو آگاہ کر دینا ممکن ہے۔ جب کہ "جہل مرکب" کا منشا کبر ہے۔ جو شخص "جہل مرکب" میں مبتلا ہو، اس کو "انا ولاغیری" کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، وہ اپنے کو عقل کل سمجھتا ہے اور اپنی رائے کے مقابلے میں دنیا بھر کے علماء و عقلاء کو ہیچ سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو کس دلیل اور کس منطق سے سمجھایا جائے اور کس تدبیر سے اسے حق کی طرف واپس لایا جائے؟

صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہو۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی کبر ہے؟ فرمایا: نہیں! یہ تو جمال ہے، اللہ تعالیٰ خود صاحب جمال ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں، کبر یہ ہے کہ آدمی حق بات کو قبول کرنے سے سرکشی کرے اور دوسروں کو نظر حقارت سے دیکھے." (مشکوٰۃ شریف ص ۴۳۳)

الغرض آدمی کا کسی شرعی مسئلہ میں ناواقفی کی بنا پر چوک جانا کوئی عار کی بات نہیں، بشرطیکہ یہ جذبہ دل میں موجود ہو کہ صحیح مسئلہ اس کے سامنے آئے تو اسے فوراً مان لے گا اور اس کے قبول کرنے سے عار نہیں کرے گا اور جو شخص حق کھل جانے کے باوجود اس کے قبول کرنے سے عار کرتا ہے وہ "جہل مرکب" میں مبتلا ہے اور اس کی بیماری لاعلاج ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو

اس سے پناہ میں رکھیں۔

ان اصول موضوعہ کے بعد گزارش ہے کہ مولانا کوثر نیازی کو مسئلہ کی صحیح نوعیت کے سمجھنے میں بہت سی غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور موصوف نے مذکورہ بالا اصول موضوعہ کی روشنی میں مسئلہ پر غور نہیں فرمایا اور نہ مسئلہ کے مالۂ وماعلیہ پر طائرانہ نظر ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اگر موصوف نے سلامتیٔ فکر کے ساتھ اس مسئلہ کی گہرائی میں اتر کر اس پر غور وفکر کیا ہوتا تو مجھے توقع تھی کہ ان کو غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

اس ناکارہ کا منصب نہیں کہ ان کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی گستاخی کرے اور ان کی بارگاہ عالی میں شنوائی ہو کیونکہ وہ آشیانِ اقتدار کے مکین، وزیر اعظم کے مشیر و ہم نشین اور صاحب سخنہائے دل نشین ہیں، اور ادھر یہ ناکارہ فقیر بے نوا، زاویۂ خمول کا گدا اور صاحب نالہ ہائے نارسا ہے:

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری؟

لیکن بزرگوں کا ارشاد ہے کہ:

گاہ باشد کہ کودک نادان
بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اس لئے اپنے فہم نارسا کے مطابق کچھ عرض کرتا ہوں کہ صاحب موصوف کی بارگاہ میں شرف قبول پائے تو زہے سعادت! ورنہ:

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس
دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

بہرحال مولانا موصوف کو مسئلہ کی صحیح نوعیت کے سمجھنے میں جو مغالطے ہوئے یہ ناکارہ ان کو ایک ایک کرکے ذکر کرتا ہے، اور نتائج کا فیصلہ خود ان کے فہم انصاف پر اور اگر وہ دادِ انصاف نہ دیں تو اللہ تعالیٰ کی عدالت پر چھوڑتا ہے۔

مولانا موصوف اپنے مضمون کی تمہید اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"۱۹۶۴ء میں صدر ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی انتخاب کا معرکہ برپا ہوا تو صدر ایوب کے حامی بہت سے علمائے کرام نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ عورت کا صدر مملکت بننا حرام ہے، اس لئے محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دینا جائز نہیں، اس پر میں نے جامع مسجد شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں خطبہ دیتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی جو بعد میں ہفت روزہ "شہاب" لاہور میں شائع ہونے کے علاوہ ایک کتابچہ کی صورت میں بھی چھاپ، دی گئی تھی۔ بعد میں پشتو اور سندھی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے اور یہ کتابچہ لاکھوں کی تعداد میں ملک بھر میں پھیل گیا۔ میں نے اپنے اس خطبہ میں قرآن و حدیث اور تاریخ کے حوالوں سے علمائے کرام کے مذکورہ بالا فتوے کی مدلل تردید کی تھی۔"

یہاں موصوف کو چند در چند غلط فہمیاں ہوئی ہیں :

پہلا مغالطہ : موصوف نے یہ سمجھا کہ علمائے کرام کا یہ فتویٰ کہ عورت کی سربراہی حرام ہے" ایوب خان کی حمایت میں جاری کیا گیا اور اس کا مقصد ایوب خاں کے اقتدار کی حمایت و پاسبانی ہے۔ ممکن ہے موصوف کو ایسے علماءِ سُو سے سابقہ پڑا ہو جن کا مقصد محض ایوب خان کے اقتدار کو سہارا دینا ہو، مگر میں حلفاً شہادت دے سکتا ہوں کہ اقتدار کی پاسبانی کے لئے فتوے جاری کرنا علمائے ربّانی کا شیوہ کبھی نہیں رہا۔ اقتدار خواہ ایوب خان کا ہو یا کسی اور کا، ان علمائے حقانی و علمائے ربانی کی نظر میں وقعت نہیں رکھتا، اس کی پاسبانی کا کیا سوال ؟ اور اس کے لئے فتوے جاری کرنے کے کیا معنیٰ ؟ محض حمایت اقتدار کے لئے وقتی مصلحت کے فتوے جاری کرنا نام نہاد علمائے سُو کا کردار تو ہو سکتا ہے علمائے ربانی کا دامن اس تہمت سے یکسر پاک ہے۔ الحمدللہ ! آج بھی ایسے خدا پرست علمائے حقانی موجود ہیں جن کے نزدیک پاکستان کی حکومت تو کیا ؟ امریکہ کی حکومت و سلطنت بھی مُردہ گدھے کی لاش کے برابر قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ اقتدار کے بارے میں علمائے حقانی کا ذوق وہ ہے جس کی ترجمانی حضرت پیران پیر (قدس سرہٗ)

نے فرمائی کہ:

مصرع ما ملک نیم روز را بیک جو نمی خریم "

اور جو خاقانیؒ نے فرمایا کہ:

پس از سی سال ایں معنیٰ محقق شد بہ خاقانی
کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

اس ناکارہ کو ذاتی طور پر ایسے علمائے حقانی کا علم ہے جو ایوب خان کے دشمن تھے اور اس کے لئے اوقاتِ قبولیت میں بد دعائیں کرتے تھے، کیونکہ اس نے دین کے صریح مسائل میں تحریفات کیں، اور "مسلمانوں کا عائلی قانون" کے نام سے ایسے قوانین ملک پر مسلط کئے جو کتاب و سنت کے خلاف ہیں، اور ان تحریفات کا وبال آج بھی اس کی قبر میں پہنچ رہا ہے۔ الغرض علمائے حقانی ایوب خاں کی تحریفات کی وجہ سے اس کے شدید ترین مخالف تھے، اس کے باوجود ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں ان کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ" اسلام میں عورت کی سربراہی حرام ہے اور ایسا کرنے والے گنہ گار ہیں۔" اگر اس وقت کی حزبِ اختلاف نے عقل سے کام لیا ہوتا اور مس فاطمہ جناح کی جگہ کسی مرد کو ایوب خان کے مقابلہ میں نامزد کیا ہوتا تو ان علمائے حقانی کی حمایت کا سارا وزن اس کے پلڑے میں ہوتا، الغرض علمائے حقانی پر ایوب خاں کی حمایت میں فتوے جاری کرنے کی تہمت بے جا ہے، اگر مولانا کوثر نیازی کو اس معاملہ میں معذور سمجھنا چاہیئے، اس لئے انہیں سابقہ ایسے ہی علمائے سے پڑا ہوگا، علاوہ ازیں ہر آدمی اپنی ذہنی سطح کے مطابق سوچتا ہے اور اپنے ذہنی تصورات و خیالات کے آئینہ میں دوسروں کے چہرے کا عکس دیکھنے کا عادی ہے۔ مجھے بیرونِ ملک سے ایک صاحب نے (ایک فرقہ کے خلاف مضمون کے بارے میں) لکھا کہ یہ سب کچھ ان امریکی ڈالروں کا نتیجہ ہے' جو سعودی تھیلوں میں آپ کو مل رہے ہیں، اس ناکارہ نے ان کو جواب دیا کہ آپ اپنی ذہنی سطح کے مطابق صحیح فرماتے ہیں، آج کے دور میں یہ بات کس کے ذہن میں آسکتی ہے کہ کوئی شخص متاعِ دنیا کی طمع کے بغیر محض رضائے الٰہی کے لئے بھی شرعی مسئلے لکھ سکتا ہے؟

دوسرامغالطہ: مولانا کوثرنیازی کو دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ وہ جس طرح قرآن وحدیث میں اجتہاد فرماکر عورت کی سربراہی کو جائز قرار دے رہے ہیں، علمائے کرام بھی شاید اپنے اجتہاد ہی کی بنا پر یہ فتویٰ جاری کر رہے ہوں گے، حالانکہ علمائے کرام اپنی رائے سے فتویٰ نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ ائمہ متبوعین کے فتویٰ کو نقل کر رہے تھے اور انہوں نے ائمہ مجتہدین کے مذاہب کا حوالہ دیا تھا، مولانا موصوف کو اگر اپنے مخالف کا حوالہ دینا تھا تو وہ علمائے کرام نہیں تھے بلکہ ائمہ اجتہاد — امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر ائمہ دین تھے، موصوف کا اپنے موقف کی مخالفت میں علمائے کرام کا حوالہ دینا یقیناً غلطی شمار ہوگی۔

تیسرامغالطہ: اوپر اصول موضوعہ میں بتاچکا ہوں کہ تمام ائمہ مجتہدین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عورت کی حکمرانی باطل اور حرام ہے اور اس کو حکمران بنانے والے گنہگار ہیں۔ مولانا کوثر نیازی جانتے ہیں کہ یہ ائمہ مجتہدین کون ہیں؟ امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسے جبال علم کی گردنیں جن کے آگے خم ہیں، قطب الارشاد والتکوین محبوب سبحانی شاہ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، قطب الاقطاب خواجہ معین الدین چشتی اور خواجۂ خواجگان بہاء الدین نقشبند، خواجہ علی ہجویری گنج بخش، بابا فریدالدین گنج شکر وغیرہ وغیرہ لاکھوں اولیاء اللہ (قدس اللہ اسرارہم) جن کے مقتدی ہیں، حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ جیسے اساطین امت اور حفاظ حدیث جن کے مقلد ہیں۔ ہاں! یہ وہی ائمہ مجتہدین ہیں کہ جن کے سامنے بعد کی صدیوں کے بڑے بڑے ائمہ دین، محدثین، مفسرین اور مجددین (امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے الفاظ میں) "در رنگ طفلاں" نظر آتے ہیں۔ آج مولانا کوثر نیازی خطبۂ جمعہ میں ان ائمہ دین مجتہدین کی "مدلل تردید" کرنے چلے ہیں اور وہ بھی قرآن وحدیث کے حوالے سے۔

ع   بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

دراصل مولانا کوثر نیازی کو اپنے مرتبہ و مقام کے بارے میں غلط فہمی ہوئی، انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ آج ان سے بڑا مجتہد اعظم کون ہوگا؟ اسی غلط فہمی نے ان سے یہ گستاخانہ الفاظ کہلائے کہ انہوں نے "مذکورہ بالا فتوے کی مدلل تردید کی" اگر اللہ تعالیٰ نے موصوف کو "نظر مردم شناس" سے نوازا ہوتا، اگر انہیں ان اکابر امت اور حافظان دین و شریعت کے مرتبہ سے آگاہی نصیب ہوتی اور اگر ان اکابر ائمہ کے مقابلہ میں موصوف کو اپنے علم و فہم کا حدود اربعہ معلوم ہوتا تو انہیں ان اکابر کے سامنے اپنا قد و قامت ہیچ سے ہیچ تر اور مور ناتواں سے بھی فروتر نظر آتا۔

بھرم کھل جائے تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

بزرگوں کی نصیحت ہے کہ "آدمی کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں" اور دنیا کا سب سے بڑا عقلمند وہ شخص ہے جو انسانوں کے درجات کی مرتبہ شناسی سے محروم نہ ہو۔ اس ناکارہ کو مولانا کوثر نیازی کے مقام و مرتبہ کی بلندی سے انکار نہیں، وہ مجھ ایسے نالائق گنہ گاروں سے ہزار درجہ اچھے ہوں گے، گفتگو اس میں ہے کہ ائمہ دین کے مقابلہ میں مولانا کوثر نیازی کون ہوتے ہیں جو ان اکابر کے منہ کو آئیں اور "بقول خود" ان اکابر کے فتوے کی مدلل تردید کرنے بیٹھ جائیں؟ کیا مولانا کو اس وقت کسی نے یہ مشورہ نہیں دیا کہ "ایاز! قدر خویش بشناس!"

چوتھا مغالطہ:- "عورت کی سربراہی باطل اور حرام ہے" اگر یہ مسئلہ ائمہ مجتہدینؒ کے درمیان مختلف فیہ ہوتا، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہوتا کہ عورت کی سربراہی جائز نہیں اور امام شافعیؒ کا ارشاد یہ ہوتا کہ جائز ہے اور مولانا کوثر نیازی نے اپنے امام کے قول کو چھوڑ کر دوسرے امام کا قول لے لیا ہوتا تو اگرچہ اصولی طور پر یہ بھی غلط ہوتا، (اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) تاہم ایسی صورت میں ہم مسامحت سے کام لیتے، اور یوں سمجھ لیتے کہ امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی طرح ہمارے

مولانا کوثر نیازی بھی مجتہد مطلق کے منصب پر فائز ہیں، جس طرح ان دونوں بزرگوں کو اپنے استاذ محترم کا قول چھوڑ کر دوسروں کے اقوال پر فتویٰ دینے کا حق ہے، ہمارے مجتہد مطلق امام کوثر نیازی کو بھی حق حاصل ہونا چاہیئے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ائمہ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ ہی نہیں بلکہ۔ جیسا کہ اصول موضوعہ میں عرض کر چکا ہوں —— یہ مسئلہ تمام ائمہ مجتہدینؒ کے درمیان متفق علیہ ہے کہ عورت کی سربراہی باطل اور حرام ہے، اور صدر اول سے آج تک کے اکابر علمائے امت کا اس پر اجماع مسلسل چلا آرہا ہے، ایسے مسئلہ میں اختلاف کرنے والا تو سبیل المؤمنین سے منحرف ہے۔ کیا مولانا کوثر نیازی کی اس نکتہ پر نظر نہیں گئی کہ وہ اس مسئلہ کی "مدلل تردید" کر کے درحقیقت "اجماع امت" کی آہنی دیوار سے ٹکرا رہے ہیں؟ کسی دینی مسئلہ پر غور کرنے والے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ میں سلف صالحین کی رائے معلوم کرے، اور یہ دیکھے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے یا اجماعی؟ اگر اجماعی ہے تو ہمیں اس کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، اور ہمیں اس پر رائے زنی اور قیاس آرائی کی اجازت نہیں۔ کسی اجماعی مسئلہ کو غلط قرار دینا اور بزعم خود اس کی "مدلل تردید" کے لئے کھڑے ہو جانا گویا پوری امت اسلامیہ کی تکذیب ہے، اور جو شخص امت اسلامیہ پر بداعتمادی کرتے ہوئے اسلام کے متواتر اجماعی مسائل کو بھی غلط سمجھتا ہو اس کے نزدیک گویا پورے کا پورا دین اسلام مشکوک ہے، اسے نہ قرآن کریم پر صحیح ایمان نصیب ہو سکتا ہے نہ نماز، روزہ وغیرہ ارکان اسلام پر۔ اس لئے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امت اسلامیہ۔ نعوذ باللہ۔ ایک غلط اور باطل مسئلہ پر متفق ہو سکتی ہے تو دین کے باقی مسائل پر یقین و ایمان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

پانچواں مغالطہ:۔ ایک اجماعی مسئلہ کی مدلل تردید کرتے ہوئے غالباً مولانا کوثر نیازی کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ قرآن و حدیث، جو چودہ صدیوں سے کہیں خلا میں گھوم رہے تھے، پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ لگے ہیں، چودہ صدیوں کے ائمہ دین، مجددین اور اکابر امت کو شاید ان کی کبھی زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی، غور و تدبر کے ساتھ ان کے مطالعہ کا موقع

انہیں کہاں سے نصیب ہوتا ؟ یا موصوف کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ پہلے کے علماء و صلحاء کے سامنے قرآن و حدیث تو موجود تھے، مگر وہ سب کے سب ان کے فہم و ادراک سے قاصر رہے، پہلی مرتبہ مولانا موصوف کو قرآن و حدیث کے صحیح فہم کی توفیق ہوئی، اس لئے انہوں نے قرآن و حدیث کے حوالے سے علمائے کرام کی مدلل تردید کر ڈالی۔ کیا یہ بوالعجبی نہیں کہ مجھ ایسا ایک شخص جس کا علم و فہم، جس کی دیانت و تقویٰ اور جس کی صورت و سیرت تک غیر معیاری ہے وہ قرآن و حدیث کے حوالے سے تمام اکابر امت کی تجہیل و تحمیق کرنے لگے؟ نعوذ باللہ۔

چھٹا مغالطہ: اوپر اصول موضوعہ میں بتا چکا ہوں کہ دلائل شرع چار ہیں۔ کتاب اللہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماعِ امت اور ائمہ مجتہدینؒ کا قیاس و استنباط۔ لیکن مولانا کوثر نیازی نے اجماعِ امت اور ائمہ مجتہدینؒ کے اقوال کی طرف تو التفات نہیں فرمایا، البتہ ان کی جگہ ایک نئی دلیل شرعی کا اضافہ فرماتے ہیں اور وہ ہے تاریخ — یہ بات زندگی میں پہلی مرتبہ مولانا نیازی کی تحریر سے معلوم ہوئی کہ کوئی شخص مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تاریخ کو بھی شرعی دلائل کی صف میں جگہ دینے کا حوصلہ کر سکتا ہے، اور اس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ شرعی مسئلہ ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ امت کے مسلّمہ شرعی مسائل کی تردید بھی کی جا سکتی ہے۔

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

ساتواں مغالطہ: تیس سال پہلے جو مولانا موصوف نے علمائے کرام کے فتوے کی تردید فرمائی تھی، موصوف کو غلط فہمی ہے کہ یہ ان کا بڑا لائق شکر کارنامہ تھا، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

"اور خدا کا شکر ہے کہ آج تیس سال گزر جانے کے باوجود میرے اس نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔"

شکر نعمت پر کیا جاتا ہے۔ گویا تیس سال پہلے جو موقف مولانا نے اس مسئلہ میں اختیار کیا تھا اس کو نعمت خداوندی سمجھ کر اس پر شکر بجا لا رہے ہیں، یوں تو یہ عجائب خانۂ دنیا رنگا رنگ نظریات کا طلسم خانہ ہے، لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنے نظریات پر نازاں ہے، یہودی، عیسائی، مجوسی، ہندو، سکھ، مرزائی، بہائی، ذکری، مہدوی،

پرویزی، چکڑالوی وغیرہ وغیرہ کون ایسا ہوگا جس کو اپنے نظریات پر ایقان و اذعان نہ ہو؟ ان پر شاداں و فرحاں نہ ہو؟ اور اس پر کلمۂ شکر نہ بجالاتا ہو؟ "کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ": اور اس سے بڑھ کر عجیب تر بات یہ ہے کہ جتنے فرقے اور گروہ اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتے ہیں وہ قرآن و حدیث کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور قرآن و حدیث سے اپنے نظریات کی سند لاتے ہیں۔ ان اختلافات کا عملی فیصلہ تو قیامت ہی کے دن ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ تو اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ یہ ناکارہ اوپر اصولِ موضوعہ میں اس کی طرف اشارہ کرچکا ہے، یعنی قرآن و حدیث کا مطالعہ اکابر سلف صالحین کی تشریحات کی روشنی میں کیا جائے، ان اکابر پر اعتماد کیا جائے، ان کا دامن مضبوطی سے تھاما جائے اور اپنی اہوا و خواہشات کے بجائے سلف صالحین کی اقتدا و اتباع کو ترجیح دی جائے، یہ ہے وہ سفینۂ نجات! جس میں پناہ لینا نظریات و فتن کے طوفانِ نوح سے بچا سکتا ہے۔ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ۔ جناب مولانا کوثر نیازی اگر اس نکتہ کی طرف توجہ فرماتے تو انہیں صاف نظر آتا کہ یہ "نظریہ" جو انہوں نے سلف صالحین کے مقابلے میں اختراع فرمایا ہے، کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس پر شکر کیا جائے بلکہ ایسی بدعت ہے جس پر سو مرتبہ استغفار کرنا چاہیئے۔

پھر تیس سال پہلے ان کے علم و تحقیق، عقل و دانش اور بالغ نظری و دقیقہ رسی میں وہ پختگی پیدا نہیں ہوئی ہوگی جو تیس سال بعد پیدا ہوئی۔ غالباً اس طویل عرصہ میں نہ تو مولانا موصوف کو خود تنبہ ہوا، اور نہ کسی صاحب علم نے ان کو اس غلطی سے آگاہ کیا، اس لئے عقل و دانش کی پختگی اور علم و تحقیق کی تیس سالہ ترقی کے باوجود انہیں اپنی غلطی کی اصلاح کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ وہ آج تک اس پر مصر ہیں اور غلطی پر مسلسل تیس سال اصرار بھی لائق شکر نہیں بلکہ موجب استغفار ہے۔

ایک جویائے علم و تحقیق کو اگر اس کی غلطی پر متنبہ کردیا جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیئے کہ مرنے سے پہلے غلطی کی اصلاح ہوگئی اور محاسبۂ آخرت سے بچ گئے، میں نے اپنے اکابر

سے امام العصر حافظ الدنیا، امیر المومنین فی الحدیث مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا ارشاد سنا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی صاحب! تیس تیس سال غلطی میں رہنے کے بعد اپنی غلطی پر تنبہ ہوا۔"

ایک دن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ فرما رہے تھے کہ "بھئی! مولانا بنوریؒ بڑے آدمی تھے، ایک بار انہوں نے "بینات" میں کچھ لکھا تھا، میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ یہ تحریر آپ کے شایان شان نہیں، فوراً کہنے لگے، معاف کر دیجئے، آئندہ ایسا نہیں ہوگا، بھئی! مولانا بنوریؒ بڑے آدمی تھے۔"

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو ترجیح الراجح کے نام سے مستقل سلسلہ ہی شروع کر رکھا تھا کہ جو صاحب علم حضرتؒ کی کسی لغزش پر متنبہ کرے، حضرت اسے اس سلسلہ میں شائع فرماتے تھے، اگر حضرتؒ کو اطمینان ہو جاتا کہ واقعی مسئلہ کے لکھنے میں غلطی ہوئی ہے تو اس کا صاف اعلان فرما دیتے، ورنہ ان صاحب علم کی تحقیق نقل کر کے لکھ دیتے کہ میری تحقیق یہ ہے، اہل علم دونوں پر غور فرما کر جو راجح نظر آئے اس کو اختیار فرمائیں۔

یہ ناکارہ سراپا جہل ہے، اخبار میں جو "آپ کے مسائل اور ان کا حل" کا سلسلہ جاری ہے (اور اب کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے) اس کے بارے میں اہل علم کی خدمت میں التماس کر چکا ہوں کہ کوئی صاحب علم کسی مسئلہ کی غلطی پر متنبہ فرمائیں تو ممنون ہوں گا، چنانچہ بعض حضرات نے غلطی کی نشاندہی کی تو اس کو اخبار میں شائع کر دیا، اور صاف لکھ دیا کہ مجھ سے مسئلہ کے لکھنے میں غلطی ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی صاحب علم غلطی کی نشاندہی فرماتے ہیں تو ایسی خوشی ہوتی ہے کہ گویا بے بہا خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ الغرض! مرنے سے پہلے غلطی کی اصلاح ہو جائے تو لائق شکر ہے۔

آٹھواں مغالطہ: اسی تمہید میں مولانا کوثر نیازی، مولانا مودودی مرحوم سے اپنے اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انہی دنوں میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مرحوم نے جیل خانے سے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے لئے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید میں جو قرارداد لکھ کر بھیجی مجھے اس سے اختلاف تھا اور صدارتی مہم ختم ہونے کے بعد میں نے حضرت

مولانا سے کئی اور دینی اختلافات کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر بھی اختلاف کا اظہار کیا۔ مولانا نے قرارداد میں یہ لکھا تھا کہ ایک حرام ابدی یعنی ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے اور ایک غیر ابدی یعنی ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے یہ ایک خطرناک نظریہ تھا جس کی رو سے تمام حرام چیزوں کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا تھا اور اس طرح شریعت ایک مذاق بن کر رہ جاتی۔ اصل میں مولانا کو یہ تاویل کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اس سے پہلے وہ عورت کی اسمبلی کی رکنیت بلکہ اس کو ووٹ کا حق دینے کو بھی حرام قرار دے چکے تھے (ملاحظہ ہو، ماہنامہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۱ء) اور اب انہیں ایک لخت ایک خاتون کے صدر مملکت ہونے کی تائید کرنی پڑ رہی تھی، میرا کہنا یہ تھا کہ حضرت مولانا اس کے لئے سیاسی اور جمہوری ضرورت کے حوالے سے بات کر سکتے تھے، اس کے لئے انہیں ایک نظریہ ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

یہ مولانا کوثر نیازی کی حق پژوہی تھی کہ انہیں مولانا مودودی مرحوم کا نظریہ غلط نظر آیا تو انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس سے برملا اختلاف کیا بلکہ جماعت اسلامی سے بھی علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن یہاں بھی مولانا کوثر نیازی غلط فہمی سے محفوظ نہ رہے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ مولانا مودودی عورت کی سربراہی کو حرام سمجھتے تھے، لیکن مس فاطمہ جناح کی صدارت کے معاملہ میں ان پر ایسی اضطراری کیفیت طاری ہوئی کہ اس خاص موقع کے لئے انہوں نے اس حرام کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا، اور اس کے لئے انہوں نے "حرام ابدی" اور "حرام وقتی" کا نظریہ اختراع کیا، جس کے بارے میں مولانا کوثر نیازی فرماتے ہیں (اور بجا فرماتے ہیں) کہ:

"ظاہر ہے یہ ایک خطرناک نظریہ تھا جس کی رُو سے تمام حرام چیزوں کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا تھا، اور اس طرح شریعت ایک مذاق بن کر رہ جاتی۔"

لیکن مولانا کوثر نیازی نے اس نظریہ کا تریاق یہ مہیا کیا کہ مولانا مودودی نے جس چیز کو

"حرام وقتی" کے خانے میں جگہ دی تھی، مولانا کوثر نیازی نے اس کو "حلال ابدی" قرار دے دیا۔ مولانا موصوف کو غور کرنا چاہیئے تھا کہ محض اپنی خواہش سے کسی چیز کو "حرام وقتی" قرار دینے سے اگر شریعت ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے "تو کیا محض اپنی رائے سے اسی چیز کو "حلال ابدی" قرار دینے سے شریعت اس سے بڑھ کر مذاق بن کر نہیں رہ جاتی؟ بار بار غور کیجیئے کہ جو چیز تمام ائمہ دین اور تمام اکابر امت کے نزدیک حرام اور باطل ہے اس کو "حرام وقتی" قرار دینا شریعت کے ساتھ مذاق ہے تو اس کو حلال ابدی قرار دے ڈالنا شریعت کے ساتھ کتنا بڑا مذاق ہوگا! اور اگر اس کی اجازت دے دی جائے کہ تمام امت کی مسلّمہ حرام چیزوں کو کوئی شخص اپنے علم و فہم کے زور سے حلال کر سکتا ہے تو کیا خدا کا دین ہمارے ہاتھوں میں کھلونا بن کر نہیں رہ جائے گا۔

اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُوْلِی الْاَلْبَاب

نواں مغالطہ : تمہیدی نکات کے آخر میں کوثر صاحب لکھتے ہیں :

"اب چند روز پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کے درمیان وزارت عظمیٰ کے لئے انتخاب ہوا تو عین انتخاب کے دن میرے کسی مہربان اخبار نویس نے مولانا مودودی کے نام میرے اس خط کا ایک ٹکڑا نکال کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ میں بھی عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر عام علماء کا ہم نوا ہوں، اس وسوسہ انگیزی اور مغالطہ طرازی کی وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اپنے تیس سالہ پرانے کتابچہ "کیا عورت صدر مملکت بن سکتی ہے؟" کا خلاصہ قارئین کے سامنے پیش کردوں، تاکہ اس سلسلہ میں کوئی ابہام نہ رہے۔"

جناب کوثر صاحب نے اس اقتباس میں مولانا مودودی کے نام اپنے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ کافی طویل خط ہے، یہ خط ۱۲؍ فروری ۱۹۶۵ء کو لکھا گیا۔ اولاً ان کے ہفت روزہ "شہاب" لاہور (شمارہ ۸، جلد ۱۱، ۲۸؍ فروری ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا تھا، بعد ازاں موصوف کی کتاب "جماعت اسلامی، عوامی عدالت میں" میں شامل کیا گیا۔ کوثر صاحب کا صحیح موقف سمجھنے کے لئے اس کے ضروری اقتباس متذکرہ بالا کتاب کے حوالے سے ذیل

میں نقل کرتا ہوں :

"محترم مولانا! س وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی' اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جو سزا ملے گی' اس کا مسئلہ تو الگ ہے' اس دنیا میں بھی اندرون و بیرون ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورتوں کا اظہار کر کے ایسا کیا جاسکتا تھا مگر اس کے لئے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے' اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے دوسرے غیر جانبدار عناصر حتیٰ کہ اپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم و تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔" (ص ۲۲)

"میں آپ کے سامنے انتہائی ندامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بنا پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں صدر مملکت نہیں بنائی جاسکتی اور اس کا تو میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایسی تحریک چلا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کے جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوادیا مگر اسی دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطہ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔"

"مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزب اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے۔ آپ کی گزشتہ تحریروں کی روشنی میں امید بھی اس بات کی تھی۔ لیکن جب مجلس مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی (جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس

مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کردیا گیا) تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہنچی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو' میں یہاں بھی وضاحت کردوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور کیا گیا' میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع ؟) کی وجہ سے شریک نہ ہوسکا۔ جب میں پہنچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جاچکی تھی۔ کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کرکے کم سے کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرادیتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد "تیر از کمان رفت" والا معاملہ تھا۔ اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بنا پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لئے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہوچکی ہے' جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں تقریر و تحریر کے ذریعے اس کی تائید و توثیق کرنے لگا۔"

"مولانا! میں بہت گناہ گار آدمی ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ یک طرف' اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا' صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہوگیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں! اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے۔ ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی پاداش میں رہے سہے ایمان سے محروم نہ ہوجائے۔ "نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیٔات اعمالنا" (ص ۲۶ تا ۲۸)

جناب کوثر صاحب کی یہ تحریر اپنے مفہوم اور اظہار مدعا میں بالکل واضح ہے' کسی تشریح یا حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں بلکہ اسے صاف گوئی اور دل کو چیر کر کسی کے سامنے رکھ دینے کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے' تاہم اس ضمن میں صاحب موصوف کے لئے چند امور لائق توجہ ہیں :

اول : اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں آپ نے تین رنگ بدلے ہیں :

① جب تک جماعت اسلامی نے (جس کے آپ ضلعی صدر تھے) مس فاطمہ جناح کی

حمایت کا فیصلہ نہیں کیا تھا تب تک اپنے علم اور مطالعہ کی بنا پر آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ شرعاً عورت کی حکمرانی جائز نہیں' چنانچہ آپ نے اپنی مسجد میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے سیکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کو مبرہن کیا' اور بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر آپ نے اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا (جسے بعد میں شتابی سے واپس لے لیا گیا' اور اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی)۔ یہ وہ دور تھا جب آپ کا دل اور زبان و قلم ہم آہنگ تھے' جو عقیدہ آپ کے دل میں تھا وہی زبان و قلم سے نکل رہا تھا۔

2 پھر جب ۶۴ء کے صدارتی انتخاب کا معرکہ برپا ہوا۔ پوری قوم "انتخابی بخار" میں مبتلا ہو گئی' اور آپ کی جماعت اسلامی نے اسی "انتخابی بخار" کی بحرانی کیفیت میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کر لیا' تو یہ فیصلہ اگرچہ آپ کے عقیدہ و ضمیر کے خلاف تھا' مگر جماعتی قواعد و ضوابط کی بنا پر آپ اس غلط فیصلہ کی حمایت پر مجبور ہو گئے' یہاں سے آپ کے دل اور زبان و قلم کا راستہ الگ الگ ہو گیا' آپ کا عقیدہ تو یہ تھا کہ عورت کی سربراہی شرعاً جائز نہیں' لیکن "جماعتی فیصلہ کی مجبوری" کی وجہ سے آپ کی زبان و قلم اپنے عقیدہ و ضمیر کے خلاف قرآن و حدیث کے دلائل کا انبار لگانے لگے کہ عورت کی سربراہی شرعاً جائز ہے۔ یہی دور ہے جب بقول آپ کے "آپ نے شاہ عالم مارکیٹ کی مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی' اور قرآن و حدیث اور تاریخ کے حوالوں سے علمائے کرام کے مذکورہ بالا فتویٰ کی (کہ عورت کی سربراہی شرعاً حرام ہے) مدلل تردید فرمائی۔ پھر اس خطبہ کو کتابچہ کی شکل میں چھاپ کر پشتو اور سندھی تراجم کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں پھیلایا۔"

3 پھر جب الیکشن کا بخار اترا' مس فاطمہ جناح الیکشن ہار گئیں تو ہارے ہوئے جواری کی طرح آپ نے یہ دیکھا کہ اس جوئے میں ہم نے کیا کھویا' کیا پایا؟ تب آپ کو احساس ہوا کہ الیکشن کے دوران آپ کی زبان و قلم سے جو کچھ نکلا وہ علم و تحقیق پر مبنی نہیں تھا' خدا

و رسولؐ کے منشا کے مطابق نہیں تھا' اپنے ایمان و عقیدہ کے موافق نہیں تھا' بلکہ یہ سب کچھ "انتخابی بخار" کا ہذیان تھا' اس پر آپ کو ندامت ہوئی' اور یہ احساس ندامت اس قدر شدید تھا کہ اس سے آپ کو سلب ایمان کا اندیشہ لاحق ہونے لگا' چنانچہ اسی احساس ندامت نے آپ سے مودودی صاحب کے نام وہ خط لکھوایا جس کا اقتباس ابھی نقل کر چکا ہوں۔ الغرض آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں "توبہ نصوح" کی' اور اپنے اس موقف سے توبہ و برات کا اظہار کر کے پہلے موقف کی طرف رجوع کر لیا۔

یہ آپ کے تین رنگ بدلنے کی وہ تصویری داستان ہے جو خود آپ کے موئے قلم نے مرتب کی ہے۔ آپ کی یہ "سہ رنگی تصویر" دیکھنے کے بعد ہر شخص کو سر کی آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ علم و تحقیق اور مطالعہ کی روشنی میں آپ کا ہمیشہ ایک ہی نظریہ اور ایک ہی عقیدہ رہا ہے کہ شرعاً عورت کی سربراہی جائز نہیں۔ الیکشن ۶۴ء کے دوران آپ نے جو موقف اختیار کیا تھا وہ محض زبانی جمع خرچ تھا' جس سے آپ توبہ کا اعلان کر چکے ہیں' قلبی عقیدہ آپ کا اس وقت بھی یہی تھا کہ شرعاً عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عقیدے اور نظریے کی حد تک آپ ایک دن بھی اس کے قائل نہیں رہے کہ عورت کی سربراہی شرعاً جائز ہے۔

لیکن ان تین رنگوں کے بعد جب آپ کا چوتھا رنگ سامنے آتا ہے تو عقل و دانش حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟ چنانچہ اب آپ اپنے تازہ بیان (جنگ ۲۵ر اکتوبر ۹۳ء) میں فرماتے ہیں کہ فاطمہ جناح کی حمایت میں جو خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا :

> "میں نے اپنے اس خطبہ میں قرآن و حدیث اور تاریخ کے حوالوں سے علمائے کرام کے مذکورہ بالا فتوے کی (کہ عورت کی سربراہی شرعاً ناجائز ہے) مدلل تردید کی تھی.... اور خدا کا شکر ہے کہ آج تیس سال گزر جانے کے باوجود میرے اس نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"

کیا کوئی آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ اگر آپ کے نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تو ۱۲ر فروری ۶۵ء کے خط (بنام مودودی صاحب) میں آپ نے توبہ و استغفار کس چیز پر کیا تھا؟ اور اندیشہ سلب ایمان کا اظہار آپ نے کس چیز پر فرمایا تھا؟ اپنا یہ خط ایک بار پھر پڑھ لیجئے اور پھر انصاف کیجئے کہ آپ کے اس قول میں کہ "تیس سال تک آپ کے نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی" صداقت کا عنصر کتنا ہے؟

آنجناب کی خدمت میں حافظ شیرازیؒ کا یہ مصرعہ دہراتا تو سوئے ادب ہو گا کہ:

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

لیکن حافظؒ ہی کا یہ لطیف شعر تو پیش کرنے کی اجازت دیجئے:

حالے درون پردہ بسے فتنہ می رود
تا آن زماں کہ پردہ بر افتد چہا کنند

دوم: مودودی صاحب کے نام خط میں اپنے الیکشن والے موقف سے توبہ و انابت اختیار کرتے ہوئے جب آپ نے لکھا تھا:

"اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے کہ کہیں اس جرم کی پاداش میں رہے سہے ایمان سے محروم نہ ہو جائے۔"

تو اس فقرہ کو پڑھ کر ذہن میں آپ کی عظمت کا ایسا بلند و بالا مینار تعمیر ہوا جو اپنی بلندی سے آسمان کو چھونے لگا، ذہن نے کہا کہ یہ اتنا بلند و بالا انسان ہے کہ الیکشن کے دوران مسئلہ کی غلط تعبیر کے سلسلہ میں اس کی زبان و قلم سے جو کچھ نکلا اس سے اس نے برملا توبہ کا اعلان کر دیا، اور اپنے ان تمام بیانات و مقالات کو ہفوات و ہذیانات قرار دیتے ہوئے ان سے رجوع کر لیا، اخلاقی جرات اور بلندی کردار کی ایسی مثالیں ہمارے دور میں بہت ہی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ لیکن ۲۵ر اکتوبر ۹۳ء والے آپ کے اخباری بیان کو پڑھ کر عظمت کا وہ تصوراتی مینار دھڑام سے زمین بوس ہو گیا، ذہن نے کہا کہ ۱۲ر فروری ۶۵ء کو یہ شخص اپنے جس موقف کو غلط اور موجب سلب ایمان کہہ رہا تھا، اور جس سے

خدا کے حضور ناک رگڑتے ہوئے توبہ و ندامت کا اظہار کرتا نظر آ رہا تھا آج اسی خطبہ کو اور اسی رسالے کو فخریہ انداز میں پیش کر رہا ہے' کل جو چیز موجب سلب ایمان تھی' آج وہی لائق فخر ہے' کل جس سے توبہ و معذرت کر رہا تھا آج اسی پر اترا رہا ہے' کل جس چیز پر عرق ندامت میں غرق ہوا جاتا تھا آج اسی کو طرۂ فضیلت قرار دے رہا ہے۔

جناب کوثر صاحب غور فرمائیں کہ آپ نے ۱۲ر فروری ۶۵ء کے خط بنام مودودی میں اظہار توبہ و ندامت کر کے الیکشن کے دور کی اپنی تمام تحریروں کو' جو زیر بحث موضوع سے متعلق تھیں' منسوخ کر دیا تھا یا نہیں؟ اگر کر دیا تھا تو آج ان کے حوالے سے یہ کہنے کے کیا معنی کہ تیس سال سے میرا عقیدہ نہیں بدلا؟ اور اگر ان کو منسوخ نہیں کیا تھا تو ان سے توبہ و استغفار کے کیا معنی تھے؟ کیا یہ توبہ و استغفار بھی محض نمائشی تھی؟ حافظ شیرازی کے بقول:

؎ گوئیا باور نمی دارند روز داوری
کایں ہمہ قلب و دغل درکار داور می کنند

سوم : جس گناہ سے آپ نے ۱۲ فروری ۶۵ء کو توبہ کی تھی آج ۲۵ر اکتوبر ۹۳ء کو ۲۹ سال بعد الٹی زقند لگا کر آپ دوبارہ اسی نظریہ پر پہنچ جاتے ہیں' آپ کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیا اس رجعت قہقریٰ کا سبب یہ تو نہیں کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت میں آپ نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کی وجہ سے آپ کو "نولہ ما تولی" کی سزا میں مبتلا کر دیا گیا ہو؟ کیونکہ آپ علم و تحقیق کی بنا پر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ شرعاً عورت حکمران نہیں بن سکتی' اور آپ نے سیکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل بھی اس عقیدہ پر قائم کر دیئے تھے' اس کے باوجود آپ نے کھل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی' اور سبیل المومنین کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اپنا لیا' پس کیا قرآن کریم کی یہ پیشگوئی تو آپ پر پوری صادق نہیں آتی؟ :

"ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الہدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا۔" (النساء:۱۱۵)

ترجمہ۔ "اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑ کر دوسرے رستہ پر ہولیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کیا کرتا ہے کرنے دیں گے' اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

چہارم : پھر آپ نے اس مسئلہ میں مخالفت رسول ؐ پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ ارشاد رسول ؐ کو جھٹلایا بھی' اور اس کا مذاق بھی اڑایا' جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو گا' حالانکہ آپ خود اقرار کر چکے تھے کہ جس عقیدہ کا آپ مذاق اڑا رہے ہیں وہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اور ان کا مذاق اڑانے کے لئے فاسق و فاجر اور کافر عورتوں تک کے قصے سنا ڈالے' آپ کو سوچنا چاہئے کہ کیا آپ پر یہ ارشاد خداوندی تو صادق نہیں آتا؟ :

"قل اباللہ وایاتہ ورسولہ کنتم تستہزؤن' لا تعتذروا' قد کفرتم بعد ایمانکم۔" (توبہ:۶۵/۶۶)

ترجمہ۔ "آپ کہہ دیجئے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے' تم اب عذر مت کرو تم تو اپنے کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

پنجم : اب تک اس مسئلہ میں آپ کے چار رنگ سامنے آچکے ہیں :

اول : آپ نے اس عقیدۂ حقہ کا اقرار کیا ہے کہ قرآن و حدیث کے دلائل کی روشنی میں عورت کی سربراہی شرعاً جائز نہیں۔

دوم : مس فاطمہ جناح کی حمایت میں آپ اس عقیدۂ حقہ سے منحرف ہو گئے۔

سوم : ۱۲ر فروری ۶۵ء کے خط بنام مودودی صاحب میں اس عقیدہ حقہ کا پھر اقرار کیا۔

چہارم : ۲۵ر اکتوبر ۹۳ء کو آپ بیگم بے نظیر کی حمایت میں عقیدۂ حقہ کے اقرار سے

پھر منحرف ہو گئے۔

اب آپ کی پانچویں حالت باقی ہے کہ آپ اس انحراف سے پھر توبہ کر لیتے ہیں اور اسی توبہ آپ کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے یا اس سے توبہ کرنے کے بجائے آپ عقیدہ حقہ کے انکار پر آگے بڑھے چلے جاتے ہیں اور اسی پر آپ کا خاتمہ ہو؟ اور اگر خدانخواستہ اب بھی آپ کو سچی توبہ کی توفیق نصیب نہ ہوئی تو آپ کی وہی کیفیت ہو گی جو قرآن کریم نے ذیل کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

"ان الذین امنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لم یکن اللہ لیغفر لہم ولا لیہدیہم سبیلا' بشر المنافقین بان لہم عذابا الیما' الذین یتخذون الکافرین اولیا من دون المومنین' یبتغون عندہم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا۔" (النساء: ۱۳۷)

ترجمہ۔ "بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشیں گے۔ اور نہ ان کو رستہ دکھائیں گے۔ منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے۔ جن کی یہ حالت ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

آپ اقرار پھر انکار' پھر اقرار پھر انکار کی چار گھاٹیاں عبور کر چکے ہیں' اس ناکارہ کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اب "انکار پر اصرار" کی پانچویں گھاٹی عبور نہ کیجئے۔ بلکہ ۱۲ فروری ۶۵ء کی طرح اب پھر توبہ کر لیجئے' اور مرتے دم تک اس پر قائم رہئے۔

ششم : جس اخبار نویس نے آپ کے خط بنام مودودی صاحب کا اقتباس نقل کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ آپ بھی عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں عام علماء کے ہمنوا ہیں' آپ اس کی اس حرکت کو "وسوسہ اندازی اور مغالطہ طرازی" سے تعبیر فرماتے ہیں' اس ناکارہ کے خیال میں یہ اس غریب اخبار نویس پر آپ کی زیادتی ہے'

کیونکہ ۱۲ر فروری ۶۵ء کے "توبہ نامہ" کے بعد آپ کی طرف سے کبھی ایسا اظہار و اعلان نہیں ہوا تھا جس سے سمجھا جائے کہ آپ نے اس توبہ سے توبہ کرلی ہے۔ اس لئے جس شخص نے اس توبہ نامہ کی روشنی میں یہ سمجھا کہ آپ بھی عام علماء کے ساتھ متفق ہیں، اس نے کچھ غلط نہیں سمجھا، اس نکتہ پر پھر سے غور فرمایئے کہ اس غریب کو وسوسہ اندازی اور مغالطہ آفرینی کا طعنہ دینا کہاں تک صحیح ہے؟

دسواں مغالطہ : اول یہ کہ انہوں نے اپنے مندرجہ بالا خط (بنام مودودی) میں خود تسلیم کیا ہے کہ انہوں نے اس عقیدہ کو کہ شرعاً عورت کی حکومت باطل ہے، قرآن و حدیث سے ثابت کیا تھا۔ اس اقرار کے بعد انکار کے کیا معنی؟ اور اگر بالفرض تسلیم کرلیا جائے کہ موصوف کی نظر میں قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس میں عورت کی حکمرانی کی ممانعت ہو تب بھی چونکہ زیر بحث مسئلہ پر ائمہ اجتہاد کا اجماع و اتفاق ہے، اور علم اصول میں موصوف نے پڑھا ہو گا کہ اجماع امت مستقل حجت شرعیہ ہے، اس لئے موصوف کو یہ زحمت اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس مسئلہ کو قرآن کریم میں تلاش کریں، کیونکہ ائمہ اجتہاد کا اجماع بغیر سند اجماع کے منعقد نہیں ہوتا، لہٰذا اہل اجماع نے جب اس مسئلہ پر اجماع کیا تو ان کے سامنے قرآن و حدیث کی کوئی سند ضرور ہوگی جس پر ان کا اجماع منعقد ہوا، پھر یہ "سند اجماع" کبھی تو بالکل واضح اور ظاہر ہوتی ہے جس کا ادراک ہر صاحب علم کو ہو سکتا ہے، اور کبھی یہ "سند اجماع" خفی ہوتی ہے کہ بعد کے اہل علم کو اس کا ادراک نہیں ہو پاتا۔ الغرض کسی مسئلہ پر ائمہ اجتہاد کا اتفاق و اجماع بجائے خود اتنی بڑی دلیل ہے کہ اس کے بعد قرآن و حدیث سے اس مسئلہ کا ثبوت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

گیارہواں مغالطہ : موصوف فرماتے ہیں کہ سورۃ النساء کی وہ آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ مرد عورتوں کے "قوام" ہیں، اس کے سوا قرآن کریم میں اس مسئلہ کی

کوئی دلیل نہیں۔ یہ بھی ان کی غلط فہمی ہے کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات شریفہ میں عورتوں کی حیثیت و مرتبہ کا تعین فرمایا گیا ہے، جن سے ائمہ اجتہاد نے یہ مسئلہ اخذ فرمایا ہے کہ عورت، امامت صغریٰ و کبریٰ کی اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتی۔ مثلاً:

۱ - قرآن کریم میں تصریح فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت بخشی ہے، بما فضل اللہ بعضہم علیٰ بعض۔ اس فضیلت کی ایک صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے مردوں کو فطری طور پر بعض اوصاف و کمالات ایسے عطا فرمائے ہیں جو عورتوں کی فطرت کے مناسب نہیں تھے، جن کی وجہ سے مرد نبی ہو سکتا ہے، عورت نہیں ہو سکتی، مردوں پر جمعہ اور جماعت کی اقامت لازم کی گئی ہے، عورتوں پر نہیں، مرد نماز میں امام بن سکتا ہے، عورت نہیں، مردوں کو جہاد کا حکم ہے، عورتوں کو نہیں، مرد حکمران ہو سکتا ہے، عورت نہیں (دیکھئے تفسیر کبیر وغیرہ)۔

۲ - ان خلقی اوصاف و کمالات میں مردوں کو جو فضیلت دی گئی ہے عورتوں کو اس کی تمنا سے بھی منع فرمادیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے:

ولا تتمنوا ما فضل اللّٰہ بہ بعضکم علیٰ بعض۔

ترجمہ: "اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ۔)

۳ - مرد کو ناکح اور عورت کو منکوحہ قرار دیا گیا، اور نکاح بھی ایک نوع کی ملکیت ہے، اور مملوک کا مملوک ہونا اس کی حاکمیت کے منافی ہے۔

۴ - بیدہ عقدۃ النکاح فرما کر بتلادیا گیا کہ نکاح کا حل و عقد مرد کے ہاتھ میں ہے، عورت کے ہاتھ میں نہیں، نکاح کا حل و عقد بھی جس کے ہاتھ میں نہ دیا گیا ہو حکومت کا حل و عقد اس کے ہاتھ میں کیسے دیا جا سکتا ہے؟

۵ - عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت سے نصف قرار دیا گیا ہے، جس کا سبب

بنص حدیث اس کا ناقص العقل ہونا ہے' پس ایسا ناقص العقل' جو شہادت کاملہ کا بھی اہل نہ ہو' وہ پورے ملک کی حکمرانی کا اہل کیسے ہو سکتا ہے؟

۶ - پھر دو عورتوں کی شہادت اس وقت تک لائق اعتبار نہیں جب تک کہ کوئی مرد ان کے ساتھ گواہی دینے والا نہ ہو' اور شہادت فرع ہے قضاء کی' اور قضاء فرع ہے حکومت کی۔ پس جو شخص فرع کی فرع کا بھی اہل نہ ہو وہ اصل الاصل کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے؟

۷ - عورتوں کو گھروں میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے' اور باہر نکل کر زینت کا اظہار کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے' پس وہ طلب حکومت کے لئے باہر کیسے نکل سکتی ہے؟

۸ - عورتوں پر ستر اور حجاب کی پابندی عائد کی گئی ہے اور انہیں غیر محارم کے ساتھ خلوت و اختلاط سے منع کیا گیا ہے' پس وہ حکمران بن کر نامحرموں بلکہ کافروں تک سے خلوت و اختلاط کیسے کر سکتی ہے؟

۹ - مرد کو گھر کا حاکم بنا کر مرد کو عدل و خوش اخلاقی کا اور عورت کو اطاعت شعاری و وفاداری کا حکم دیا گیا' فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللہ پس جب ایک گھر کی حکومت بھی عورت کے سپرد نہیں کی گئی تو پوری مملکت کی حکومت اس کے سپرد کیسے کی جا سکتی ہے؟

۱۰ - قرآن کریم کے خطابات میں مردوں کو اصل اور عورتوں کو ان کے تابع رکھا گیا ہے۔ پس تابع کو متبوع بنانا قلب موضوع ہے۔

یہ عشرۂ کاملہ ارتجالاً زبان قلم پر آ گیا' ورنہ ان کے علاوہ بھی بہت سے نصوص ہیں جن سے عورت کی حیثیت و مرتبہ کا تعین ہوتا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صنف نازک میں فطری نزاکت و ضعف ہے' اور جرات و ہمت' صبر و تحمل' حوصلہ مندی و اولوالعزمی اور بہادری جیسی مردانہ صفات سے اس کی نسوانیت مانع ہے' اس لئے خالق فطرت نے ایسے امور جو اس کی نزاکت و نسوانیت کے شایاں نہیں تھے' ان کا بار گراں اس کے

نازک و ناتواں کندھوں پر نہیں رکھا' یہ اس حکیم مطلق کی عورتوں کے ساتھ شفقت و رحمت ہے کہ ان کے ضعف و ناتوانی کی رعایت فرمائی۔ آج اگر اس کو صنف نازک کی توہین یا حق تلفی سمجھا جاتا ہے تو یہ مسخ فطرت کی علامت ہے۔

بارہواں مغالطہ : کوثر نیازی صاحب فرماتے ہیں کہ "قوام" کا ترجمہ عام طور سے حاکم کیا جاتا ہے' مگر وہ "لسان" اور "تاج" کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں' بلکہ اس کے معنی ہیں روزی کی کفالت کرنے والا' روزی مہیا کرنے والا۔ موصوف کو "قوام" کا مفہوم سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے' قوام اور قیم دونوں کے ایک ہی معنی ہیں' یعنی رئیس' سردار' منتظم' مدبر' کسی کے معاملات کا کفیل اور احکام نافذ کرنے والا۔ تاج العروس اور لسان العرب میں ہے:

وقد يجيء القيام بمعنى المحافظة والإصلاح ومنه قوله تعالى: ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (تاج العروس ص۳۷ ج۹)

ترجمہ "قیام کا لفظ کبھی محافظت' نگرانی اور اصلاح کے لئے آتا ہے' اور اسی سے ہے حق تعالیٰ کا ارشاد: کہ "مرد قوام ہیں عورتوں پر" (یعنی ان کے محافظ' نگران اور ان کی اصلاح کرنے والے ہیں)۔"

والقيم السيد وسائس الأمر وقيم القوم الذى يقومهم ويسوس أمرهم (لسان العرب ص۵۰۲ ج۱۲)

ترجمہ "قیم کے معنی ہیں سردار اور کسی معاملہ کی تدبیر کرنے والا' کسی قوم کا قیم وہ شخص ہے جو ان کو سیدھا رکھے' اور ان کے معاملات کی تدبیر کرے۔"

وفى التنزيل العزيز: ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ ... فكأنه والله أعلم، الرجال متكفلون بأمور النساء ومعنيون بشؤونهن

(لسان العرب ص۵۰۳ ج۱۲)

ترجمہ "قرآن کریم میں ہے کہ "مرد قوام ہیں عورتوں پر" اس سے مراد—

واللہ اعلم۔ یہ ہے کہ مرد لوگ عورتوں کے تمام امور کے کفیل اور ذمہ دار ہیں' ان کے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے والے اور ان کا اہتمام کرنے والے ہیں۔"

والقيم السيد وسائس الأمر .... والقوام المتكفل بالأمر

(تاج العروس ص۳۷ ج۹)

ترجمہ "قیم کے معنی ہیں سردار اور کسی معاملہ کی تدبیر کرنے والا ـــــ اور قوام کے معنی ہیں وہ شخص جو کسی معاملے کا متکفل اور ذمہ دار ہو۔"

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ تاج العروس اور لسان العرب میں بھی "قوام" کے وہی معنی بتائے گئے ہیں' جو عام طور سے علمائے امت نے بتائے ہیں' یعنی رئیس' حاکم' سردار' منتظم' مدبر' مصلح' کسی کے معاملات کا ذمہ دار اور احکام نافذ کرنے والا۔ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے تاج اور لسان کی عبارتوں کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

لغت کے بعد اب تفاسیر کو لیجئے:

﴿الرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ .... نافذى الأمر عليهن فيما جعل الله إليهم من أمورهن. (ابن جرير ص۵۷ ج۴)

ترجمہ "مرد عورتوں پر "قوام" ہیں کہ ان کا حکم عورتوں پر نافذ ہے' عورتوں کے ان امور میں جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کے سپرد فرمائے ہیں۔"

﴿الرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ أى مسلطون على أدبهن والأخذ فوق أيديهن، فكأنه تعالى جعله أميرا عليها ونافذ الحكم فى حقها (تفسير كبير ص۸۸ ج۱۰)

ترجمہ "مرد مسلط کئے گئے ہیں عورتوں پر' ان کو ادب سکھانے اور ان کا ہاتھ پکڑنے کے لئے' پس گویا اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر حاکم بنایا ہے کہ اس کے حق میں مرد کا حکم نافذ ہے۔"

﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ قيامهم عليهن بالتأديب والتدبير والحفظ والصيانة

(أحكام القرآن جصاص ص۱۸۸ ج۲)

ترجمہ "قوام" سے مراد یہ ہے کہ مرد عورتوں پر مسلط ہیں' ان کو ادب سکھانے' ان کی تدبیر کرنے اور ان کے حفظ و صیانت کے ذریعہ۔"

﴿قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ يقومون عليهن آمرين ناهين، كما يقوم الولاة على الرعايا (كشاف ص۵۰۵ ج۱)

ترجمہ "مرد عورتوں پر مسلط ہیں' ان کو امر و نہی کرتے ہیں' جیسا کہ حکام رعایا پر مسلط ہوتے ہیں اسی بنا پر ان کو "قوام" فرمایا گیا ہے۔"

اسی نوعیت کے الفاظ تمام تفاسیر میں ذکر کئے گئے ہیں' جن سے واضح ہوتا ہے کہ مرد' عورتوں کے صرف معاشی کفیل نہیں' بلکہ ان کی اخلاقی و دینی اصلاح و تادیب کی ذمہ داری بھی ان پر ڈالی گئی ہے' اور ان کو "گھر کی حکومت" کا نگران اعلیٰ بنایا گیا ہے۔

جہاں تک اردو تراجم کا تعلق ہے' حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے "الہامی ترجمہ" سے لے کر حضرت حکیم الامت تھانویؒ تک تمام اکابر نے اس کا ترجمہ "حاکم" یا اس کے ہم معنی الفاظ میں کیا ہے' لہٰذا کوثر نیازی صاحب کا یہ سمجھنا کہ اس کے معنی "حاکم" نہیں' بلکہ صرف معاشی کفیل کے ہیں' صحیح نہیں۔ دراصل موصوف نے کفالت کا اردو محاورہ ذہن میں رکھ کر یہ سمجھا کہ اس کے معنی صرف معاشی ذمہ داریاں اٹھانے تک محدود ہیں۔

موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ ائمہ اجتہاد نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ عورت امامت صغریٰ و کبریٰ کی صلاحیت نہیں رکھتی' اس پر تفاسیر کے علاوہ فقہائے اربعہ کے مذاہب کے حوالے اپنے رسالہ "عورت کی سربراہی" میں نقل کر چکا ہوں۔ ایک جدید حوالہ امام شافعیؒ کی "کتاب الام" سے نقل کرتا ہوں:

قال الشافعی رحمه الله تعالی: وإذا صلّت المرأة برجال ونساء وصبیان ذکور فصلوٰة النساء مجزئة، وصلوٰة الرجال والصبیان الذکور غیر مجزئة، لأن الله عز وجل جعل الرجال قوامین علی النساء، وقصرهن عن أن یکنّ أولیاء وغیر ذلك.

(کتاب الأم ص۱۹۱ ج۱)

ترجمہ "امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی عورت نے مردوں، عورتوں اور لڑکوں کو نماز پڑھائی تو عورتوں کی نماز تو ہو گئی، لیکن مردوں اور لڑکوں کی نماز نہیں ہو گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر "قوام" بنایا ہے، اور عورتوں کو اس سے قاصر قرار دیا ہے کہ ان کو کسی پر ولایت وغیرہ حاصل ہو۔"

اگر موصوف ائمہ مجتہدین کے اشاروں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو انہیں امام شافعیؒ کی مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہو گا کہ مردوں کو عورتوں پر "قوام" بنانے کے معنی یہ ہیں کہ عورتیں کسی پر ولایت و اختیار کی صلاحیت نہیں رکھتیں، لہٰذا ان کا حاکم بنایا جانا وضع فطرت کے خلاف ہے۔

تیرھواں مغالطہ : جناب کوثر نیازی صاحب، ارشاد خداوندی :و بما انفقوا من اموالهم کا مدعا سمجھنے سے بھی قاصر رہے ہیں۔ لہٰذا مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت بھی مناسب ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اس آیت شریفہ میں تدبیر منزل کا صالح اور فطری نظام ارشاد فرما رہے ہیں، وہ یہ کہ "گھر" مرد اور عورت سے تشکیل پاتا ہے، اس کی تشکیل کی فطری وضع یہ ہے کہ گھر میں مرد حاکم ہو، اور عورت اس کے زیر حکم ہو۔ الرجال قوامون علی النساء سے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے، پھر مردوں کی حاکمیت و قوامیت کے دو اسباب ذکر فرمائے، ایک خلقی اور فطری سبب، جس کو بما فضل الله بعضهم علیٰ بعض سے ذکر فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے بعض فطری اوصاف و کمالات میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت دی

ہے، جس کا مقتضایہ ہے کہ مرد عورتوں پر قوام ہوں اور عورتیں ان کے زیر حکم رہیں۔

دوسرا سبب کسبی ہے، جس کو و بما انفقوا من اموالھم سے بیان فرمایا، یعنی چونکہ مردوں نے گھر بسانے کے لئے عورتوں کو مہر ادا کئے ہیں، اور ان کے نان و نفقہ اور معاشی ضروریات کا بار اٹھایا ہے، اس بنا پر بھی مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے، اور وہ گھر کے حاکم اور افسر اعلیٰ ہیں۔ پھر مردوں کی حاکیت کے ان دو اسباب کو ذکر کرنے کے بعد اس حاکیت کا نتیجہ ان الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں: فالصالحات قانتات ''پس نیک عورتیں وہ ہیں جو مردوں کی فرمانبردار ہوں۔'' پس آیت شریفہ کا مدعا یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر قوام اور حاکم اس لئے مقرر کیا گیا کہ اول تو غیر اختیاری اور فطری خصائص میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے، اب اگر گھریلو حکومت کا حاکم مردوں کے بجائے عورتوں کو مقرر کیا جاتا تو سارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جاتا، دوسرے، عورتوں کے مصارف (مہر اور نان و نفقہ) کی ذمہ داری بھی مردوں پر رکھی گئی ہے، گویا وہ مردوں کی زیر دست اور دست نگر ہیں، اور عقل و فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بالادست بنایا ہو ان کو زیر دستوں پر حاکم تسلیم کیا جائے۔

جناب نیازی صاحب نے ایک غلطی تو یہ کی کہ قرآن کریم نے مردوں کی قوامیت کے جو دو اسباب بیان فرمائے تھے ان میں سے پہلے سبب کی طرف تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور دوسری غلطی یہ کہ "و بما انفقوا من اموالھم" کے بلیغ الفاظ سے قرآن کریم نے جس دعویٰ کی دلیل بیان فرمائی تھی موصوف کی نظر عالی اس کی حقیقت تک رسائی سے قاصر رہی، عجائبات میں سے ہے کہ ایسی فہم و دانش کے باوصف موصوف ائمہ اجتہاد کی خردہ گیری فرماتے ہیں، اور ان اکابر کے فیصلوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

نیازی صاحب نے برسوں تک ''جماعت اسلامی'' کی صحرا نوردی کی ہے، خود بھی ''قیم جماعت اسلامی حلقہ لاہور'' رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی اصطلاح ''قیم جماعت اسلامی'' سے یقیناً وہ ناواقف نہیں ہوں گے، ان سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کیا ''قیم

جماعت اسلامی" کے معنی یہ ہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے "نان و نفقہ کا کفیل" ہوتا ہے؟

چودھواں مغالطہ : موصوف سورۂ نمل میں ذکر کردہ قصہ بلقیس سے، حضرت تھانویؒ کے حوالہ سے استدلال کرتے ہیں کہ عورت حکمران بن سکتی ہے، اگر موصوف نے اس جگہ حضرت تھانویؒ کی بیان القرآن کے فوائد دیکھ لئے ہوتے تو ان کو غلط فہمی نہ ہوتی، حضرتؒ لکھتے ہیں:

> "اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے، پس بلقیس کے قصے سے کوئی شبہ نہ کرے، اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے، اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔" (بیان القرآن جلد ۸ ص ۸۵)

اور خود اسی فتویٰ میں، جس کا کوثر نیازی صاحب نے حوالہ دیا ہے، حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

> "حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورة (یعنی مرد ہونے) کو شرط صحت اور قضا میں گو شرط صحت نہیں، مگر شرط صون عن الاثم فرمایا ہے۔"
>
> (امداد الفتاویٰ جلد ۵ ص ۱۰۰)

مطلب یہ کہ اگر عورت کو حاکم اعلیٰ بنادیا گیا تو چونکہ اس منصب کے لئے مرد ہونے کی شرط تھی، اس لئے عورت کی حکومت صحیح نہیں ہوگی، بلکہ اہل حل و عقد پر لازم ہوگا کہ کسی مرد کو حاکم بنائیں، اور اگر عورت کو قاضی بنادیا گیا تو فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس کا تقرر تو صحیح ہو جائے گا، لیکن بنانے والے گنہگار ہوں گے، اور اس گناہ کے ازالہ کے لئے ضروری ہوگا کہ عورت کو اس منصب سے ہٹائیں۔ اب کوثر نیازی صاحب انصاف فرمائیں کہ کیا حضرت تھانویؒ کے فتویٰ کی رو سے عورت کے سربراہ حکومت بننے کی گنجائش ہے؟ حضرت تھانویؒ کے جس فتویٰ کا حوالہ مولانا کوثر نیازی نے دیا ہے اس کی توجیہ و تعلیل میں اپنے رسالہ "عورت کی سربراہی" میں ذکر کر چکا ہوں،

۳ - لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی، جو انہوں نے اپنے کانوں سے سن رکھا تھا، اس کی وجہ سے وہ اپنے اس خیال سے باز رہے۔

۴ - حضرت ام المومنینؓ نے جب ان کو اپنی حمایت کے لئے بلایا تو انہوں نے ام المومنینؓ کے پورے ادب و احترام کے باوصف، اسی ارشاد نبویؐ کی بنا پر ان سے معذرت کرلی، اور حضرت ام المومنینؓ نے بھی یہ ارشاد سن کر سکوت اختیار فرمایا، اور ان پر مزید اصرار نہیں فرمایا، گویا حضرت ام المومنینؓ بھی اس ارشاد نبویؐ سے ناواقف نہیں تھیں۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث نبویؐ سے حضرت ابوبکرہؓ نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا لشکر کامیاب نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس لڑائی میں ان کا ساتھ دینے سے باز رہے، بعد میں حضرت علیؓ کا غلبہ دیکھا تو ان پر ترک قتال کے بارے میں اپنی رائے کی صحت واضح ہوگئی۔

حدیث کا متن اور حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانیؒ کی تصریحات ملاحظہ کرنے کے بعد دوبارہ ایک نظر کوثر صاحب کی مندرجہ بالا عبارت پر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ:

۱ - جناب کوثر صاحب یا تو حدیث کا مفہوم ہی نہیں سمجھے، یا انہوں نے مطلب براری کے لئے حدیث کے مفہوم کو قصداً مسخ کیا ہے۔

۲ - حدیث کے اولین راوی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ایک مشہور صحابی ہیں۔ لیکن موصوف "راوی کہتا ہے" کے لفظ سے ان کے "مجہول" ہونے کا تاثر دے رہے ہیں۔

۳ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابیؓ فرماتے ہیں کہ فلاں موقع پر مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا ارشاد یاد آیا، جس نے مجھے فتنہ میں واقع ہونے سے بچالیا، کوثر صاحب ان پر یہ تہمت لگا رہے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کی قیادت کو غلط ثابت کرنے کے لئے اس روایت کا سہارا لیا، گویا حدیث خود گھڑ لی۔

۴ - حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے غلبہ نے

حضرت ابو بکرہؓ پر ان کی رائے کی صحت واضح کردی تھی' لیکن کوثر نیازی صاحب اپنے مفروضات کو حافظؒ کے سر دھرتے ہیں' اناللہ و انا الیہ راجعون۔

سترھواں مغالطہ : جناب کوثر نیازی صاحب نے "علم مصطلح الحدیث" اور "فن اسماء الرجال" کو بھی اپنے زریں افادات سے مزین کرنا ضروری سمجھا' چنانچہ حدیث کے رجال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "حدیث پر غور کرنے کے لئے دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ جن افراد نے یہ روایت بیان کی ہے یا حدیث کی اصطلاح میں جتنی اس کی اسناد ہیں' ان سب کا تعلق بصرہ (عراق) سے ہے۔ فتح الباری جلد ہشتم صفحہ ۹۷ پر ہے:
> والاسناد کلہ بصریون۔ "اس کے تمام راوی بصرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔"
> "مکہ اور مدینہ سے کسی راوی کا تعلق نہیں تھا' حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سننے والے اور اولیں سننے والے مکہ اور مدینہ کے اصحاب ہونے چاہئیں' یہی وجہ ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی نے امام شافعیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس حدیث سے مکہ اور مدینہ کے اصحاب واقف نہ ہوں' اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔" (تدریب الراوی از سیوطی ۲۳)

کوثر نیازی صاحب اس حدیث کی اسناد کے بصری ہونے سے یہ سمجھے ہیں (یا لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں) کہ اس کے تمام راوی ہمیشہ بصرہ کے گلی کوچوں تک محدود رہے' ان کو کبھی کسی دوسرے شہر کی ہوا نہیں لگی اور وہ کبھی مکہ یا مدینہ نہیں گئے' نہ کسی نے یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ سنی' لہذا ___ نعوذ باللہ ___ یہ حدیث غلط ہے' خود ساختہ ہے' جھوٹی ہے۔ کوثر نیازی صاحب کے یہ افادات' محدثین کی اصطلاح سے ان کی ناواقفی کا نتیجہ ہیں' انہوں نے حافظؒ کے کلام میں یہ تو پڑھ لیا کہ اس کے تمام راوی بصری ہیں' کاش! وہ کسی طالب علم سے اس کا مطلب بھی پوچھ لیتے کہ کسی اسناد کے بصری ہونے کا کیا مطلب ہے؟

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب بصرہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سن چودہ ہجری میں آباد ہوا تو اس کی سرزمین کو سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، اور بہت سے صحابہ کرامؓ نے یہاں سکونت اختیار فرمائی۔ چنانچہ ابن سعد نے "طبقات کبریٰ" (جلد ۷ صفحات ۵ تا ۹۰) میں ڈیڑھ سو سے زائد ان صحابہ کرامؓ کا تذکرہ لکھا ہے، جنہوں نے بصرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، ان میں حضرت انس بن مالک (خادم النبی صلی اللہ علیہ وسلم)، حضرت ابو برزہ اسلمی، حضرت عمران بن حصین، حضرت عتبہ بن غزوان، حضرت معقل بن یسار، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہم جیسے مشاہیر صحابہؓ بھی شامل ہیں، حضرت امام حسن بصریؒ کا قول ہے:

"لم ینزل البصرة افضل من ابی بکرة و عمران بن حصین۔"

(الاستیعاب حاشیہ الاصابہ ۳/۵٦۸) (الذہبی: تاریخ الاسلام ۴/۳۳۴، سیر اعلام النبلاء ۳/۱۰)

ترجمہ۔ "بصرہ میں کسی ایسے شخص نے رہائش اختیار نہیں کی، جو حضرت ابوبکرہؓ اور عمران بن حصینؓ سے افضل ہو۔"

حضرات محدثین کی اصطلاح یہ ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے ملک شام میں سکونت اختیار فرمائی، ان کو شامی شمار کرتے ہیں، مصر میں آباد ہونے والوں کو مصری اور بصرہ کے متوطن حضرات کو بصری شمار کرتے ہیں۔ وعلی ہذا۔۔۔ اب ان حضرات کے ہم وطن تابعین جب ان صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں تو یہ اسناد شامی، مصری، کوفی، بصری، خراسانی (وغیرہ وغیرہ) کہلاتی ہے۔ اور بعض اوقات کسی محدث کو ایک ہی شہر کے راویوں کے سلسلہ سند سے روایت پہنچتی ہے تو ایسے موقع پر کہا جاتا ہے نوالاسناد کلہ مصریون، شامیون، بصریون، کوفیون وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ چیز "لطائف اسناد" میں شمار کی جاتی ہے۔

زیر بحث حدیث کے اولین راوی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، غزوۂ طائف کے موقع پر اسلام لائے، اور وصال نبویؐ تک سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے ساتھ رہے' اور وصال نبویؐ کے بعد بھی ۱۴ھ تک مدینہ شریف میں قیام پذیر رہے۔ انہوں نے یہ حدیث اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی تھی' چنانچہ وہ "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی تصریح فرماتے ہیں۔ لیکن ہمارے کوثر نیازی صاحب' اسناد کے "بصری" ہونے سے یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ اس کے اولین راوی کو کبھی مکہ و مدینہ کی زیارت کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا' چہ جائے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا ہو۔ کوثر صاحب کی اس خوش فہمی پر انا للہ و انا الیہ راجعون کے سوا اور کیا عرض کیا جائے۔

حضرت ابوبکرہ صحابی رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو روایت کرنے والے عالم اسلام کی شہرۂ آفاق ہستی حضرت امام حسن بصریؒ ہیں' اور ان سے روایت کرنے والی ایک جماعت ہے۔ حافظ ابن حجرؒ امام ابن عساکر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

رواه عن الحسن جماعة وأحسنها إسناداً رواية حميد.

(فتح الباری ص٥٤ ج١٣)

یعنی۔ "اس حدیث کو امام حسن بصریؒ سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے'... ان میں سب سے اچھی سند حمید کی روایت کی ہے۔" (فتح الباری ص۵۴ ج۱۳)

اب کوثر نیازی صاحب سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس حدیث کو جھوٹی قرار دے کر اس جھوٹ کا الزام حضرت ابوبکرہ صحابیؓ کے سر رکھنا چاہتے ہیں' یا عالم اسلام کے مایہ ناز امام التابعین حضرت حسن بصریؒ کے سر' یا ان سے روایت کرنے والی ایک پوری جماعت کے سر؟ اس ناکارہ کا مشورہ یہ ہے کہ وہ ان اکابر پر بہتان باندھنے کے بجائے یہ اعتراف کرلیں کہ ان کی فن حدیث سے ناواقفی اور خوش فہمی نے یہ گل کھلائے ہیں' اور ان اکابر صحابہؓ و تابعین پر بہتان عظیم باندھنے سے توبہ کرلیں۔

اٹھارھواں مغالطہ : موصوف نے تدریب الراوی کے حوالے سے امام شافعی کا جو قول نقل کیا ہے' اس میں موصوف کو تین غلط فہمیاں ہوئی ہیں:

اول : یہ کہ امام شافعیؒ کا یہ قول اپنے دور (یعنی دوسری صدی کے آخر) کے بارے میں ہے' حاشا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور اکابر تابعینؒ کے بارے میں امام شافعیؒ ایسی مہمل بات کہیں۔

دوم : یہ کہ امام شافعیؒ کے اصل الفاظ یہ ہیں": کل حدیث جاء من العراق ولیس له اصل فی الحجاز فلا تقبله و ان کان صحیحا' ما ارید الا نصیحتک"(تدریب مطبوعہ میر محمد کراچی ص۸۵ ج۱) آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں "مکہ اور مدینہ کے اصحاب" کے الفاظ نہیں ہیں' یہ الفاظ موصوف نے غلط فہمی کی بنا پر خود تصنیف کرکے امام شافعیؒ سے منسوب کردیئے ہیں۔ اگر موصوف نے امام شافعیؒ کی "مسند" کا مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں نظر آتا کہ امام شافعیؒ کی "مسند" موصوف کے ان الفاظ کی تکذیب کررہی ہے' کیونکہ خود انہوں نے بہت سی روایات "مکہ اور مدینہ کے اصحاب" کے علاوہ دوسرے حضرات سے لی ہیں۔

سوم : یہ کہ عراق کی روایات پر جب محدثین تنقید کرتے ہیں یا انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں تو "عراق" سے ان کی مراد کوفہ ہوتا ہے' تنہا بصرہ کو "عراق" کے لفظ سے وہ تعبیر نہیں کرتے' البتہ جب کوفہ و بصرہ دونوں ملا کر ذکر کرتے ہیں تو انہیں "عراقین" کے لفظ سے تعبیر فرماتے ہیں' کوفہ چونکہ روافض کا مرکز تھا' جنہیں "اکذب خلق اللہ" قرار دیا گیا ہے' اس لئے محدثین کوفی روایات کو بے حد مشکوک نظر سے دیکھتے تھے' اور جب تک قرائن و شواہد سے ان کی صحت کا اطمینان نہ ہوجاتا ان سے پرحذر رہنے کی تلقین فرماتے تھے' لیکن بصری روایات کے بارے میں ان کی رائے ایسی سخت نہیں تھی۔ تدریب میں حافظ سیوطیؒ نے حافظ ابن تیمیہؒ کا قول نقل کیا ہے:

وقال ابن تيمية: اتفق أهل العلم بالحديث على أن أصح الأحاديث ما رواه أهل المدينة، ثم أهل البصرة، ثم أهل الشام.

(تدریب ص۸٦ ج۱)

ترجمہ "محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ صحیح تر حدیث وہ ہے جو اہل مدینہ کی روایت ہو، پھر اہل بصرہ کی، پھر اہل شام کی۔" (ص۸٦ ج۱)

اور اس سے پہلے خطیب بغدادی کا قول نقل کیا ہے:

وقال الخطيب أصح طرق السنن ما يرويه أهل الحرمين (مكة والمدينة) فإن التدليس عنهم قليل، والكذب ووضع الحديث عندهم عزيز ولأهل اليمن روايات جيدة وطرق صحيحة إلا أنها قليلة ومرجعها إلى أهل الحجاز أيضا ولأهل البصرة من السنن الثابتة بالأسانيد الواضحة ما ليس لغيرهم مع إكثارهم والكوفيون مثلهم فى الكثرة غير أن رواياتهم كثيرة الدغل قليلة السلامة مع العلل. (تدريب ص۸٥ ج۱)

ترجمہ "احادیث کی صحیح تر اسانید وہ ہیں جو اہل حرمین، مکہ و مدینہ کی روایت سے ہوں، کیونکہ ان میں تدلیس کم ہے، اور جھوٹی احادیث گھڑنا نہ ہونے کے برابر، اور اہل یمن کے یہاں روایات جیدہ اور طرق صحیحہ ہیں، مگر کم ہیں۔ اور ان کا بھی مرجع اہل حجاز کی طرف ہے، اور اہل بصرہ کے پاس بہت سی احادیث صحیحہ اسانید واضحہ کے ساتھ موجود ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں، باوجودیکہ وہ کثیر الروایت ہیں۔ اور کثرت روایت میں اہل کوفہ بھی اہل بصرہ کی مانند ہیں، مگر ان کی روایات میں کھوٹ اور دھوکا بہت ہے، کم ہی روایات ہیں جو علل سے محفوظ اور سالم ہوں۔" (ص۸۵ ج۱)

تدریب کی یہ عبارات اسی صفحہ پر ہیں جہاں سے کوثر نیازی صاحب نے امام شافعیؒ کا فقرہ نقل کیا ہے، اور اس کا مفہوم و مدعا سمجھے بغیر اس سے اپنا مدعا اخذ کرنا چاہا ہے، لیکن افسوس کہ نہ تو انہوں نے کسی ماہر فن سے اس علم کو باقاعدہ سیکھا، نہ خود ایسی لیاقت کا مظاہرہ کیا کہ غور و فکر کے بعد وہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتے، اس لئے بلا تکلف امام شافعیؒ پر یہ تہمت دھر دی کہ وہ مکہ اور مدینہ کے "اصحاب" کے سوا پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے صحابہ کرامؓ کی روایات کو غلط سمجھتے ہیں۔ استغفراللہ۔

انیسواں مغالطہ : کوثر نیازی صاحب، صحیح بخاری کی صحیح حدیث کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حدیث کا ایک اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ایسا نہیں ہو سکتا جسے تاریخ جھٹلانے کی جرأت کر سکے۔ اگر آپؐ نے فرمایا ہے کہ کوئی بھی قوم جس نے عورت کو سربراہ بنایا ہو، فلاح نہیں پا سکتی تو پھر تاریخ کو اس کی تصدیق کرنی پڑے گی۔ وہ اس قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید کی جرات نہیں کر سکتی۔ "فلاح" دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامیابی اور کامرانی کا نام ہے اور ہمارے سامنے تاریخ ایسے لاتعداد واقعات پیش کر رہی ہے جن میں کئی عورتیں اپنے اپنے ملکوں اور قوموں کی سربراہ ہوئیں اور ان کا دور اپنے وقت کا سنہری دور تھا۔"

اس ضمن میں موصوف نے درج ذیل خواتین کا ذکر کیا ہے۔ روس کی ملکہ کیتھرائن، ہالینڈ کی ملکہ ہلینا، اس کی بیٹی اور نواسی، برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ، موجودہ ملکہ الزبتھ اور وہاں کی خاتون آہن مارگریٹ، لکسمبرگ کی ایک ڈچ ملکہ اور اس کی جانشین موجودہ ملکہ، اسرائیل کی گولڈا میئر، انڈیا کی اندرا گاندھی اور سری لنکا کی بندرانائیکے۔ یہ خواتین موصوف کے خیال میں مردوں سے زیادہ کامیاب اور لائق حکمران رہی ہیں، اور ان کا دور "سنہری دور" سمجھا گیا ہے۔

مسلم خواتین میں مصر کے بادشاہ نجم الدین کی بیٹی (بیٹی نہیں بلکہ بیوی) ملکہ شجرۃ الدر، فاطمہ شریفہ، ملکہ ترخان، رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بیگمات بھوپال کا حوالہ دیا ہے،

مولانا موصوف ان خواتین کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخ کی یہ روشن مثالیں سب کی سب یہ شہادت دے رہی ہیں کہ ان خاتون حکمرانوں کے دور میں ان کی رعایا امن اور چین کی بنسری بجاتی رہی تو پھر یہ قول رسولؐ کہاں جائے گا، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے عورت کو اپنا سربراہ بنایا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خاکم بدہن ہم یہ مان لیں کہ تاریخ نے قول رسولؐ کی تردید کر دی، سمندر میں آگ لگ گئی، پھول بدبو دینے لگ گئے، چاند اور سورج اندھیرے پھیلانے لگے، دن رات بن گیا اور رات دن میں تبدیل ہو گئی۔"

کوثر نیازی صاحب کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ ان خواتین کا دور حکومت "انسانیت کی فلاح" کا دور تھا، لہٰذا ان تاریخی واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ حدیث جھوٹی ہے، حدیث رسولؐ نہیں، ورنہ تاریخ کی کیا مجال تھی کہ وہ حدیث رسولؐ کی تکذیب کرتی؟

یہاں موصوف کی فکر و دانش کو اتنی لغزشیں ہوئی ہیں کہ اس مختصر سے مضمون میں ان کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں، تاہم مختصراً چند امور کی طرف اشارہ کرتا ہوں:

۱ ۔ قرآن کریم میں چالیس کے قریب آیات شریفہ ایسی ہیں جن میں فلاح کو اہل ایمان میں منحصر قرار دیا گیا ہے، اور کفار و فجار سے اس کی نفی کی گئی ہے، جناب کوثر نیازی صاحب نے جس منطق سے حدیث رسولؐ کو جھٹلایا ہے، کوئی احمق اسی منطق کو آگے بڑھاتے ہوئے تاریخ کے حوالے سے قرآن کریم کی ان آیات شریفہ کی (نعوذ باللہ) تکذیب کرنے بیٹھ جائے تو کوثر صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہو گا؟ کیونکہ جب آنجناب نے یہ تسلیم کر لیا کہ ان کافر و فاجر عورتوں کا "سنہری دور" فلاح و کامرانی کا دور تھا، لہٰذا حدیث میں جو فلاح کی نفی کی گئی ہے وہ ان عورتوں کے "سنہری دور" اور ان کے "زریں کارناموں" نے غلط ثابت کر دی تو آپ نے دانستہ یا نادانستہ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ

قرآن کا یہ دعویٰ کہ کفار و فجار کو فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ نعوذ باللہ۔ غلط ثابت ہوا۔ کیا آپ ہی کے الفاظ میں آپ سے یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ:

"اگر ان (کافر و فاجر) خاتون حکمرانوں کے دور میں ان کی رعایا امن اور چین کی بنسری بجاتی رہی تو پھر قرآن کا یہ ارشاد کہاں جائے گا جس میں کہا گیا ہے کہ کافروں اور فاجروں کو فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خاکم بدہن ہم یہ مان لیں کہ تاریخ نے قول اللہ کی تردید کردی؟"

قول رسولؐ کے بارے میں تو آپ نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ قول رسولؐ ہی نہیں، کسی نے خود گھڑ کر اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کردیا ہے، کیا قرآن کریم کی ان چالیس آیات کے بارے میں بھی روافض کی طرح یہی کہیں گے کہ تاریخ نے نعوذ باللہ ان آیات کو غلط ثابت کردیا ہے؟ نعوذ باللہ من الغوایتہ والغباوۃ۔

۲ ۔ آنجناب نے "فلاح" کی تفسیر خود ہی یہ رقم فرمائی ہے کہ:

"فلاح دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی کامیابی و کامرانی کا نام ہے۔"

اس تفسیر کی روشنی میں آنجناب سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ان کافر و فاجر خواتین کے دور حکمرانی میں ۔۔۔ جن کی جھوٹی چمک دمک سے مرعوب ہو کر آنجناب اسے "سنہری دور" سمجھ بیٹھے ہیں ۔۔۔ ان کو یا ان کی رعایا کو آخرت کی کون سی کامیابی و کامرانی میسر آئی؟ جس کی بنیاد پر آپ حدیث رسولؐ کی تکذیب کرنے چلے؟ اگر ان کفار و فجار کو آخرت کی فلاح نصیب نہیں تو حدیث رسولؐ کیسے غلط ثابت ہوئی؟

سب جانتے ہیں کہ ان خواتین کا دور حکومت خدا فراموشی اور خود فراموشی کا بدترین دور تھا، جس میں انسانی اقدار کی مٹی پلید ہوئی، انسان نے وحشی درندوں کا روپ دھار لیا، مرد و زن کا شدید اختلاط ہوا، شہوت پرستی، اباحیت اور جنسی انارکی کی وبا پھوٹ پڑی اور اس نے ساری دنیا کو "جنسی زکام" میں مبتلا کردیا، انہی خواتین کے "سنہری دور"

میں مغرب نے مادر پدر آزادی حاصل کرلی' معاشرہ تحلیل اور گھر کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا' انسان نما جانور نے حیوانیت کے وہ کرشمے دکھلائے کہ وحشی جانوروں کو بھی مات دے دی' ہاں! انہی خواتین کے "زریں دور" میں پارلیمنٹ نے "ہم جنس شادی" کے جواز کا قانون وضع کیا' گویا "عمل قوم لوط" کو قانونی سند مہیا کردی' چنانچہ پادری صاحبان نے گرجا میں دو لڑکوں کا "نکاح" پڑھایا' اور ان کو "میاں بیوی" کی حیثیت دی' پھر انہی خواتین کے دور میں طلاق کا حق مردوں کے بجائے عورتوں کے ہاتھ میں دیا گیا' ان خواتین کے منحوس دور میں انسانیت پر کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے گئے' لیکن کوثر نیازی صاحب کی نظر میں یہ انسانیت کی فلاح و کامرانی کا دور تھا' اس لئے وہ فرض کرتے ہیں کہ تاریخ نے حدیث رسولؐ کو جھٹلادیا۔ اس عقل و دانش پر جناب کوثر نیازی صاحب ہی فخر کرسکتے ہیں۔

۳ ۔ جن خواتین کے حوالے سے موصوف حدیث رسولؐ کی تکذیب کا فخریہ اعلان کررہے ہیں' ان کو حکومت معمول کی حکومت نہیں تھی' بلکہ حادثہ کی پیداوار تھی' اور نظام شہنشاہیت کا شاخسانہ تھی' اس شہنشاہی نظام میں حکمرانی "جہاں پناہ" کے گھر کی لونڈی تھی' ملک اس کی جاگیر تھی' اور تاج و تخت اس کی وراثت تھی' "جہاں پناہ" کی رحلت کے بعد اس کا لڑکا ___ خواہ نابالغ ہی کیوں نہ ہو ___ تاج و تخت کا وارث تصور کیا جاتا تھا۔ لڑکا نہ ہوتا تو لڑکی' بیوی' بہن "ملکہ" بن جاتی' چنانچہ نیازی صاحب نے جن خواتین کا حوالہ دیا ہے' وہ سب اسی حادثہ کی پیداوار تھیں کہ ان کے "شاہی خاندان" میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا' اور شہنشاہیت "جہاں پناہ" کے خاندان سے باہر نہیں جاسکتی تھی' لامحالہ ان خواتین کو زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینا پڑی۔ گویا یہ نظام ملوکیت بھی اس نکتہ کو تسلیم کرتا تھا کہ اگر کوئی حادثہ رونما نہ ہو تو حکومت عورتوں کا نہیں بلکہ مردوں کا حق ہے۔ جہاں تک حادثاتی واقعات کا تعلق ہے' دنیا کا کوئی عقلمند ان کو معمول کے واقعات پر چسپاں نہیں کیا کرتا' بلکہ اہل عقل ایسے واقعات سے عبرت حاصل کیا کرتے ہیں' کون

نہیں جانتا کہ عجیب الخلقت بچوں کی پیدائش کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں' لیکن کسی عاقل نے کبھی ان کو معیاری اور مثالی بچے قرار دے کر ان پر فخر نہیں کیا' یہ کوثر نیازی صاحب ہیں جو دور ملوکیت کے حادثاتی واقعات کو بطور مثال اور نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان حادثاتی واقعات کے سہارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو جھٹلانے کی جرات کرتے ہیں۔

دور ملوکیت لد چکا ہے' اور اس کی جگہ نام نہاد جمہوریت (اور صحیح معنی میں جبریت) نے لے لی ہے۔ لیکن عوام کا ذہن آج بھی دور ملوکیت کی "غلامانہ ذہنیت" کا صید زبون ہے' یہی وجہ ہے کہ انڈیا کے "تخت جمہوریت" پر نہرو کے بعد اس کی بیٹی "اندرا" براجمان ہوئی' اور جب تک اس خاندان کا خاتمہ نہیں ہو گیا انڈیا کا "تخت" اسی خاندان کی جاگیر بنا رہا۔ اگر قضا و قدر کے فیصلوں نے اس خاندان کے ایک ایک فرد کا خاتمہ نہ کر دیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس خاندان سے بھارت کی جان چھوٹ جاتی۔

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں مس فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلہ میں لایا جانا بھی اسی ذہنی غلامی کا کرشمہ تھا' کیونکہ وہ بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح کی بہن تھیں' اس لئے "بادشاہ کی بہن" کو صدر ایوب کے مقابلے میں حکومت کرنے کا زیادہ مستحق سمجھا گیا۔ وہ تو ایوب خان کے بی۔ڈی نظام نے بیڑا غرق کر دیا کہ فاطمہ جناح کو شکست ہوئی' ورنہ اگر "ایک آدمی' ایک ووٹ" کے ذریعہ یہ انتخابی معرکہ سر کیا جاتا تو جیت یقیناً "بادشاہ کی بہن" کی ہوتی' ایوب خان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ سری لنکا کی مسز بندرا نائیکے کا اپنے شوہر کے بعد اس کی پارٹی کی قائد بن جانا' بنگلہ دیش کی حسینہ واجد کا باپ کی جگہ اور خالدہ ضیاء کا اپنے شوہر کی گدی پر قابض ہو جانا بھی عوام کی اسی شاہ پرستانہ اور غلامانہ ذہنیت کا مظہر ہے' اسی ذہنی غلامی کا نتیجہ ہے کہ پی پی کے "شاہ" کے بعد اس کی تخت کی وارث اس کی بیگم اور صاحبزادی قرار پائیں' کیونکہ تخت کے "اصل وارث" ان دنوں بیرون ملک تھے' آپ دیکھیں گے کہ جب تک اس شاہی خاندان کا ایک فرد بھی باقی

ہے' پارٹی کی قیادت اور ملک کی حکومت اس کا خاندانی حق تصور کیا جائے گا۔ کوثر نیازی صاحب کے خطبات و مقالات بھی اسی غلامانہ ذہنیت کی صدائے بازگشت ہے' جس کی بنیاد پر موصوف' ارشاد نبویؐ کی آہنی دیوار سے ٹکرا کر اپنے دین و ایمان کا سر پھوڑ رہے ہیں۔

۴ - جن مسلم حکمران خواتین کے نام موصوف بھولے بھالے عوام کے سامنے بطور "معیار" کے پیش کر رہے ہیں' اگر تاریخ کے اوراق میں ان خواتین کے کارناموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان پر فخر کرنے کے بجائے شرم سے سر جھک جائیں گے۔ بطور مثال موصوف کی ممدوحہ "شجرۃ الدر" کے حالات میرے رسالہ "عورت کی سربراہی" کے آخر میں بطور ضمیمہ منسلک ہیں' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے شوہر نجم الدین کی وفات کے بعد اس نے بادشاہت کی خاطر شوہر کے بیٹے "توران شاہ" کو خفیہ طور پر قتل کرایا' اور خود "بادشاہ" بن گئی' اس پر خلیفہ بغداد مستنصرباللہ نے اہل مصر کے نام خط لکھا کہ:

> "اے اہل مصر! اگر تمہارے یہاں کوئی مرد باقی نہیں رہا جو سلطنت کی اہلیت رکھتا ہو تو ہمیں بتاؤ' ہم ایسا مرد بھیج دیں گے جو حکمرانی کی اہلیت رکھتا ہو۔ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں سنی کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے عورت کو حکمران بنالیا۔"

خلیفہ نے اہل مصر پر زور دیا کہ عورت کو معزول کرکے اس کی جگہ کسی مرد کو حاکم مقرر کیا جائے' خلیفہ کا یہ خط مصر پہنچا تو "شجرۃ الدر" اپنے سپہ سالار عزالدین ایبک کے حق میں دستبردار ہوگئی' اور اسے بادشاہ بنا کر خود اس سے شادی کرلی' چند دن بعد اپنے شوہر کو قتل کرادیا' بادشاہ کے قتل کے بعد اس نے بہت سے لوگوں کو "تخت" کی پیشکش کی' مگر کسی نے اسے قبول نہ کیا' بالآخر تاج و تخت سمیت اپنے آپ کو عزالدین ایبک کے وارثوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوئی' اور اپنے گھناؤنے کردار کی پاداش میں قتل ہوئی۔ کل اسی (۸۰) دن اس کی حکومت رہی' جس کی خاطر اس نے اپنے شوہر کے بیٹے' اور دوسرے شوہر کو قتل کرایا' اور خود بھی کیفر کردار کو پہنچی۔ حیف ہے کہ ہمارے کوثر

نیازی صاحب اس مکار خاتون کی اسی (۸۰) دن کی سازشی حکومت کو ناواقف عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ اس خاتون کی تین ماہ سے کم کی حکمرانی کا دور تاریخ کا "سنہرا دور" تھا جس نے ارشاد رسولؐ کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

ع "بریں عقل و دانش بباید گریست"

بیسواں مغالطہ : اوپر آٹھویں مغالطے کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ جناب مودودی صاحب نے "مس فاطمہ جناح" کے صدارتی انتخاب کا جواز ثابت کرنے کے لئے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ جن چیزوں کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے' ان کی دو قسمیں ہیں' حرام ابدی اور حرام غیر ابدی۔ ہمارے کوثر نیازی صاحب نے اس نظریہ کو خطرناک قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس طرح شریعت ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔" اس کے بجائے موصوف نے عورت کی حکمرانی کا جواز ثابت کرنے کے لئے جو نظریہ اختراع کیا وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> "اصل بات یہ ہے کہ ہمارے بہت رویے ہمارے مخصوص سماجی اور معاشرتی جبر کی پیداوار ہیں' عورت کی سربراہی کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے' جب عورت کفالت کے لئے مرد کی محتاج تھی' گھر کی چاردیواری میں بند تھی تو مسئلے مسائل کچھ اور تھے' مگر اب تو سماجی حالات و ضروریات کا نقشہ ہی یکسر مختلف ہے' عورت ہر مسلمان معاشرے میں قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہے' خود کماتی ہے' قابل ہے' تعلیم یافتہ ہے' ہر شعبہ زندگی میں ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہے۔ ایسے میں مخصوص سماجی نظریات کی پیداوار کو شریعت بنا کر عوام پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔"

میں قارئین کرام کو اور خود جناب کوثر نیازی کو بھی دعوت انصاف دیتا ہوں کہ وہ فیصلہ فرمائیں کہ ایک طرف مودودی صاحب کا نظریہ "ابدی حرام اور غیر ابدی حرام" اور دوسری طرف کوثر نیازی صاحب کا نظریہ کہ "شریعت کے بہت مسائل سماجی و معاشی جبر کی پیداوار ہیں" اور یہ کہ "ان کو شریعت بنا کر عوام پر مسلط نہیں کیا جا سکتا" ان دونوں نظریوں میں سے کون سا زیادہ خطرناک ہے؟ اور شریعت سے بدترین مذاق کرنے میں کون

سا نظریہ زیادہ جرأت کا مظاہرہ کر رہا ہے؟ مودودی صاحب نے شریعت کے حرام کو حرام تسلیم کرتے ہوئے اس میں صرف اتنی ترمیم کی تھی کہ یہ حرام ابدی نہیں' حرام غیر ابدی ہے۔ لیکن نیازی صاحب نے اسی حرام کو "جبر کی پیداوار" کہہ کر نہ صرف اس کی حرمت کا انکار کر دیا' بلکہ "اس کو شریعت بنا کر عوام پر مسلط نہیں کیا جا سکتا" کے الفاظ سے شریعت محمدیہؐ کے خلاف صاف صاف بغاوت کا بھی اعلان کر دیا۔ کوثر نیازی صاحب کے کسی گوشہ قلب میں اگر عقل و ایمان اور فہم و انصاف کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ رمق باقی ہے تو وہ بار بار سوچیں اور ہزار بار سوچ کر انصاف فرمائیں کہ کیا وہ یہ نظریہ ایجاد کر کے مودودی صاحب کو پیچھے نہیں چھوڑ گئے؟ اور سیدھے پرویزیوں کی صف میں شامل نہیں ہو گئے؟ اور کیا انہوں نے مندرجہ بالا الفاظ کے ذریعہ شریعت کو پائے استحقار سے نہیں ٹھکرا دیا؟ مودودی صاحب کی روح ان سے بجا طور پر یہ شکایت کر رہی ہو گی:

میری وفا کو دیکھ کر اپنی جفا کو دیکھ کر
بندہ پرور! منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر

کوثر نیازی صاحب جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن ہر وہ شخص جو دین کی ابجد سے بھی واقف ہو وہ جانتا ہے کہ جن مسائل کو موصوف "جبر کی پیداوار" کہہ کر بڑی جرأت و جسارت' بلکہ بے باکی اور ڈھٹائی کے ساتھ ٹھکرا رہے ہیں' یہ قرآن کریم کے صریح احکام ہیں' اللہ تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے اور خالق فطرت ہے' نسوانی فطرت اور اس کے تقاضوں کو بخوبی جانتا ہے' اسی علیم و حکیم نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں جم کر بیٹھیں' اور جاہلیت اولیٰ کی طرح شہوت کے نیلام گھر میں اپنے حسن کی نمائش نہ کرتی پھریں:

ترجمہ "اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں' اور دکھلاتی نہ پھرو' جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جاہلیت کے وقت میں۔" (الاحزاب:۳۳) (ترجمہ شیخ الہندؒ)

حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یعنی اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عورتیں بے پردہ پھرتی اور اپنے بدن اور لباس کی زیبائش کا علانیہ مظاہرہ کرتی تھیں' اس بداخلاقی اور بے حیائی کی روش کو مقدس اسلام کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس نے عورتوں کو حکم دیا کہ گھروں میں ٹھہریں اور زمانہ جاہلیت کی طرح باہر نکل کر حسن و جمال کی نمائش نہ کرتی پھریں۔ امہات المومنین کا فرض اس معاملہ میں اوروں سے بھی زیادہ موکد ہو گا' جیسا کہ "لستن کاحد من النساء" کے تحت گزر چکا۔

باقی کسی شرعی یا طبعی ضرورت کی بنا پر بدون زیب و زینت کے مبتذل اور ناقابل اعتنا لباس میں مستتر ہو کر احیاناً باہر نکلنا' بشرطیکہ ماحول کے اعتبار سے فتنہ کا مظنہ نہ ہو' بلاشبہ اس کی اجازت نصوص سے نکلتی ہے۔ اور خاص ازواج مطہرات کے حق میں بھی اس کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی' بلکہ متعدد واقعات سے اس طرح نکلنے کا ثبوت ملتا ہے' لیکن شارع کے ارشادات سے بداہتہ" ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پسند اسی کو کرتے ہیں کہ ایک مسلمان عورت بہرحال اپنے گھر کی زینت بنے اور باہر نکل کر شیطان کو تاک جھانک کا موقع نہ دے۔" (فوائد عثمانی)

اسی طرح عورتوں کے نان و نفقہ کی کفالت و ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ ہی نے مردوں پر ڈالی ہے' جس کا اعتراف خود فاضل نیازی اس مضمون میں کر چکے ہیں' اب اس بدمذاقی کی کوئی حد ہے کہ قرآن کریم کے احکام منصوصہ کو (جو عین تقاضائے فطرت ہیں) "سماجی و معاشرتی جبر" کہہ کر ان کو پائے استحقار سے ٹھکرایا جائے' نیازی صاحب بتائیں کہ جس وقت قرآن کریم میں یہ احکام نازل کئے جا رہے تھے' اگر اس وقت آپ کا کوئی بھائی بند ان احکام کے بارے میں یہی فقرہ چست کرتا تو اس کا شمار کن لوگوں میں ہوتا؟ اور یہ بھی خوب رہی کہ آج کی عورت خود کماتی ہے' تعلیم یافتہ ہے' قابل ہے وغیرہ وغیرہ' لہٰذا قرآن کریم کے احکام کو "شریعت بنا کر عوام پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔" یعنی حافظ شیرازیؒ کے بقول چونکہ آج کی زلیخا پردۂ عصمت سے باہر آ چکی ہے' لہٰذا قرآن منسوخ ہو گیا' اور شریعت باطل ہو گئی ۔ نعوذ باللہ ۔ ایسی عقل و دانش کی بات نیازی صاحب جیسے

دانشوروں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔

یادش بخیر ڈاکٹر فضل الرحمٰن، جس کے ذمہ ایوب خان کے زمانے میں اسلام کی مرمت کا فرض سونپا گیا تھا، اس نے یہی "نیازی فلسفہ" پیش کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی عورتیں جاہل تھیں، اجڈ تھیں، ناشائستہ تھیں، اس لئے قرآن کریم نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر رکھا تھا، مگر آج کی عورت تعلیم یافتہ ہے، قابل ہے، مہذب ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس کی شہادت، مرد کے برابر نہ قرار دی جائے، اس بدتمیزی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا ایمان سلب ہو گیا۔ سنا ہے کہ وہ علانیہ کرسٹن ہو کر مرا، آج کوثر نیازی صاحب بھی ــــ لیلائے اقتدار کے عشق میں ــــ اسی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی مسند آج کوثر نیازی صاحب کے سپرد کر دی گئی ہے۔ کیا کوئی ہے جو نیازی صاحب کو خیرخواہانہ مشورہ دے کہ وہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔

اکیسواں مغالطہ : نیازی صاحب نے حدیث "الائمۃ من قریش" پر بھی گفتگو فرمائی ہے، موصوف کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر خلیفہ و حکمران ہونے کے لئے ہمارے "تمام علماء و فقہاء" قریشی النسل ہونے کو شرط لازم قرار دیتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس حدیث کو ایک پیشگوئی قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا کہ "حکمران قریش میں سے ہوں گے۔" ہمارے علماء نے اس کا ترجمہ یہ کیا کہ "حکمران قریش میں سے ہونے چاہئیں۔"

اس حدیث شریف پر مفصل بحث کی یہاں گنجائش نہیں کہ یہ ایک مستقل مقالہ کا موضوع ہے، مختصر یہ کہ حدیث کا صحیح مفہوم وہی ہے جو "تمام علماء و فقہاء" نے لیا، مولانا آزاد مرحوم کی طرف جو مفہوم نیازی صاحب نے منسوب کیا ہے (اگر یہ نسبت صحیح بھی ہو تو وہ بداہتہ) غلط ہے کیونکہ اول تو "تمام علماء و فقہاء" کے مقابلے میں مولانا

آزاد کا قول کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ دوسرے، یہ کہ "تمام علماء و فقہاء" کے قول کے مطابق یہ ایک حکم شرعی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، اب اگر امت اس حکم شرعی پر عمل کرتی ہے تو اس کی سعادت ہے، اور اگر امت اس حکم کے خلاف کرتی ہے تو امت لائق عتاب ٹھہرتی ہے، لیکن ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بخلاف اس کے اگر اس کو پیشگوئی قرار دیا جائے تو نیازی صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی، اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کا نعوذ باللہ غلط ہونا لازم آتا ہے، ظاہر ہے کہ امت کی طرف کوتاہی کو منسوب کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کو (نعوذ باللہ) جھوٹا کہنے سے اہون ہے، اگر نیازی صاحب کی اس نکتہ پر نظر ہوتی تو وہ "تمام علماء و فقہاء" کی تغلیط پر کمربستہ نہ ہوتے۔

بائیسواں مغالطہ : نیازی صاحب نے لاؤڈ اسپیکر، فوٹو، ٹیلی فون اور تعلیم نسواں کا حوالہ دے کر علماء کا خاکہ اڑایا ہے، جو شخص قرآن مجید کے احکام کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات طیبات کا، حضرات سلف صالحین، ائمہ مجتہدین اور "تمام فقہائے امت" کا مذاق اڑاتا ہو، اگر وہ اپنے دور کے علماء کے خاکے اڑائے تو اس کی کیا شکایت کی جائے؟ تاہم نیازی صاحب سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے داناؤں کا قول "لحوم العلماء مسمومة" (علماء کا گوشت زہر آلود ہوتا ہے) ضرور سنا ہوگا، آپ علماء کا تمسخر ضرور اڑائیں، مگر یہ نہ بھولیں کہ یہ: ہر جس شخص کے رگ و پے میں سرایت کر جائے وہ دنیا سے ایمان سلامت نہیں لے جاتا۔ علاوہ ازیں وہ خود اپنا شمار بھی اسی طائفہ میں کرتے ہیں، اور ان کے نام کے ساتھ "مولانا" کا سابقہ لگا رہتا ہے۔ "جس برتن میں کھانا، اسی میں موتنا" عقلمندوں کا شیوہ نہیں۔

تئیسواں مغالطہ : خالص علمی مضامین کے ثبوت میں لطیفے اور چٹکلے پیش کرنا جناب نیازی صاحب کا جدید طرز استدلال ہے، اس لئے اہل علم کا مذاق اڑانے کے لئے وہ

اپنے قارئین کو چند لطیفوں سے بھی محظوظ فرماتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

پہلا لطیفہ : "ایک وقت تھا کہ لاؤڈ اسپیکر حرام تھا، اب امام صاحب، پانچ آدمی بھی بیٹھے ہوں تو لاؤڈ اسپیکر آن کئے بغیر درس ارشاد نہیں فرماتے۔"

موصوف کے اس ارشاد کی حیثیت محض ایک لطیفہ اور بزلہ سنجی کی ہے، تاہم اس میں بھی انہوں نے جھوٹ کا نمک مرچ لگانا مناسب سمجھا۔ موصوف کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر وعظ و ارشاد کو اہل علم نے کبھی "حرام" نہیں فرمایا۔ اس لئے ان کا یہ لطیفہ محض "کذب ملیح" کی حیثیت رکھتا ہے۔

ثانیاً : ان کی خدمت میں عرض ہے کہ کسی علمی مسئلہ میں تحقیق کے بدل جانے کی وجہ سے اہل علم کی رائے بدل جانا ایسی بات نہیں کہ اس کو بزلہ سنجی کا موضوع بنایا جائے، یہ اہل علم کی سنت مستمرہ چلی آتی ہے، امام شافعیؒ نے بیشتر مسائل میں قول قدیم کے خلاف قول جدید اختیار فرمایا، جس سے اہل علم واقف ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں بہت کم مسائل ایسے ہوں گے جن میں ان سے دو دو تین تین روایتیں منقول نہ ہوں۔ ہمارے امام اعظم ابو حنیفہؒ سے بھی بہت سے مسائل میں متعدد روایات منقول ہیں، بعض مسائل کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت امامؒ نے وفات سے چند دن پہلے ان سے رجوع فرمالیا تھا۔ الغرض اہل علم کی رائے بدل جانا ایسی چیز نہیں کہ چٹخارے لے کر آپ اس کا مضحکہ اڑائیں، یہ تو اہل علم کی سنت مستمرہ ہے کہ برسہا برس تک جس قول پر فتویٰ دیتے رہے تحقیق حق کے بعد اس سے بلا تکلف رجوع فرمالیا، جناب کوثر نیازی صاحب اس نکتہ سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ اگر بالفرض لاؤڈ اسپیکر کے مسئلہ میں علماء کی تحقیق بدل گئی تو یہ بات محل اعتراض نہیں، لیکن چونکہ ان کا مقصود ہی اہل علم کے ساتھ ٹھٹھول کرنا ہے، اس لئے انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جو کچھ ان کی زبان و قلم سے نکل رہا ہے وہ کوئی خلاف واقعہ تو نہیں؟ اور جس چیز کو وہ ہنسی مذاق کا نشانہ بنا رہے ہیں وہ لائق اعتراض بھی ہے یا نہیں؟

ثالثاً : جناب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے مسئلہ میں اہلِ علم کا فتویٰ تبدیل نہیں ہوا' بلکہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز کے بارے میں فنی ماہرین کی رائے تبدیل ہوئی' نماز میں اقتدا کا اصول یہ ہے کہ امام کی (یا اس کے نائب مکبر کی) آواز پر رکوع و سجدہ کرنا صحیح ہے۔ لیکن اگر امام کی آواز کسی دیوار یا پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آئے اور مقتدی کے کان تک پہنچے تو اس صدائے بازگشت کی اقتدا مقتدی کے لئے جائز نہیں' اگر کرے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

جب لاؤڈ اسپیکر ایجاد ہوا تو اہل علم نے فنی ماہرین سے دریافت کیا کہ اس کے ذریعہ آنے والی آواز آیا بعینہ بولنے والے کی آواز ہے یا اس کی صدائے بازگشت ہے؟ فنی ماہرین نے بتایا کہ یہ اصل آواز نہیں بلکہ "صدائے بازگشت" قسم کی چیز ہے۔ اس پر اہل علم نے فتویٰ دیا ـــ اور بالکل صحیح فتویٰ دیا ـــ کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر مقتدی کے انتقالات (رکوع و سجود وغیرہ) صحیح نہیں' نماز فاسد ہو جائے گی' لیکن بعد میں فنی ماہرین کی تکنیکی رائے بدل گئی' اور انہوں نے پہلی رائے کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز بعینہ بولنے والے کی آواز ہے' جس کو آلہ مکبر الصوت دور دور تک پہنچا دیتا ہے۔ اس پر مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس مفتی محمد شفیعؒ نے فتویٰ دیا کہ اگر یہ صورت ہے تو نماز اس پر جائز ہے' اور دیگر اکابر علماء نے اس فتویٰ کی تصدیق کی۔ چنانچہ اس کی پوری شرح و تفصیل حضرت مفتی صاحبؒ کے رسالہ "آلہ مکبر الصوت" میں موجود ہے۔ اب انصاف فرمایئے کہ جناب نیازی صاحب کا علماء کا مضحکہ اڑانا کہاں تک صحیح ہے؟ یہاں فتوے کی تبدیلی کی مثال تو ایسی ہوئی کہ ایک شخص مفتی صاحب کے پاس ایک واقعہ نقل کرتا ہے' اور دوسرا شخص اس کے بالکل برعکس صورت مسئلہ پیش کرتا ہے' کھلی بات ہے کہ مفتی کا جواب دونوں سوالوں کے بارے میں یکساں نہیں ہوگا' اسی طرح لاؤڈ اسپیکر کے بارے میں جیسی صورت اہل علم کے سامنے پیش کی گئی' اس کے

مطابق انہوں نے فتویٰ دیا۔ فرمایئے! جناب نیازی صاحب مذاق اڑانے کی کیا گنجائش رہی؟

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

دوسرا لطیفہ : "ایک دور میں (بلکہ مسئلہ کی حد تک تو اب بھی) فوٹو کو حرام قرار دیا جاتا تھا' اب جب تک پریس کانفرنس میں فوٹو گرافر نہ پہنچ جائیں' حضرت مولانا صاحب لب کشا نہیں ہوتے۔"

نیازی صاحب کو اعتراف ہے کہ اہل علم فوٹو کو اب بھی حرام سمجھتے ہیں۔ اب اگر ان کے بقول "جب تک پریس کانفرنس میں فوٹو گرافر نہ پہنچ جائیں' حضرت مولانا صاحب لب کشا نہیں ہوتے" تو یہ ان مولانا صاحبان کی بے عملی یا بدمذاقی ہے' کیا اس کی آڑ لے کر مطلقاً علماء کی عزت سے کھیلنا نیازی صاحب کے لئے حلال ہو گیا؟ نیازی صاحب جانتے ہیں کہ کسی مجرم کی قانون شکنی کو حوالے کے طور پر پیش کرنا اور اس کی وجہ سے قانون کا یا قانون کے ماہرین کا یا قانون پر عمل کرنے والوں کا مذاق اڑانا صحت مندانہ فکر کی علامت نہیں' اور اگر ان کا مقصد اس قانون شکنی کے ذریعہ حضرات اہل علم کی تضحیک ہے تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ چند "مولانا صاحبان" ہی نہیں' بلکہ امت کی غالب اکثریت قانون شکنی کی مرتکب ہے۔ اللہ و رسولؐ کی ہزاروں نافرمانیاں ..... بغیر کسی روک ٹوک کے ..... ہم میں سرایت کر چکی ہیں' اور انہی "اجتماعی جرائم" کا نتیجہ ہے کہ خدا کے قہر کی لاٹھی نے ہم پر ایک عورت کو حکمران بنا کر مسلط کر دیا ہے' جس کی وجہ سے ہم بطن الأرض خیر لکم من ظهرها کا مصداق بن چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں' اور ہمارے گناہوں کو معاف فرمائیں' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا امت کی بے عملی کی وجہ سے اللہ کی شریعت کو بدل دیا جائے؟

اور اگر نیازی صاحب کا مقصود یہ بتانا ہے کہ "حرمت تصویر" کے بارے میں حضرات علماء کرام کا فتویٰ غلط ہے تو ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ جناب کی غلط فہمی ہے' "حرمت تصویر" کے مسئلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے اکابر بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اپنا رسالہ "التصویر لاحکام التصویر" ان کو بھجوایا تو ان کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ اور یہ ان بزرگوں کی حق پرستی تھی کہ انہوں نے برملا اپنی غلطی کا اعتراف فرمایا۔ ۱۹۴۵ء میں پرویز نے طلوع اسلام میں تصویر کے جواز پر ایک مضمون لکھا' جس میں مولانا آزاد اور مولانا ندوی کا بھی حوالہ دیا گیا تھا' اس پر مولانا عبدالماجد دریا بادی نے "صدق جدید" میں "تصویر اور شریعت اسلامی" کے عنوان سے ایک شذرہ لکھا' یہ شذرہ حال میں حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی نے بینات کراچی (نومبر ۱۹۹۳ء) میں شائع کرایا ہے' نیازی صاحب کی خدمت میں اس کو پیش کرتے ہوئے استدعا کرتا ہوں کہ وہ بھی ان دونوں بزرگوں کی طرح حق پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے موقف پر نظر ثانی کریں' مولانا دریا بادی کا شذرہ حسب ذیل ہے:

تصویر اور شریعت اسلامی

" دہلی سے ایک ماہنامہ "قوم" نکلتا ہے اس کے جنوری نمبر میں رسالہ طلوع اسلام دہلی کے حوالہ سے مولانا سید سلیمان کے ایک بہت پرانے مضمون کا ملخص جو تصویر کشی سے متعلق ہے شائع ہوا ہے اور طلوع اسلام نے خود بھی جواز تصویر کشی کی تائید کی ہے۔

کوشش سخت افسوس ناک اور مغالطہ آمیز ہے' سید صاحب کا وہ مضمون آج سے ۲۶'۲۵ سال قبل ۱۹۱۹ء کا لکھا ہوا ہے' اس وقت ان کی تحقیق اس باب میں کامل اور اجتہاد اس مسئلہ میں صائب نہ تھا۔ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے فاضل اور محقق کا اجتہاد اپنی عمر اور علم کے ہر دور میں یکساں صائب رہا ہے؟ سن کے اضافہ اور فکر و نظر کی پختگی نے سید صاحب کو اپنی رائے کی نظر ثانی پر مجبور کر دیا' اور جنوری ۱۹۴۳ء کے "معارف"

میں حق پسندی کی جرات کے ساتھ "رجوع و اعتراف" کے زیر عنوان انہوں نے اپنے مسلک سے رجوع کا اعلان شائع بھی فرمادیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان کا اتنا قدیم مضمون ریسرچ سے کام لے کر ڈھونڈھ نکالا جائے اور ان کے تازہ اعلان سے یوں اغماض برتا جائے۔

سید صاحب کے اس رجوع نامہ کے ساتھ بہتر یہ ہو گا کہ مولانا ابوالکلام کا بھی یہ دلیرانہ اعلان پیش نظر رہے:

"تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شائع کرنا سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی تھی اور الہلال کو باتصویر نکالا تھا۔ اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں۔ میری پچھلی غلطیوں کو چھپانا چاہئے نہ کہ از سر نو تشہیر کرنا چاہئے۔" (تذکرۂ ابوالکلام ص ۸)

"حدیث نبویؐ میں سخت وعیدیں تصویروں اور مصوروں کے باب میں آئی ہیں۔ ان کے استحضار کے بعد مشکل ہی سے کسی متدین و متقی مسلمان کو جرات فتویٰ جواز کی ہو سکتی ہے، اور یہ استدلال تو بالکل ہی بودا ہے کہ وہ احکام دستی تصویروں کے متعلق ہیں نہ کہ فوٹو کے۔ دونوں قسمیں بہرحال تصویر ہی کی ہیں، جاندار کے پائدار نقش کی ہیں، اصل کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، اور شرعی حکم دونوں کے حق میں اسی طرح یکساں ہے، جیسے دیہات کی ہاتھ کی بنائی ہوئی "دارو" (شراب) اور ولایت کے آلات سے کشید کی ہوئی اعلیٰ درجہ کی مقطر شراب انگوری یا اسپرٹ کے حق میں یکساں۔

مولانا احمد علی لاہوری (خدام الدین) کے مختصر رسالہ "فوٹو کا شرعی فیصلہ" کے آخر میں امتناع تصویر کشی پر تائیدی تحریریں علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے نامور فاضلوں کی شامل ہیں، اور سب سے زیادہ قابل اعتماد قابل مطالعہ تحریر اس باب میں مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کا رسالہ "التصویر فی احکام التصویر" ہے۔ ادارۂ "ترجمان" ازراہ کرم اس کا ضروری مطالعہ کرے۔

' فرنگی تمدن کہنا چاہئے کہ تمام تر تصویری تمدن ہے اور ہم لوگوں میں فوٹو گرافی کا شوق یا اس کی وقعت و عزت تمامتر فرنگی تہذیب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ آج فرنگستان کروڑوں نہیں اربوں روپیہ ہر سال جو تصویروں پر بے تحاشا صرف کر رہا ہے اور اپنے اخلاق اور فکری قوت دونوں کو اس ذریعہ سے تباہ کر رہا ہے اس کی داستان جس قدر طویل ہے اسی قدر عبرت انگیز ہے۔ حیف ہے کہ ہم بجائے اس سے عبرت حاصل

کرنے کے التااسی کو اپنے لئے دلیل راہ بنالیں؟ تصویر کشی، نقاشی اور مجسمہ سازی کو ہندو تہذیب، بدھسٹ تہذیب، غرض ہر قدیم جاہلی تہذیب میں جس قدر قریب کا تعلق ایک طرف شرک و بت پرستی سے اور دوسری طرف فسق و فحش کاری سے رہا ہے اس کا کچھ اندازہ آج بھی غار ایلورا، غار اجنتا کی دیواری تصویروں کے مشاہدہ سے ہو سکتا ہے۔ شریعت اسلامی کی گہری، حکیمانہ نظر نے چن چن کر تہذیب جاہلی کے ایک ایک شعار، ایک ایک یادگار کو مٹایا ہے۔ (صدق لکھنؤ ۱۶ر جنوری ۱۹۴۵ء)

تیسرا لطیفہ : "اور تو اور جب شروع شروع میں شاہ سعود نے اپنے ہاں ٹیلی فون لگوایا تو علماء و شیوخ نے کہا یہ حرام ہے، اس میں تو شیطان بولتا ہے، ایک دن شاہ سعود نے آپریٹر سے کہا دوسری طرف تلاوت قرآن لگا کر میرے دربار میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجا دو، تعمیل ہوئی تو شاہ نے سب سے بڑے شیخ سے کہا سنئے ٹیلی فون سے کیا آواز آرہی ہے، شیخ نے سنا تو کہا ارے یہ تو کلام الٰہی نشر کرتا ہے، اور اس دن سے سعودی عرب میں ٹیلی فون حلال ہو گیا۔"

نیازی صاحب کے اس لطیفہ سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

ایک یہ کہ حضرت کی عنایات بے پایاں صرف پاکستان کے "مولویوں" تک محدود نہیں، بلکہ عرب و عجم کے اکابر علماء و مشائخ جناب کی فیاضیوں سے یکساں بہرہ ور ہیں۔

دوسرے یہ کہ حضرت کی بڑی شہرت، ایک ادیب، ایک صحافی، ایک "مولانا" ایک موقع شناس سیاست کار کی حیثیت سے تھی، لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ فن افسانہ نگاری میں بھی آپ "بے نظیر" ہیں، شاہ سعود کے دور کے سعودی علماء و مشائخ کے بارے میں ان کی یہ افسانہ نگاری لائق آفرین ہے۔

تیسرے یہ کہ حق گوئی و بے باکی میں آپ کو وہ ید طولیٰ حاصل ہے کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا ادب و احترام ان کا راستہ نہیں روکتا، ان کے قلم سے نہ کسی مومن کو امان ہے، نہ کسی کافر کو، ان کا چھرا حلال و حرام کی تمیز کا روادار نہیں۔

چوتھے یہ کہ حدیث نبوی "کفی بالمرء کذبا أن یحدث بکل ما سمع" (آدمی

کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو آگے نقل کردے) پر آپ کا پورا عمل ہے۔ وہ مکہ و مدینہ کے علماء و مشائخ تک کی پگڑی اچھالنے کے لئے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ جس نے یہ کہانی ان سے بیان کی ہے وہ لائق اعتماد بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ یہ واقعہ شاہ سعود کے زمانے کا ہے یا ان کے والد بزرگوار ملک عبدالعزیز کے زمانے کا؟

اگر نیازی صاحب کے اس افسانہ طرازی کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو آخر وہ اس سے کیا ثابت کرنے جارہے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوگی وہ یہ کہ سعودی عرب کے "علماء و مشائخ" بڑے بھولے بھالے ہیں۔ جب تک کسی نوایجاد چیز کی حقیقت انہیں معلوم نہ ہو اس کے بارے میں بڑے محتاط رہتے ہیں۔ فرمایئے کہ یہ ان حضرات کی مدح ہوئی یا قدح؟

چوبیسواں مغالطہ : موصوف نے نہایۃ المحتاج شرح المنہاج کے حوالے سے شیخ الاسلام خیرالدین رملی کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ:

> "اگر لوگوں کے لئے ناگزیر ہو جائے کہ ان کی حکمران عورت ہو تو ضرورت کے تحت وہ حکمران بن سکتی ہے۔"

یہاں موصوف کو تین مغالطے ہوئے ہیں:

اول یہ کہ نہایۃ المحتاج شیخ خیرالدین رملی حنفی کی تالیف نہیں، بلکہ شمس الدین رملی شافعی کی تالیف ہے، موصوف کو نام میں التباس ہوا ہے۔ شیخ الاسلام خیرالدین رملی حنفی ہیں، اور "فتاویٰ خیریہ" کے نام سے ان کے فتاویٰ شائع ہوچکے ہیں، ۹۹۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی، اور ۱۰۸۱ھ میں ان کا وصال ہوا، نہایۃ المحتاج کے مولف شیخ شمس الدین محمد بن احمد بن حمزہ الرملی شافعی ہیں، جو "شافعی صغیر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، ان کی ولادت ۹۱۹ھ میں اور وفات ۱۰۰۴ھ میں ہوئی۔

دوم: نہایۃ المحتاج کے مولف شیخ شمس الدین رملی بھی عورت کی ولایت کے قائل

نہیں' چنانچہ قاضی کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

(وشرط القاضی) .... (ذکر) فلا تولی امرأة لنقصها ولاحتیاج القاضی لمخالطة الرجال وهی مأمورة بالتخدر والخنثٰی فی ذٰلك كالمرأة ولخبر البخاری وغیره «لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة».

(نہایۃ المحتاج شرح المنہاج ص۲۳۸ ج۸)

ترجمہ "اور قاضی کے شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد ہو' لہٰذا عورت کا قاضی بن جانا صحیح نہیں' کیونکہ اول تو اس میں فطری نقص ہے' (دین کا بھی اور عقل کا بھی) دوسرے' قاضی کو مردوں کے ساتھ اختلاط کی ضرورت پیش آئے گی' جب کہ عورت کو پردہ نشینی کا حکم ہے' تیسرے' صحیح بخاری اور دوسری کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث موجود ہے کہ "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی' جس نے حکومت عورت کے سپرد کردی۔"

سوم نہایۃ المحتاج کی جس عبارت سے موصوف نے یہ مسئلہ کشید کیا ہے کہ:

"اگر لوگوں کے لئے ناگزیر ہو جائے کہ ان کی حکمران عورت ہو تو ضرورت کے تحت وہ حکمران بن سکتی ہے۔"

یا تو موصوف نے اس عبارت کا مطلب ہی نہیں سمجھا' یا جان بوجھ کر ناواقف عوام کو دھوکا دیا ہے' موصوف کی غلط فہمی یا مغالطہ اندازی رفع کرنے کے لئے میں اس عبارت کو نقل کر کے اس کی وضاحت کئے دیتا ہے۔

نہایۃ المحتاج کے مصنف نے قاضی کے شرائط بیان کرنے کے بعد یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ اگر بادشاہ کی طرف سے ایسا قاضی مقرر کر دیا جائے جو منصب قضا کا اہل نہ ہو' مثلاً فاسق یا جاہل ہو تو ضرورت کی بنا پر اس کے فیصلے نافذ قرار دیئے جائیں گے' تاکہ لوگوں کے مصالح معطل ہو کر نہ رہ جائیں' اس کے تحت مصنف لکھتے ہیں:

ولو ابتلی الناس بولایة امرأة أو قن أو أعمی فیما یضبطه نفذ

قضاءه للضرورة كما أفتى به الوالد رحمه الله تعالى وألحق ابن عبد السلام الصبى بالمرأة ونحوها لا كافر.

(نهاية المحتاج ص۰ ٢٤ ج۸)

"اور اگر بالفرض لوگ مبتلا کردیئے جائیں عورت یا غلام یا اندھے کو قاضی بنائے کے ساتھ تو (باوجود اس کے) اس کا فیصلہ ضرورت کی بنا پر نافذ قرار دیا جائے تاکہ لوگوں کے مصالح معطل ہو کر نہ رہ جائیں) جیسا کہ والد مرحوم نے اس کا فتویٰ دیا تھا' اور حافظ عزالدین ابن عبدالسلام نے کہا ہے کہ عورت وغیرہ کی طرح بچے کا فیصلہ بھی نافذ العمل ہوگا' مگر کافر کا نہیں۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں بحث عورت کی حکمرانی کی نہیں' بلکہ بحث یہ ہے کہ بفرض محال اگر کسی بادشاہ نے کسی عورت کو یا کسی غلام کو' یا کسی اندھے کو قاضی بنادیا' اور اس کے سوا اس علاقے میں کوئی دوسرا قاضی نہیں جو لوگوں کے حقوق کا احیاء کرسکے تو آیا اندریں صورت ایسے نااہل قاضی کا فیصلہ نافذ العمل قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں مصنف نہایۃ المحتاج فرماتے ہیں کہ میرے والد مرحوم کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسی قاضی عورت کے فیصلے کو نافذ العمل قرار دیا جانا چاہئے' ورنہ لوگوں کے حقوق معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ تھا وہ مسئلہ جسے جناب کوثر صاحب نے یوں بگاڑا ہے کہ": اگر لوگوں کے لئے ناگزیر ہو جائے کہ ان کی حکمران عورت ہو تو ضرورت کے تحت اس کی حکمرانی جائز ہے۔"

اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ صاحب موصوف نے نہایۃ المحتاج کی عبارت کے سمجھنے میں تین غلطیاں کی ہیں:

اول : نہایۃ المحتاج کی عبارت میں "ولو ابتلی الناس" کا لفظ ہے' اہل علم جانتے ہیں کہ عربی میں حرف "لو" فرض محال کے لئے آتا ہے' اس لئے اس عبارت کا مفہوم یہ تھا کہ "اگر بالفرض لوگوں کو مبتلا کردیا جائے"' نیازی صاحب اس کا ہلکا پھلکا ترجمہ فرماتے

ہیں "اگر لوگوں کے لئے ناگزیر ہو جائے" ان دونوں تعبیروں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔

دوم : عبارت تھی "بولاینہ امراۃ او قن او اعمیٰ۔ فیما یضبطہ" یعنی "لوگوں کو مبتلا کردیا جائے کسی عورت، کسی غلام یا کسی اندھے کے قاضی بنائے جانے کے ساتھ" لیکن حضرت اس کا ترجمہ فرماتے ہیں "ان کی حکمران عورت ہو۔" قاضی اور "حکمران" کا فرق ہر اس شخص کو معلوم ہے جو اونٹ اور بکری کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

: مصنف نہایۃ المحتاج فرماتے ہیں کہ "اس ضرورت کے تحت کہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں، ان کا فیصلہ نافذ العمل قرار دیا جائے گا۔" نیازی صاحب اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "ضرورت کے تحت اس کی حکمرانی جائز ہے۔" کسی سے پوچھ لیجئے کہ "نفذ قضائہ" کا ترجمہ "عورت کی حکمرانی جائز ہے" کس لغت کے مطابق ہے؟ تعجب ہے کہ جن صاحب کی دیانت و امانت اور فہم و دانش کا یہ عالم ہے وہ "انا و لا غیری" کا ڈنکا بجاتا ہے، اور ائمہ مجتہدین کے اجماعی فیصلوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

پچیسواں مغالطہ : مقطع سخن پر موصوف فرماتے ہیں:

> "صاف بات ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا یا تو یہ قول رسولؐ نہیں ہے، اس کے راوی مشکوک ہیں، تاریخ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے۔
> یا پھر یہ پیش گوئی ہے جو صرف اس ایرانی قوم کے لئے تھی جو ایک خاص عورت کو حکمران بنا رہی تھی، راوی نے "القوم" کو "قوم" بنا کر اسے ہمیشہ کے لئے عام کردیا۔
> ان دو توجیہات کے علاوہ اس روایت کی کوئی اور شرح کرنا مذہب کے حق میں نادان دوستی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔"

گزشتہ مباحث سے واضح ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی، جس نے زمام حکومت عورت کے سپرد کردی۔" قطعاً

برحق ہے، عین صدق و صواب ہے، اور جناب کوثر صاحب کے تمام خدشات چاند پر خاک ڈالنے کے مترادف ہیں۔

موصوف کی یہ نکتہ آفرینی کہ یہ پیشگوئی صرف ایرانی قوم کے لئے تھی، راوی نے "القوم" کو "قوم" بنا کر حدیث کو عام کردیا، یہ بھی غلط ہے، کیونکہ "القوم" معرفہ ہے، اور "قوم" نکرہ ہے، بعد کا جملہ یعنی "ولوا امرھم امراۃ" نکرہ کی صفت تو بن سکتا ہے، معرفہ کی نہیں، یہ موصوف کی ایسی غلطی ہے جس کو علم نحو کا مبتدی بھی پکڑ سکتا ہے۔

رہا موصوف کا یہ ارشاد کہ ان کی ذکر کردہ دو توجیہات کے علاوہ حدیث کی کوئی اور شرح کرنا مذہب کے حق میں نادان دوستی ہے، اس کے بارے میں گزارش ہے کہ صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک کے اکابر امت نے حدیث شریف کا وہی مفہوم بیان فرمایا ہے، اس کو موصوف "نادان دوستی" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اگر آنجناب کے خیال میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین "مذہب کے نادان دوست" تھے تو ان کے مقابلہ میں آنجناب کی حیثیت "مذہب کے دانا دشمن" کی ٹھہرے گی، اب یہ تو آنجناب کی صوابدید پر منحصر ہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ اور بعد کے سلف صالحینؒ کی پیروی کو پسند فرمائیں گے، یا ان کے مقابلے میں دوسری حیثیت کو ترجیح دیں گے، تاہم اس ناکارہ کی خواہش یہ ہے کہ آنجناب بھی اسی رائے کو پسند فرمائیں جس کو اکابر امت نے اپنے لئے پسند فرمایا، خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک شخص کو نصیحت کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔ حضرتؒ کا یہ خط امام ابو داؤد نے کتاب السنہ میں نقل کیا ہے (اور یہ ناکارہ اسے اپنی کتاب "شیعہ سنی اختلافات" میں نقل کرچکا ہے) اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں:

فارض لنفسك ما رضى به القوم لأنفسهم، فإنهم على علم وقفوا، وببصر نافذ كفوا ولهم على كشف الأمور كانوا أقوى، وبفضل ما كانوا فيه أولى، فإن كان الهدى ما أنتم عليه لقد سبقتموهم إليه، ولئن قلتم إنما حدث بعدهم ما أحدثه إلا

من اتبع غیر سبیلهم ورغب بنفسه عنهم فإنهم هم السابقون.

(أبو داؤد ص ۶۳۳ ج ۲)

ترجمہ۔ "پس تم بھی اپنی ذات کے لئے وہی پسند کرو جو حضرات سلف صالحین نے اپنے لئے پسند کیا تھا' کیونکہ یہ حضرات صحیح علم پر مطلع تھے' اور وہ گہری بصیرت کی بنا پر ان چیزوں سے باز رہے' بلاشبہ یہ حضرات معاملات کی تہہ تک پہنچنے پر زیادہ قدرت رکھتے تھے' اور اس علم و بصیرت کی بنا پر جو ان کو حاصل تھی' ہم سے زیادہ اس کے مستحق تھے' پس اگر ہدایت کا راستہ وہ ہے جو سلف صالحین کے برخلاف تم نے اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگ ہدایت پانے میں ان حضرات سے سبقت لے گئے (اور یہ باطل ہے) اور اگر تم کہو کہ یہ چیز تو سلف صالحین کے بعد پیدا ہوئی تو خوب سمجھ لو کہ اس چیز کو انہی لوگوں نے ایجاد کیا ہے جو سلف صالحین کے راستہ سے ہٹ کر دوسری راہ پر چل نکلے' اور انہوں نے سلف صالحین سے کٹ جانے کو اپنے لئے پسند کیا' (اور یہی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے) کیونکہ یہ حضرات (ہر خیر و ہدایت کی طرف) سبقت کرنے والے تھے۔"

آخر میں جناب نیازی صاحب سے گزارش کروں گا کہ آپ نے مولانا مودودی کے نام اپنے خط میں جو تحریر فرمایا تھا کہ آپ نے اپنی مسجد میں سوالات کے جواب دیتے ہوئے سیکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدہ وضاحت کی تھی کہ شرعاً عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی اور اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ بھی آپ نے اخبارات کو بھجوادیا تھا' غالباً آپ کے کاغذات میں اس کی یادداشت ضرور محفوظ ہوگی' اگر آنجناب اس تحریر کو شائع کردیں (خواہ اخبارات میں' یا کتابچے کی شکل میں) تو یہ ایک "بڑا کام" ہوگا' ہو سکتا ہے کہ اس تحریر کی اشاعت کفارۂ سیئات بن جائے۔

اللهم وفقنا لما تحب و ترضاه من قولنا و عمل

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

جناب کوثر نیازی صاحب کے لطائف

۱۵ دسمبر ۹۳ء کے "جنگ" کراچی ایڈیشن میں "عورت کی حکمرانی کے مسئلہ" پر کوثر نیازی کا ایک مضمون پھر شائع ہوا ہے' جس کو دیکھ کر غالب کا شعر بے ساختہ یاد آیا:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے' کیا؟

یہ مضمون ایک تمہید اور چھ نکات پر مشتمل ہے' جس میں کسی معقول علمی بحث کے بجائے چند لطیفے اور چٹکلے ارشاد فرمائے گئے ہیں' نامناسب نہ ہو گا کہ قارئین ان کے لطیفوں سے محظوظ ہوں۔

تمہیدی لطائف

۱ - ارشاد ہوتا ہے:

"عورت کی حکمرانی پر میں نے اپنے ایک تیس سالہ پرانے مضمون کا اعادہ کیا کیا' گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا' یار لوگ قلم کے نیزے سنبھال کر اب تک اس خطاکار کو گھونپے ہی چلے جاتے ہیں۔"

یہ حضرت کی قدیم عادت شریفہ ہے کہ مسلمہ شرعی مسائل میں نئے نئے "اجتہاد" کا شوق فرمایا کرتے ہیں' اور اگر کوئی از راہ اخلاص ٹوکنے کی گستاخی کرے تو ٹوکنے والوں کو "بھڑوں کے چھتے" کا خطاب عطا فرمایا جاتا ہے۔

۲ - ارشاد ہوتا ہے۔ " حالانکہ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا۔"

سچ فرمایا' یہ کوئی بڑا مسئلہ تو کجا؟ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا' آپ قرآن کریم کو غلط تاویلات کے رندے سے چھیلتے رہیں' حدیث رسولؐ کی تکذیب فرماتے رہیں' مجتہدین امت کے اجماعی فیصلوں کو جھٹلاتے رہیں' اکابر امت کا مذاق اڑاتے رہیں'

مجبوری "بے نظیر" ہے' اور اہل علم کی مجبوری دین و شریعت کی صیانت و حفاظت ہے' الغرض "مجبوری" دونوں فریقوں کو لاحق ہے' یہ الگ بحث ہے کہ کس کی مجبوری کس نوعیت کی ہے؟

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کئے جاؤ میخوارو کام اپنا اپنا

پہلے نکتہ کے لطائف :

ا ۔ ارشاد ہے " عورت کی بادشاہت کی تائید کون کر رہا ہے؟"

لیکن حضرت بھول گئے' حدیث نبویؐ کو باطل کرنے کے لئے آپ نے قصے "بادشاہ خواتین" ہی کے سنائے تھے' یہ حدیث نبویؐ کے مقابلے میں "عورت کی بادشاہت" کی تائید نہیں تھی تو اور کیا تھا؟

۲ ۔ ارشاد ہے " ہم تو بحث ایک جمہوری ملک میں عورت کے وزیر اعظم ہونے کی کر رہے ہیں ۔۔۔۔ وزیر اعظم سربراہ حکومت ہوتا ہے' سربراہ ریاست یا سربراہ مملکت نہیں ہوتا۔"

اجی حضرت! ہماری گفتگو بھی اسی میں ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں ہو سکتی' جب آپ تسلیم کر رہے ہیں کہ جمہوری پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم حکومت کا سربراہ ہوتا ہے' وہی ملک میں حاکم اعلیٰ کہلاتا ہے' وہی حکومت کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے' انتظامی مشینری کی کل اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے' اور عرف عام میں بھی حکومت اسی کی سمجھی جاتی ہے تو اب ایسے بااختیار حاکم کو آپ بادشاہ کہہ لیجئے' صدر کہہ دیجئے' یا وزیر اعظم کہا کیجئے' الغرض کوئی سی اصطلاح اس کے لئے استعمال کریجئے' مدعا ایک ہے' یعنی بااختیار حاکم۔ اور شریعت کہتی ہے کہ مسلمانوں کی حاکم عورت نہیں ہو سکتی' لہذا عورت کو نہ بادشاہ بنانا صحیح ہے' نہ صدر' نہ وزیر اعظم' نہ گورنر' نہ وزیر اعلیٰ' نہ قاضی اور نہ کوئی اور حاکم۔ آپ بادشاہ' صدر اور وزیر اعظم جیسی خود ساختہ اصطلاحوں میں الجھ کر بلاوجہ پریشان ہوتے ہیں' حالانکہ داناؤں کا قول ہے:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

۲ - ارشاد ہے "حضرت تھانویؒ" کا فتویٰ ہے کہ "سلطنت جمہوری عورت کی ہو سکتی ہے' جو قسم ثالث ہے حکومت کی اقسام ثلثہ مذکورہ میں سے' اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے' اور عورت اہل ہے مشورہ کی' چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کے مشورے پر عمل فرمایا' اور ب کا انجام محمود ہوا۔"

حضرت" کا فتویٰ سر آنکھوں پر' مگر یاد ہو گا کہ حضرت" نے یہ فتویٰ بیگم بھوپال کے بارے میں دیا تھا' اس عفت مآب نے اپنا مدار المہام نواب صاحب کو بنا دیا تھا' خود پردہ نشین رہیں' اور نواب صاحب ان کے مشورے سے امور مملکت انجام دیتے رہے۔ آپ بھی اپنی ممدوحہ کو پردہ میں بٹھایئے' خود ان کے مدار المہام بن کر ان کے مشورے سے امور مملکت انجام دیجئے۔ حضرت تھانویؒ کے فتویٰ پر صحیح عمل ہو جائے گا' ایک عالم بھی اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔ لیکن موجودہ صورت حال میں (جبکہ آپ کی وزیراعظم مختار کل ہیں' اور "مردان کار" اس کے تابع مہمل ہیں) خود سوچ لیجئے کہ حضرت تھانویؒ" کا فتویٰ آپ کو کیا کام دے گا؟ وہ تو الٹا آپ کے خلاف جاتا ہے' اور حضرت تھانویؒ نے جو حضرت ام سلمہؓ کے مشورے کا حوالہ دیا ہے' اس کو اپنی ممدوحہ پر چسپاں کرنا لائق تعجب ہے' کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ام سلمہؓ کو وزیراعظم بنا کر ملک کا نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا تھا؟

ہماری گزارش کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حضرت تھانویؒ کے فتویٰ پر عمل کرنا ہے تو "سیر" کو مشیر کے درجے میں رکھئے' ملک کے وزیراعظم کو مشیر کی حیثیت کوئی احمق سے احمق آدمی بھی نہیں دے سکتا' چہ جائے کہ اس کے لئے حضرت تھانویؒ جیسے حکیم الامت اور مجدد الملت کا حوالہ دیا جائے؟

دوسرے نکتے کے لطائف:

ارشاد ہوتا ہے:

"میں نے جان بوجھ کر ان صحابی (یعنی حضرت ابوبکرہؓ) کا ذکر نہیں کیا تھا کہ اس سلسلہ میں کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو' مگر اب بات چل نکلی تو عرض کروں گا کہ حضرت ابوبکرہؓ وہ صحابی ہیں جنہوں نے زنا کے مقدمہ میں گواہی دی تھی۔ مقدمہ پوری گواہیاں نہ ہونے کی وجہ سے خارج ہوگیا' حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرہؓ کو ان کے دوسرے دو ساتھیوں کے ہمراہ اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی' بعد میں انہوں نے حضرت ابوبکرہؓ سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ اپنے فعل پر توبہ کریں' مگر انہوں نے انکار کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ ان کی گواہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔"

اس عبارت میں چند لطائف ہیں:

۱ - اپنے پہلے مضمون میں آنجناب نے حدیث کے راوی اول حضرت ابوبکرہؓ کا نام لینا پسند نہیں کیا تھا' اور "راوی کہتا ہے" کے مبہم الفاظ سے ان کو "مجہول" ظاہر کرنے کی کوشش کی' اب ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تاکہ بدمزگی پیدا نہ ہو' گویا بدمزگی سے بچنے کے لئے راوی کے نام کو چھپانا (جس کو تدلیس کہتے ہیں) ضروری تھا۔

۲ - وہ بدمزگی کیا تھی؟ اس کا اظہار اوپر کے درج شدہ کے اقتباس سے ہو رہا ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ صحابی جناب کی نظر میں (نعوذ باللہ) اس درجہ کے فاسق تھے کہ حضرت عمرؓ ان کی شہادت بھی قبول نہیں فرماتے تھے' لہٰذا ان کی روایت سے جو حدیث نقل کی جاتی ہے اس کا کیا اعتبار؟

حالانکہ اہل سنت کا یہ اصول جناب کی نظر سے بھی گزرا ہوگا کہ "الصحابۃ کلھم عدول (صحابہؓ تمام کے تمام عادل اور ثقہ ہیں) یہ منطق اہل سنت میں سے کسی کو بھی نہیں سوجھی کہ حضرت ابوبکرہؓ کی روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا جائے' حافظ ابن حزمؒ

لکھتے ہیں:

ما سمعنا ان مسلما فسق ابابکرۃ' ولا امتنع من قبول شہادتہ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی احکام الدین (المحلی ص ۴۳۳ ج ۹)

ترجمہ": ہم نے نہیں سنا کہ کسی مسلمان نے حضرت ابو بکرہؓ کو فاسق قرار دیا ہو' یا دین کے احکام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی شہادت کے قبول کرنے سے انکار کیا ہو۔"

۳ - ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ حدیث "لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ" کو آپ اس بنا پر مسترد کرتے ہیں کہ اس حدیث سے حضرت ام المومنینؓ کی قیادت پر حرف آتا ہے (حالانکہ اول تو حضرت ام المومنینؓ "لشکر کی قیادت" کے لئے تشریف ہی نہیں لائی تھیں' بلکہ ان کی تشریف آوری کا مقصد مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان صلح کرانا تھا' یہ بات ان کے گوشہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ علاوہ ازیں ان کی قیادت پر متعدد صحابہؓ نے نکیر فرمائی' اور خود ام المؤمنینؓ کو بھی مدۃ العمر اس کا صدمہ رہا) لیکن اس حدیث کو مسترد کرنے کے لئے آپ ایک ایسے بے سروپا قصے کا سہارا لیتے ہیں جس سے ایک جلیل القدر صحابی کی شخصیت داغدار ہو جاتی ہے' سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے قلب میں عظمت صحابہؓ اتنی زیادہ ہے تو یہاں آپ کی ایمانی غیرت کو کیوں جوش نہیں آیا؟ اور آپ کی رگ حمیت کیوں نہیں پھڑکی؟ آپ کے ضمیر نے آپ کو کیوں ملامت نہیں کی کہ آپ نے بلا تکلف ایک ایسا قصہ نقل کر دیا جس سے تین جلیل القدر صحابہؓ کا فاسق و مردود الشہادت ہونا لازم آتا ہے؟

۴ - واقعہ یہ ہے کہ آپ جس قصہ کے سہارے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابو بکرہؓ (اور ان کے ساتھ ان کے دو بھائیوں کو کہ دونوں صحابی ہیں) فاسق اور مردود الشہادۃ قرار دے کر ان کی روایت کو مسترد کرنے چلے ہیں' یہ قصہ خود ہی مشکوک و مخدوش اور ساقط الاعتبار ہے' یہی وجہ ہے کہ کوفہ و بصرہ کے جلیل القدر تابعینؒ اور اکابر فقہاء و محدثینؒ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ' امام محمد بن سیرینؒ' امام

شعبیؒ، قاضی شریحؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور عراق کے دیگر جلیل القدر فقہاء و محدثین کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ بلکہ خود امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کا فتویٰ اس کے خلاف منقول ہے، اسی طرح حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور سید التابعین حضرت سعید بن مسیبؒ (جن کے حوالے سے یہ قصہ نقل کیا جاتا ہے) ان کا فتویٰ بھی بہ سند صحیح اس کے خلاف منقول ہے۔ اس قصہ پر شدید جرحیں کی گئی ہیں، اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ قصہ غلط اور مہمل ہے (تفصیل کے لئے اعلاء السنن جلد ۱۵ ص ۱۹۴ کی مراجعت کی جائے)۔

کیسا اندھیر ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی کو فاسق اور مردود الشہادت ثابت کرنے کے لئے ایسے مجروح قصے کا سہارا لیا جائے، اور ایک ایسی متفق علیہ حدیث کو، جس کی صحت تمام فقہاء و محدثین کے نزدیک مسلم ہے، اور جس کی صحت میں ایک متنفس کو بھی اختلاف نہیں، بلکہ طبقہ در طبقہ تمام اکابر امت کے درمیان متواتر چلی آتی ہے، ساقط الاعتبار قرار دینے کے لئے تنکوں کا سہارا لیا جائے؟

۵ ۔ اور اگر اس قصہ کو تسلیم کرنا ہی تھا تو لازم تھا کہ اس قصہ کی اصل حقیقت بھی نقل کر دی جاتی، جو امام العصر حافظ الدنیا مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی تقریر "فیض الباری" میں ذکر کی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے پابندی کے باوجود حضرت مغیرہؓ نے، جو بصرہ کے گورنر تھے، وہاں خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ حضرت ابو بکرہؓ کو اس کا علم نہیں تھا، انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو صبح کے اندھیرے میں اس خاتون کے گھر جاتے ہوئے دیکھا، جا کر دیکھا تو اس خاتون کے ساتھ مشغول تھے، انہوں نے اپنے تین ماں شریک بھائیوں (نافع بن حارث، شبل بن معبد اور زیاد بن سمیہ) کو بھی یہ موقع دکھلایا، یہ چاروں عینی شاہد گواہی دینے کے لئے حضرت عمرؓ کی عدالت میں پہنچے، پہلے تین بھائیوں نے شہادت ادا کر دی، زیاد کا نمبر آیا تو اس نے بات گول کر دی، اور صرف یہ کہا کہ "میں نے نامناسب حالت دیکھی۔" زیاد کے اس طرز عمل سے حضرت مغیرہؓ تو زنا کی حد

سے بچ گئے' لیکن پہلے تین گواہ "مجرم" بن گئے' اور ان پر حد قذف جاری ہوئی۔

اگر یہ چاروں گواہ گواہی دے دیتے تو حضرت مغیرہؓ دو گواہوں کی گواہی سے اس خاتون کے ساتھ اپنا نکاح ثابت کر دیتے' اور زنا کی سزا ان پر جاری نہ ہوتی' لیکن حضرت عمرؓ کے عتاب کا سامنا ان کو پھر بھی کرنا پڑتا' غالباً حضرت مغیرہؓ نے زیاد کو ایک مسلمان کی پردہ پوشی کی ترغیب دلا کر اس پر آمادہ کر لیا ہو گا کہ وہ مبہم شہادت پر اکتفا کرے' تاکہ اس تدبیر سے ان کے خفیہ نکاح کا راز بھی راز ہی رہے' اور وہ سزا یا عتاب سے بچ جائیں۔

الغرض حضرت ابو بکرہؓ اور ان کے دو بھائیوں نے (کہ تینوں صحابی ہیں) جو شہادت دی وہ ان کے علم کے مطابق صحیح تھی' اگرچہ تیسرے گواہ کی گول مول شہادت نے مقدمہ کی نوعیت تبدیل کر دی' اگر حضرت ابو بکرہؓ کو پہلے سے اس کا علم ہوتا تو کبھی شہادت کے لئے لب کشائی نہ کرتے' سزا جاری ہونے کے بعد ان کے دو بھائیوں نے غالباً یہ سمجھ لیا ہو گا کہ ان کو مغالطہ ہوا ہے' اس لئے انہوں نے حضرت عمرؓ کے کہنے پر توبہ کر لی' لیکن حضرت ابو بکرہؓ کو اپنی رؤیت پر عین الیقین تھا' انہوں نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا' کیونکہ شہادت سے رجوع کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ گویا انہوں نے ایک مسلمان پر ناحق زنا کی تہمت لگائی۔

یہ ہے واقعہ کی اصل نوعیت' جس سے نہ حضرت ابو بکرہؓ کی جلالت قدر پر کوئی حرف آتا ہے' اور نہ حضرت مغیرہؓ کی طرف نعوذ باللہ زنا کی تہمت منسوب کی جا سکتی ہے۔

الغرض حضرت ابو بکرہؓ کی شہادت اپنی جگہ برحق تھی' اس کے لئے نصاب شہادت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ان پر حکم شرعی کا نفاذ ہوا' مگر اس کے باوجود وہ مردود الشہادت نہیں ہوئے' صاحب روح المعانی آیت ان جاءکم فاسق کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"و کذا الحد فی شہادۃ الزنا' لعدم تمام النصاب لا یدل علی الفسق بخلافہ فی مقام القذف فلیحفظ۔"

ترجمہ ": اسی طرح اگر شہادت زنا میں نصاب شہادت پورا نہ کرنے کی وجہ سے

حد جاری کی جائے تو یہ فسق پر دلالت نہیں کرتی، بخلاف اس حد کے جو تہمت کی بنا پر لگائی جائے۔ خوب سمجھ لو۔"

مزید ارشاد ہے:

"حضرت ابو بکرہؓ سے ایک روایت خطبہ حجتہ الوداع کے باب بھی منقول ہے، جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کی صرف چھ سطریں ہیں، حالانکہ دوسری احادیث (اور ثابت شدہ احادیث) میں یہ خطبہ کئی صفحوں پر مشتمل ہے، اگر حضرت ابو بکرہؓ کی روایات کا پایہ استناد اتنا ہی بڑا ہے تو پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ بھی صرف چھ سطروں کا ماننا پڑے گا، جو ظاہر ہے کہ کوئی قبول نہیں کرے گا۔"

حضرت نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ حضرت ابو بکرہؓ کی چھ سطری روایت کے مستند ہونے سے باقی صحابہؓ کی احادیث کا غیر مستند ہونا کیسے لازم آیا، یا باقی صحابہؓ کی احادیث کے صحیح ہونے سے حضرت ابو بکرہؓ کی روایت کا مشکوک ہونا کیسے ثابت ہوا؟ مثلاً:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احادیث کی کل تعداد ۱۴۲ ہے، (٦ بخاری و مسلم دونوں میں، گیارہ صرف بخاری میں، ایک صرف مسلم میں، باقی دیگر کتابوں میں)۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کل روایات ۵۳۹ ہیں، (دس بخاری و مسلم میں نو صرف بخاری میں، پندرہ صرف مسلم میں، اور باقی دیگر کتابوں میں)۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صرف ۱۴٦ احادیث مروی ہیں۔ بخاری و مسلم میں، آٹھ صحیح بخاری میں، پانچ صحیح مسلم میں، اور باقی دیگر کتب میں)۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی روایات کل ۵۸٦ ہیں، (۲۰ صحیحین میں، نو صحیح بخاری میں، پندرہ صحیح مسلم میں، باقی دیگر کتابوں میں)۔

کیا یہاں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ "اگر خلفائے راشدینؓ کی روایت کا پایۂ استناد اتنا ہی اونچا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی کل تعداد بس اتنی ہے؟"

تیسرے نکتہ کے لطائف:

موصوف نے حدیث نبوی "لن یفلح قوم" کے مجروح ہونے پر ایک اور "شاندار ثبوت" پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ لاہور کے کسی ماہنامہ "کنز الایمان" میں دہلی کے پروفیسر مشیر الحق کا مضمون شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے اپنے استاد مولانا عبدالسلام قدوائی کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث اور اس وقت کے مشہور عالم مولانا حیدر حسن ٹونکی سے صحیح بخاری کا درس لے رہے تھے، دوران درس مولانا مرحوم کو اس حدیث پر اشکال ہوا، کتب خانے سے رجال کی مختلف کتابیں منگوائی گئیں۔

> "اور جب راویوں کی چھان بین کی گئی تو ان میں ایک حضرت ایسے بھی ملے، جن کے بارے میں متفقہ طور پر علمائے محققین اسناد نے لکھا ہے کہ وہ صاحب حضرت عائشہؓ کے خلاف باتیں گھڑ گھڑ کر پھیلانے کے شوقین تھے۔ اس لئے ان کی روایت کردہ ایسی حدیثوں کو قبول کرنے میں اتنی احتیاط برتنی چاہئے جن کا اثر حضرت عائشہؓ کی ذات پر پڑتا ہو۔"

یہ نکتہ چند نفیس لطائف پر مشتمل ہے:

۱ ـ ابھی تو دوسرے نکتے میں حضرت ابوبکرہؓ پر نزلہ گرایا جارہا ہے، اور ایک جلیل القدر صحابیؓ پر طعن کرکے "قبر کی روشنی" کا سامان کیا جارہا تھا، اور اب یکایک مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ کا نام لے کر حدیث کے راویوں میں سے "ایک حضرت" پر نوازش ہونے لگی اور یہ بات ابھی تک پردۂ راز میں ہے کہ یہ مشق ناز کس راوی پر ہو رہی ہے؟ کس کتاب کے حوالے سے ہو رہی ہے؟ اور جرح کا راوی کون ہے؟ حدیث صحیح کو ایسی خوش فعلیوں کے ذریعہ رد کردینا طرفہ تماشا ہے یا نہیں؟

۲ ـ مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ ذوالحجہ ۱۳۳۹ھ سے ذوالحجہ ۱۳۵۸ھ تک پورے انیس سال دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے شیخ الحدیث رہے، اس دوران ہزاروں اہل علم کو ان سے

تلمذ و استفادہ کا شرف حاصل ہوا ہو گا۔ کیسا عجیب لطیفہ ہے کہ حضرت مرحوم کی وفات (۱۳۶۱ھ) کے نصف صدی بعد یہ انکشاف کیا جارہا ہے کہ ندوہ کا "شیخ الحدیث" صحیح بخاری کی احادیث کو غلط سمجھتا تھا۔

۳۔ لطیفہ یہ کہ ایک طرف دعویٰ کیا جارہا ہے کہ حدیث کا ایک راوی ایسا ہے جو حضرت عائشہؓ کے خلاف باتیں گھڑ گھڑ کر پھیلانے کا شوقین تھا' اور اس کو "علمائے محققین اسناد کا متفقہ فیصلہ" بتایا جارہا ہے' دوسری طرف ندوہ کے شیخ الحدیث کی طرف یہ بات بھی منسوب کی جارہی ہے کہ:

> "لہٰذا ان کی روایت کردہ ایسی حدیثوں کو قبول کرنے میں اتنی احتیاط برتنی چاہئے جن کا اثر حضرت عائشہؓ کی ذات پر نہ پڑتا ہو۔"

یعنی تمام محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ راوی جھوٹا ہے' کذاب ہے' مفتری ہے' ام المومنینؓ کے خلاف جھوٹ گھڑ گھڑ کر پھیلانے کا شوقین ہے' اور جھوٹے افسانے تراش کر ام المومنینؓ کو بدنام کرتا ہے' لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث تلقین فرمارہے ہیں کہ ایسے کذاب' مفتری کی روایتوں کے قبول کرنے میں بس "اتنی احتیاط سے کام لیا جائے کہ حضرت عائشہؓ کی ذات پر اس کا اثر نہ پڑے۔" کیا ایسی لغو اور مہمل بات حدیث کے کسی معمولی طالب علم کے منہ سے بھی نکل سکتی ہے؟ چہ جائے کہ ایک مشہور محدث کی طرف اس کو منسوب کیا جائے؟

اس سے بڑھ کر لطیفہ یہ کہ اہل سنت کے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاریؒ اس کذاب اور مفتری کی حدیث کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" میں بار بار درج کرتے ہیں' اور ان کو اس کذاب کی خبر ہی نہیں ہوتی' حالانکہ وہ "رجال حدیث" کے حافظ' تاریخ صغیر و کبیر کے مصنف اور "علمائے محققین اسناد" کے سرتاج ہیں۔ پھر صحیح بخاری کی تالیف سے لے کر آج تک لاکھوں اکابر محدثین اور حفاظ حدیث نے اس کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا' نوے ہزار نفوس نے تو صحیح بخاری کا سماع خود امام بخاریؒ سے

کیا' ان لاکھوں حفاظ حدیث کو بھی معلوم نہ ہو گا کہ اس حدیث کا فلاں راوی بالاتفاق کذاب اور مفتری ہے' پھر سیکڑوں افراد نے صحیح بخاری کی شرحیں لکھیں' بعض نے اس کے رجال پر کام کیا' بعض نے اس کے دیگر متعلقات پر تالیفات کیں' مگر کسی کے خواب میں بھی یہ بات نہ آئی کہ اس حدیث کا فلاں راوی جھوٹا ہے' کذاب ہے' مفتری ہے' حضرت عائشہؓ کے خلاف جھوٹے افسانے تراشتا ہے' لاہور کے ایک ماہنامہ کو ایک پروفیسر کی طرف سے "الہام" ہوتا ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی "تمام محققین علمائے اسناد کے متفقہ فیصلے" کے مطابق کذاب تھا' اور ہمارے کوثر نیازی صاحب اس "الہام" پر ایمان لے آتے ہیں۔

چوتھے نکتہ کے لطائف:

نویں مغالطے کے ضمن میں موصوف کے خط بنام مودودی صاحب کا متن اور اس پر تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ موصوف اپنے نئے مضمون میں فرماتے ہیں کہ میں نے تو یہ لکھا تھا:

> "شرعاً عورت کسی صورت میں بھی صدر مملکت نہیں بنائی جاسکتی" صدر مملکت اور سربراہ حکومت میں فرق ہے۔ ایوب خان کے زمانے کی صدارت بادشاہت کے مترادف تھی' وہ کہاں؟ اور اس پارلیمانی دور کی وزارت عظمیٰ کہاں؟"

یہاں بھی چند لطیفے ہیں:

۱۔ جناب سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ شرعاً عورت صدر مملکت کیوں نہیں بن سکتی؟ قرآن و حدیث سے اس دعوے کی کیا دلیل اس وقت (جب آپ نے مودودی صاحب کو خط لکھا تھا) جناب کے ذہن میں تھی؟ جس دلیل سے جناب یہ ثابت کریں گے کہ "شرعاً عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی" اسی دلیل سے ثابت ہے کہ وہ "سربراہ حکومت" بھی نہیں بن سکتی۔

۲۔ نیز آنجناب سے یہ بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے کہ عورت شرعاً

صدر مملکت نہیں بن سکتی (اور آپ کے خیال میں ایوب خان کے زمانے کی صدارت' صدارت ہی نہیں' بلکہ اس سے بڑھ کر بادشاہت تھی) تو آپ نے مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لئے قرآن و حدیث کے حوالے کیسے دیئے تھے؟

۳ ۔ اگر آپ کے خیال میں مس فاطمہ جناح کی صدارت جائز تھی (حالانکہ شرعاً عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی) تو آپ نے مودودی صاحب کے نام اپنے خط میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کو اپنی زندگی کے تمام گناہوں سے بڑا گناہ کبیرہ کیوں قرار دیا تھا؟ اور اس گناہ پر اندیشہ سلب ایمان کا اظہار کیوں فرمایا تھا؟

۴ ۔ اور جس گناہ سے آپ اس خط میں توبہ کرچکے تھے' اب تیس سال پہلے خطبہ کا (جو مس فاطمہ جناح کی حمایت میں دیا تھا) بطور فخر حوالہ دے کر اسی گناہ کا اعادہ اب کیسے فرما رہے ہیں؟

پانچویں نکتے کا لطیفہ:

جناب نے اپنے مضمون (۲۵ر اکتوبر) کے آخر میں حدیث کی اصلاح کے لئے لقمہ دیا تھا کہ حدیث کا اصل لفظ "القوم" تھا' راوی نے اس کو "قوم" بنادیا' اس پر عرض کیا گیا کہ حضور! "القوم" کا لفظ معرفہ ہے' بعد کا جملہ اس کی صفت نہیں بن سکتا' یہ تو "قوم" (نکرہ) کی صفت بن سکتا ہے' اس پر فرماتے ہیں کہ:

"میں نے کب کہا تھا کہ "القوم" کے لفظ کے بعد عبارت تبدیل نہیں ہوگی۔"

صد شکر کہ یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح صحیح بخاری کی حدیث غلط ہے' اسی طرح نحویوں کا یہ قاعدہ بھی غلط ہے کہ بعد کا جملہ "القوم" کی صفت نہیں بن سکتا' لیکن اتنی کی اب بھی باقی رہی کہ بعد کی تبدیل شدہ عبارت کی جگہ حدیث کی اصل عبارت رقم فرمادی جاتی' تاکہ اہل علم کو جناب کا ادبی ذوق بھی معلوم ہو جاتا' اور وہ یہ فیصلہ کرسکتے کہ کیا ایسی مہمل عبارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہو سکتی ہے؟

غور فرمایئے کہ ایرانی قوم نے بھی کسی "خلیفہ وقت" کا انتخاب تو نہیں کیا تھا' بلکہ اپنے یہاں کے رائج نظام کے مطابق حکمران ہی کا انتخاب کیا تھا' اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے زمام حکومت ایک عورت کے سپرد کردی۔ اگر ایرانی قوم (مجوسی ہونے کے باوجود) اس حدیث کی زد سے نہ بچ سکی تو آپ (دعوائے مسلمانی کے باوجود) ارشاد نبویؐ کا مصداق کیوں نہ بنیں گے؟

ارشاد ہوتا ہے "جمہوری دور میں تو امیدوار مرد و عورت کی عقل (اور صلاحیت) کو دیکھا جائے گا' اگر عقل محترمہ بے نظیر کو حق تعالیٰ نے زیادہ دی ہے (اور نہیں تو اسے قاعدۂ مستثنیات ہی سے مان لیجئے) تو اس میں غریب ووٹروں کا کیا قصور؟"

اگر آنجناب کو اصرار ہے کہ آپ کی ممدوحہ' مخدومہ' محترمہ ذہانت و فطانت میں یکتا ہیں' عقل کُل ہیں' اور ان کی عقل خداداد کے مقابلہ میں پورے ملک کے مرد (بشمول آپ کے) بے عقل ہیں' کودن ہیں' نادان ہیں' طفل مکتب ہیں' تو چونکہ آنجناب کو محترمہ کی عقل کا بہتر تجربہ ہوگا' اس لئے ہمیں آپ کے تجربہ و مشاہدہ کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں' غالباً اسی عقل خداداد کا کرشمہ ہے کہ لغاری' مزاری' جیسے 'چھٹے' ٹوٹو' ٹوانے' قریشی' نیازی یعنی ملک کے بڑے بڑے جغادری اس کی زلف کے اسیر ہیں' اور اس کے دام ہمرنگ زمین کے صید زبوں ہیں۔ گویا درج ذیل حدیث نبویؐ کا مضمون آفتاب کی طرح پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

ما رایت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احداکن۔ (متفق علیہ' مشکوٰۃ ص ۱۳)

ترجمہ: "میں نے تم سے بڑھ کر کوئی ناقص العقل والدّین نہیں دیکھا جو اچھے خاصے ہوشیار اور سمجھ دار مردوں کی مت مار دے۔"

رہا یہ کہ ممدوحہ کی "زنانہ عقل" ملک و ملت کے حق میں کیا گل کھلائے گی؟ اس کا فیصلہ قاضی وقت کی عدالت میں ہے' اس کا بے لاگ فیصلہ بہت جلد سب کے سامنے آجائے گا۔ فانتظروا انا منتظرون۔ حق تعالیٰ شانہ اس امت پر رحم فرمائیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عورت اور مرد کا رتبہ

ایک سوال کا جواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم مولانا صاحب! السلام علیکم:

نفیس احمد رضوی صاحب نے اپنے دو کالموں بعنوان "مگر یہ مسئلہ زن" اور "آہ بیچارہ بیچارہ کے اعصاب" (جو مورخہ ۲۱ اور ۲۴ ستمبر کو جنگ میں شائع ہوئے) میں عورتوں کے معاشرتی مقام پر بحث کی ہے انہوں نے مولانا عمر احمد عثمانی کی تصنیف "فقہ القرآن" (جلد سوم) سے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں قرآنی حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ نہ عورت کی عقل ناقص ہے نہ ایمان!

بلاشبہ مرد و عورت کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ مگر اس فرق سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ "قوامون علی النساء" کے یہ معنی لینا کہ مرد عورت کے حاکم اور داروغہ ہیں۔ صحیح نہیں۔ ازروئے لغت قوام کے معنی معاشی کفیل کے ہیں۔ اور یقیناً مرد عورت کا معاشی کفیل ہوتا ہے۔ مرد کو عورت پر ازروئے قرآن کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مصنف نے عالمانہ بحث کے بعد (جو صرف قرآنی استدلال پر مبنی ہے) یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کی شہادت مرد کی طرح مستند۔ قابل قبول اور شرعی اعتبار سے درست ہے۔

آگے چل کر رقمطراز ہیں۔

"قرآن مجید کا خطاب ہر معاملے میں عورت اور مرد دونوں کی طرف یکساں ہے۔ عورت کی کمتری کی ایک طفلانہ دلیل یہ دی جاتی ہے۔ کہ قرآن مجید میں صالح مردوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ انہیں جنت میں حوریں ملیں گی۔ جب کہ عورت سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ مولانا عمر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ اس دعوے کی کمزوری یہ ہے کہ حور کے معنی ہیں سفید رنگ (عورتیں بھی سفید رنگ کی ہو سکتی ہیں۔ مرد بھی) تو سفید رنگ کے مرد کو بھی حور کہا جا سکتا ہے۔"

۲۴ ستمبر کے کالم میں رقمطراز ہیں۔

"قرآن کریم میں انسانیت کی ان دونوں صنفوں (یعنی مردوں اور عورتوں) میں کوئی فرق یا امتیاز نہیں رکھا گیا۔ دونوں کو ایک سطح پر رکھا ہے۔ مصنف نے ہر جگہ قرآنی استدلال کے ساتھ تاریخ اور روایات سے سند لی ہے۔ مرد کے بجائے عورت سربراہ خانہ ہے۔ کاروبار حکومت یعنی شوریٰ

میں بھی عورت کا مشورہ درست ہے اسی طرح حاصل کیا جانا چاہیئے جس طرح مردوں کا۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ عورتیں ایسی مشترک محفلوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ جن میں مرد موجود ہوں۔ شرط یہی ہے۔ کہ وہ اپنی زینت کی نمائش نہ کریں۔ پارلیمنٹ، اسمبلی اور مردانہ مجموں میں عورتیں تقریر کر سکتی ہیں۔ شرط یہی ہے کہ اسلامی ستر و حجاب کو ملحوظ رکھیں۔ وہ تنہا سفر کر سکتی ہیں۔ مصنف نے قرآنی دلائل سے اس مفروضے کو غلط ثابت کیا ہے۔ کہ عورت کی دیت، (خون بہا) مرد سے نصف ہوتی ہے۔ عورت قاضی (رج) کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ سیاسی تحریکوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ سربراہ مملکت بن سکتی ہے۔ شرعی پردے کے بارے میں مولانا عمر احمد عثمانی کی بحث فیصلہ کن ہے۔ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے عام مسلمان خواتین کو اس سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ

۱۔ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

۲۔ بے حیائی کی مرتکب نہ ہوں۔ زینت و آرائش جمال کی نمائش نہ کرتی پھریں۔ زیورات پہنے ہوں تو پیروں کو اسطرح زور سے نہ ماریں کہ گھنگھرو بجنے لگیں۔

۳۔ گھر سے باہر نکلیں تو جلباب (اوڑھنی) اوڑھ لیا کریں۔ مولانا عمر احمد عثمانی کا بیان ہے کہ ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے عہد مبارک میں عورتیں اپنے چہروں کو کھول کر خود بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ اور آپؐ نے کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا"

مولانا! یہ ہیں وہ مختصر سی باتیں جو زینیس امروہوی نے مولانا عمر احمد عثمانی کی ایک کتاب کو بنیاد بناتے ہوئے نقل کی ہیں۔ امید ہے کہ آپ مندرجہ ذیل سوالات کا قرآن اور حدیث کی روشنی میں جواب دے کر ان شکوک و شبہات کا ازالہ فرمائیں گے۔ جو مذکورہ مضامین پڑھ کر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے ہیں۔

سوال نمبر ۱۔ کیا واقعی قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں رکھا گیا۔

سوال نمبر ۲۔ کیا صلحا عورتوں کو بھی جنت میں حوریں (مرد، جیسا کہ مضمون میں کہا گیا ہے) ملیں گی۔

سوال نمبر ۳۔ کیا حضورؐ کے عہد میں عورتیں اپنے چہروں کو کھول کر خود بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوا کرتی تھیں اور آپ نے کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔

سوال نمبر۴۔ کیا مردانہ مجمعوں میں عورتیں تقریر کرسکتی ہیں۔

سوال نمبر۵۔ کیا عورت قاضی بن سکتی ہے۔ سیاسی تحریکوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اور سربراہ مملکت بن سکتی ہے۔

نیازمند

عبدالمجید راجپوت

این ای ای ڈی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی۔

الجواب

جناب عمر احمد عثمانی کے جو افکار سوال میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہ ان کے ذاتی خیالات ہیں۔ قرآن کریم، حدیث نبوی اور شریعت اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

قوام کے معنیٰ

عثمانی صاحب کے نزدیک تو قوامون علی النساء کے یہ معنیٰ کہ مرد حاکم ہیں۔ صحیح نہیں۔ مگر ان کے دادا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں آیت کریمہ "الرجال قوامون علی النساء" کا ترجمہ یہ کرتے ہیں:

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر۔ (دو وجہ سے ایک تو) اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (یعنی مردوں کو) بعضوں پر (یعنی عورتوں پر قدرتی) فضیلت دی ہے (یہ تو وہبی امر ہے) اور (دوسری) اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں، نان و نفقہ میں) خرچ کئے ہیں۔ (اور خرچ کرنے والے کا ہاتھ اونچا اور بہتر ہوتا ہے۔ اس سے جس پر خرچ کیا جائے۔ اور یہ امر مکتسب ہے۔) سو جو عورتیں نیک ہیں۔ (وہ مرد کے ان فضائل و حقوق کی وجہ سے) اطاعت کرتی ہیں۔۔۔۔"

اور عمر احمد عثمانی صاحب کے والد ماجد شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی نوراللہ مرقدہٗ "احکام القرآن" میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"قوام وہ شخص ہے جو دوسرے کے مصالح، تدابیر اور تادیب کا ذمہ دار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے کے دو سبب ذکر کئے ہیں۔ ایک وہبی، دوسرا کسبی چنانچہ ارشاد ہے "اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے" یعنی مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ اصل خلقت میں۔ کمال عقل میں۔ حسن تدبیر میں۔ علم

وجسم کی فراخی میں، اعمال کی مزید قوت میں اور بلندیٔ استعداد میں۔ یہی وجہ ہے کہ مردوں کو بہت سے ایسے احکام کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ جو عورتوں سے متعلق نہیں۔ مثلاً نبوت، امامت، قاضی اور جج بننا، حدود و قصاص وغیرہ میں شہادت دینا۔ وجوب جہاد، جمعہ، عیدین۔ اذان، جماعت، خطبہ۔ وراثت میں حصہ کا زائد ہونا۔ نکاح کا مالک ہونا۔ طلاق دینے کا اختیار، بغیر وقفے کے نماز روزے کا کامل ہونا۔ وغیر ذالک۔ یہ امر تو وہبی ہے۔ پھر فرمایا: اور اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں کے نکاح میں) اپنے مال خرچ کئے ہیں۔ یعنی مہر اور نان و نفقہ اور یہ امر کسبی ہے۔"

(احکام القرآن ج ۲۔ ص ۱۷۶)۔

اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے اس آیت کی شان نزول میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بیوی کے طمانچہ مار دیا تھا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے اسے شوہر سے بدلہ لینے کی اجازت دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے: "یقومون علیھن قیام الولاۃ علی الرعیۃ مسلطون علی تادیبھن"۔ یعنی مرد عورتوں کے مصالح کے ذمہ دار ہیں۔ جس طرح حکام رعیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور ان کو، عورتوں کی تادیب پر مقرر کیا گیا ہے۔" (حوالہ گزشتہ)

اس سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور بزرگان امت نے تو آیت "قوامون علی النساء" کا یہی مطلب سمجھا ہے کہ مرد کی حیثیت حاکم کی ہے۔ اور وہ صرف عورت کا معاشی کفیل نہیں۔ بلکہ اس کے دین و اخلاق کی نگرانی کا ذمہ دار اور اس کی تادیب پر مامور بھی ہے۔

مرد کی عورت پر فضیلت

مرد و عورت کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے فطری تفاوت رکھا ہے۔ اور ہر ایک کو ان صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا ہے جو اس کے فرائض کے مناسب حال ہیں۔ مردوں کے اوصاف عورتوں میں نہیں۔ نہ عورتوں کے اوصاف مردوں میں ہیں۔ کسی فرد کی فضیلت عنداللہ کا مدار صلاح و تقویٰ پر ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے بہت سے امور میں مرد کی صنف کو عورت کی صنف پر فوقیت عطا فرمائی ہے جن کا ذکر اوپر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے حوالے سے گزر چکا ہے ـــــــ دو جگہ اللہ تعالیٰ نے عورت پر مرد کی فضیلت کی صراحت فرمائی ہے۔ ایک تو یہی گزشتہ بالا آیت جس میں "بما فضل اللہ بعضھم علی بعض" کی تصریح ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اور دوسری اسی سورۃ النساء کی آیت ۳۲ ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ "ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم

علی بعض" حضرت حکیم الامت ؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے :-

"اور تم (سب مردوں اور عورتوں کو حکم ہوتا ہے کہ فضائل وہبیہ میں سے) ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (مثلاً مردوں کو) بعضوں پر (مثلاً عورتوں پر بلا دخل ان کے کسی عمل کے) فوقیت بخشی ہے۔ (جیسے مرد ہونا۔ یا مردوں کا دونا حصہ ہونا۔ یا ان کی شہادت کا کامل ہونا وغیر ذالک)"۔

اور حضرتؒ نے اس کی شان نزول میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ:-

"حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کو آدھی میراث ملتی ہے ... ی خدا فلاں فلاں فرق ہم میں اور مردوں میں ہے) مطلب اعتراض نہ تھا۔ بلکہ یہ تھا کہ اگر ہم بھی مرد ہوتے تو اچھا تھا۔ ... اس پر آیت نازل ہوئی"۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فطری فوقیت و فضیلت دی ہے۔ اور بہت سے احکام شرعیہ میں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے مگر جناب عمر احمد عثمانی کو اس مسئلہ میں اللہ میاں سے اختلاف ہے۔

مرد و عورت کے درمیان فرق و امتیاز

موصوف کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم میں مرد و عورت کے درمیان کسی سطح میں کوئی فرق و امتیاز نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ہر جگہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے یہ ایک ایسی غلط بیانی ہے جسے ایک عام آدمی بھی، جو قرآن کریم سے کچھ مناسبت رکھتا ہو واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے، دونوں کے درمیان فرق مراتب کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

۱۔ قرآن کریم نے عورت کو مرد کی فرمانبرداری کا حکم فرمایا ہے اور اسی کو شریف اور نیک بیبیوں کی علامت قرار دیا ہے۔ "فالصالحات قانتات" (النساء) جب کہ مردوں کو عورتوں کی اطاعت و فرمانبرداری کا نہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے۔ "وعاشروھن بالمعروف" (النساء) اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو حاکم اور گھر اور ریاست کا سربراہ اور افسر اعلیٰ بنایا ہے اور عورت کو اس کی ماتحتی میں رکھا ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے عورت کا حصۂ وراثت مرد سے نصف رکھا ہے "للذکر مثل حظ الانثیین" چنانچہ لڑکے کا حصہ لڑکی سے باپ کا حصہ ماں سے شوہر کا حصہ بیوی سے اور بھائی کا حصہ بہن سے دوگنا ہے۔

۳۔ قرآن کریم نے عورت کی شہادت مرد سے نصف رکھی ہے "فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان م

۴۔ قرآن کریم نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے۔ اور اگر عورت کو کسی بدقماش شوہر سے پالا پڑے اور وہ اس سے گلوخلاصی چاہتی ہو تو اس کے لئے "خلع" کی صورت تجویز فرمائی ہے۔ جو یا تو بتراضی طرفین ہوسکتا ہے۔ یا بذریعہ عدالت۔

۵۔ قرآن کریم نے مرد کو بیک وقت چار تک نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور اسے پابند کیا ہے کہ وہ متعدد بیویوں کی صورت میں ان کے درمیان عدل ومساوات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا۔ لیکن عورت کو ایک سے زیادہ شوہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔

ان چند مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے۔ کہ قرآن کریم نے مرد وعورت کے درمیان فرق وامتیاز کو ہر سطح پر ملحوظ رکھا ہے۔ جسے کوئی مسلمان نظر انداز نہیں کرسکتا۔

عورت کی دیت

شریعت اسلام میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آئمہ اربعہ تک سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ ملک العلماء امام علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی "بدائع الصنائع" (۷۔ ۲۵۴) میں لکھتے ہیں۔

"فدیۃ المرأۃ علی النصف من دیۃ الرجل لاجماع الصحابۃ رضی اللہ عنہم فانہ روی عن سیدنا عمر وسیدنا علی وابن مسعود وزید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم انہم قالوا فی دیۃ المرأۃ انہا علی النصف من دیۃ الرجل ولم ینقل انہ انکر علیہم احد۔ فیکون اجماعا ولان المرأۃ فی میراثہا و شہادتہا علی النصف من الرجل فکذالک فی دیتہا"

ترجمہ:۔ "پس عورتوں کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے کیونکہ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ چنانچہ حضرات عمر، علی، ابن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ اور کسی صحابی سے یہ منقول نہیں کہ اس نے ان حضرات پر اس مسئلہ میں نکیر کی ہو لہٰذا یہ اجماع ہوا۔ اور عقلی دلیل یہ ہے کہ عورت کی وراثت وشہادت مرد سے نصف ہے۔ اسی طرح اس کی دیت بھی نصف ہوگی۔"

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی المالکی اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" (۵۔ ۳۲۵) میں لکھتے ہیں!

"واجمع العلماء علی ان دیة المرأة علی النصف من دیة الرجل قال ابوعمر وانما صارت دیتها. واللہ اعلم. علی النصف من دیة الرجل من اجل ان لہا نصف میراث الرجل، وشہادة امرأتین بشہادة الرجل"۔

ترجمہ:- "اور علماء کا اس پر اجماع ہے۔ کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ ابو عمر (ابن عبدالبرؒ) فرماتے ہیں کہ اس کی دیت مرد کی دیت سے نصف اس لئے ہوئی کہ عورت کا حصۂ وراثت بھی مرد سے نصف ہے۔ اور اس کی شہادت بھی مرد کی شہادت سے نصف ہے چنانچہ دو عورتوں کی شہادت مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہوتی ہے"۔

شرح مہذب کے تکملہ (۱۹- ۵۴) میں ہے۔

"دیة المرأة نصف دیة الرجل ھذا قول العلماء کافة الا الاصم وابن علیة فانہما قالا دیتہا مثل دیة الرجل ودلیلنا ما سقناہ من کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی اہل الیمن۔ وفیہ ان دیة المراة نصف دیة الرجل۔ وما حکاہ المصنف عن عمر وعثمان وعلی وابن مسعود وابن عمر وابن عباس وزید بن ثابت انہم قالوا دیة المرأة نصف دیة الرجل ولا مخالف لہم فی الصحابة فدل علی انہ اجماع"۔

ترجمہ:- "عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے یہ تمام علماء کا قول ہے۔ سوائے اصم اور ابن علیہ کے یہ دونوں صاحب کہتے ہیں کہ اس کی دیت مرد کی دیت کی مثل ہے ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ گرامی نامہ ہے۔ جو آپ نے اہل یمن کو لکھا تھا۔ اور جسے ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ اس میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ نیز جیسا کہ مصنف نے نقل کیا۔ حضرات عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ ابن عمرؓ، ابن عباسؓ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ارشاد ہے۔ کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے۔ اور صحابہ کرامؓ میں اس کے کوئی خلاف نہیں تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اس مسئلہ پر صحابہؓ کا اجماع ہے"۔

اور سیدی و مرشدی حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی، نور اللہ مرقدہ "اوجز المسالک" (۱۳ - ۲۸ طبع بیروت) میں فرماتے ہیں۔

قال ابن المنذر وابن عبدالبر اجمع اہل العلم علی ان دیة المرأة نصف دیة الرجل وحکی غیرہما عن ابن علیة والاصم انہما قالا دیتہا کدیة الرجل لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی النفس المؤمنة مائة من الابل۔ وھذا قول شاذ یخالف اجماع الصحابة وسنة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فان فی کتاب عمرو بن حزم

دية المرأة على النصف من دية الرجل وهى اخص مما ذكره فيكون مفسراً لما ذكره مخصصا له، ودية نساء كل اهل دين على النصف من دية رجالهم"

ترجمہ: "حافظ ابن منذر اور حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ بعض دوسرے حضرات نے ابن علیہ اور اصم سے نقل کیا ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن جان کے قتل کی دیت سو اونٹ ہے۔ اور یہ قول شاذ ہے جو اجماع صحابہؓ اور سنت نبویؐ کے خلاف ہے۔ چنانچہ عمرو بن حزم سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ مروی ہے۔ اس میں ہے کہ "عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے" اس میں چونکہ خصوصیت سے عورت کی دیت مذکور ہے، اس لئے یہ حدیث ان کی روایت کردہ حدیث کی شارح مخصص ہوگی۔ اور تمام اہل ادیان میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے"۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کی دیت کا مرد کی دیت سے نصف ہونا غلط مفروضہ" نہیں۔ بلکہ اسلام کا اجماعی مسئلہ ہے اور اس کا انکار آفتاب نصف النہار کا انکار ہے۔

مرد و عورت کی شہادت

موصوف کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ "عورت کی شہادت، مرد کی طرح مستند، قابل قبول اور شرعی اعتبار سے درست ہے"۔ لیکن اگر یہ مطلب ہے کہ مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں تو یہ غلط ہے، قرآن و سنت نے مرد و عورت کی شہادت میں چند وجہ سے فرق کیا ہے۔

۱۔ عورت کی شہادت مرد کی شہادت کا نصف ہے۔ یعنی دو عورتوں کی شہادت مل کر مرد کی شہادت کے قائم مقام ہوتی ہے۔

۲۔ مرد کی شہادت عورتوں کی شہادت کے لئے شرط ہے پس تنہا عورتوں کی شہادت مقبول نہیں ہوگی۔ جب تک کہ ان کے ساتھ کوئی مرد شہادت دینے والا نہ ہو الا یہ کہ وہ معاملہ ہی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہو کہ اس امر پر مردوں کا مطلع ہونا عادۃً ممکن نہیں۔ ان دونوں مسئلوں کو سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ کے ایک فقرے میں بیان فرمایا گیا ہے۔

"فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتن"۔ پھر اگر وہ گواہ مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جاویں) (بیان القرآن)

۳۔ حدود و قصاص میں صرف مردوں کی شہادت معتبر ہے۔ عورتوں کی نہیں۔ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد

عثمانی رحمہ اللہ نے احکام القرآن (۱-۵۰۲) میں نصب الرایہ (۲-۲۰۸) کے حوالے سے امام زہری کی حدیث نقل کی ہے:

"عن الزهری قال مضت السنة من رسول الله صلی الله علیه وسلم والخلیفتین بعده ان لا تجوز شهادة النساء فی الحدود والقصاص (رواه ابن ابی شیبه)"

حضرت زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے دو خلیفوں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے یہ سنت جاری ہے کہ عورتوں کی شہادت حدود و قصاص میں معتبر نہیں۔ (ابن ابی شیبہ)

عن الحکم ان علی بن ابی طالب قال لا یجوز شهادة النساء فی الحدود والدماء (اخرجه عبد الرزاق)۔

حکم سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عورتوں کی شہادت حدود و قصاص میں معتبر نہیں۔

خواتین کا گھر کے باہر نکلنا

عورتوں کے لئے اصل حکم تو یہ ہے کہ بغیر ضرورت کے گھر سے باہر قدم نہ رکھیں۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی آیت میں ازواج مطہرات رض کو حکم ہے۔ "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الاولی" "تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔ (مراد اس سے یہ ہے کہ محض کپڑا اوڑھ لپیٹ کر پردہ کر لینے پر کفایت مت کرو، بلکہ پردہ اس طریقے سے کرو کہ بدن مع لباس نظر نہ آوے جیسا آج کل شرفاء میں پردہ کا طریقہ متعارف ہے کہ عورتیں گھروں سے نہیں نکلتیں البتہ مواقع ضرورت دوسری دلیل سے مستثنیٰ ہیں۔ اور اسی حکم کی تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) پرانے جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو (جس میں بے پردگی رائج تھی۔ گو بلا فحش ہی کیوں نہ ہو۔ اور قدیم جاہلیت سے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک مابعد کی جاہلیت ہے کہ بعد تعلیم و تبلیغ احکام اسلام کے ان پر عمل نہ کیا جائے۔ پس جو تبرج بعد اسلام ہوگا وہ جاہلیت اُخریٰ ہے۔)"

(تفسیر بیان القرآن از حکیم الامت)

اس پر شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ حکم تو صرف ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن کے ساتھ خاص ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رح "احکام القرآن" میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں پانچ حکم دیئے گئے ہیں۔

۱۔ اجنبی لوگوں سے نزاکت کے ساتھ بات نہ کرنا۔ ۲۔ گھروں میں جم کر بیٹھنا۔ ۳۔ نماز کی پابندی کرنا۔ ۴۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔ (۵) اللہ تعالیٰ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام احکام عام ہیں۔ صرف ازواج مطہرات رض کے ساتھ مخصوص نہیں۔ چنانچہ تمام ائمہ مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ احکام سب

مسلمان خواتین کے لئے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ کہ یہ چند آداب ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہراتؓ کو حکم فرمایا ہے۔ اور اہل ایمان عورتیں ان احکام میں ازواج مطہرات کے تابع ہیں۔

(احکام القرآن حزب خامس ص ۲۰۰)

البتہ ضرورت کے موقعوں پر عورتوں کو چند شرائط کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلنے کی اجازت ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے "احکام القرآن" میں اس سلسلہ کی آیات و احادیث کو تفصیل سے لکھنے کے بعد ان شرائط کا خلاصہ حسب ذیل نقل کیا ہے۔

۱۔ نکلتے وقت خوشبو نہ لگائیں۔ اور زینت کا لباس نہ پہنیں۔ بلکہ میلے کچیلے کپڑوں میں نکلیں۔

۲۔ ایسا زیور پہن کر نہ نکلیں جس میں آواز ہو۔

۳۔ زمین پر اس طرح پاؤں نہ ماریں کہ ان کے مخفیہ زیورات کی آواز کسی کے کان میں پڑے۔

۴۔ اپنی چال میں اترانے اور مٹکنے کا انداز اختیار نہ کریں جو کسی کے لئے کشش کا باعث ہو۔

۵۔ راستے کے درمیان میں نہ چلیں بلکہ کناروں پر چلیں۔

۶۔ نکلتے وقت بڑی چادر (جلباب) اوڑھ لیں۔ جس سے سر سے پاؤں تک پورا بدن ڈھک جائے۔ صرف ایک آنکھ کھلی رہے۔

۷۔ اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلیں۔

۸۔ اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر کسی سے بات نہ کریں۔

۹۔ کسی اجنبی سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ان کے لب و لہجہ میں نرمی اور نزاکت نہیں ہونی چاہیئے۔ جس سے ایسے شخص کو طمع ہو جس کے دل میں شہوت کا مرض ہے۔

۱۰۔ اپنی نظر پست رکھیں یعنی نامحرم پر ان کی نظر نہیں پڑنی چاہیئے۔

۱۱۔ مردوں کے مجمع میں نہ گھسیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پارلیمنٹ وغیرہ کی رکنیت قبول کرنا اور مردانہ مجمعوں میں تقریر کرنا عورتوں کی نسوانیت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان صورتوں میں اسلامی ستر و حجاب کا ملحوظ رکھنا ممکن نہیں۔

عورتوں کا تنہا سفر کرنا

عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں۔ احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ صحاح ستہ، مؤطا امام

مالک، مسند احمد اور حدیث کے تمام متداول مجموعوں میں متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے۔ کہ کسی عورت کے لئے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو حلال نہیں۔ کہ بغیر محرم کے تین دن کا سفر کرے۔" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر محرم کے سفر نہ کرنا عورت کی نسوانیت کا ایمانی تقاضا ہے۔ جو عورت اس تقاضائے ایمانی کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ وہ فعل حرام کی مرتکب ہے۔ کیونکہ اس فعل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "لا یحل" فرمارہے ہیں (یعنی حلال نہیں)

عورتوں کا جج بننا

ایسے تمام مناصب جن میں ہر کس و ناکس کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شریعت اسلامی نے ان کی ذمہ داری مردوں پر عائد کی ہے۔ اور عورتوں کو اس سے سبکدوش رکھا ہے۔ (ان کی تفصیل اوپر شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی نوراللہ مرقدہٗ کی عبارت میں آچکی ہے) انہی ذمہ داریوں میں سے ایک جج اور قاضی بننے کی ذمہ داری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم کے زمانے میں بڑی فاضل خواتین موجود تھیں مگر کبھی کسی خاتون کو جج اور قاضی بننے کی زحمت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس پر آئمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ عورت کو قاضی اور جج بنانا جائز نہیں۔ آئمہ ثلاثہؒ کے نزدیک تو کسی معاملہ میں اس کا فیصلہ نافذ ہی نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدود و قصاص کے ماسوا میں اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا مگر اس کو قاضی بنانا گناہ ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے۔

"والمرأة تقضی فی غیر حد وقود وان اثم المولی لها لخبر البخاری لن یفلح قوم ولوا امرهم امرأة" (شامی طبع جدید ص ۴۴۰ ج ۵)

ترجمہ:۔ "اور عورت حد و قصاص کے ماسوا میں فیصلہ کر سکتی ہے" اگرچہ اس کو فیصلہ کے لئے مقرر کرنے والا گنہگار ہوگا۔ کیونکہ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی۔ جس نے اپنا معاملہ عورت کے سپرد کر دیا۔"

عورت کو سربراہ مملکت بنانا

اسلامی معاشرہ میں عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، حدیث میں ہے کہ جب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنالیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔
"لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ" (صحیح بخاری جلد ۲۔ ص ۶۲۰، ۱۰۲۵۔ نسائی ج ۲ ص ۳۰۴۔
ترمذی ج ۲ ص ۳۳۲)۔

ترجمہ:۔ "وہ قوم کبھی فلاح یاب نہیں ہوگی۔ جس نے اپنا معاملہ عورت کے سپرد کر دیا"۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

اذا کان امرائکم خیارکم واغنیائکم سمحائکم وامورکم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیرلکم من بطنھا واذا کان امرائکم شرارکم واغنیائکم بخلائکم وامورکم الی نساء کم فبطن الارض خیرلکم من ظھرھا۔ (ترمذی ج ۲ ص ۳۳۳)

ترجمہ:۔ "جب تمہارے حکام تم میں سب سے اچھے لوگ ہوں تمہارے مالدار سب سے سخی اور کشادہ دست ہوں۔ اور تمہارے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوں۔ تو تمہارے لئے زمین کی پشت اس کے پیٹ سے بہتر ہے اور جب تمہارے حکام برے لوگ ہوں۔ تمہارے مالدار بخیل ہوں۔ اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو تمہارے لئے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے۔ (یعنی ایسی صورت میں جینے سے مرنا اچھا ہے)"

چنانچہ امت کا اس پر اتفاق و اجماع ہے کہ عورت کو سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۲۹)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ازالۃ الخفاء میں شرائط خلافت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وازاں جملہ آن است کہ ذکر باشد نہ امرأۃ، زیراکہ در حدیث بخاری آمدہ "ما افلح قوم ولوا امرھم امرأۃ"، چوں بسمع مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسید کہ اہل فارس دختر کسریٰ را بپادشاہی برداشتہ اند فرمود رستگار نشد قومی کہ والی امر پادشاہی خود ساختند زنے را۔ وزیراکہ امرأۃ ناقص العقل والدین است و در جنگ وپیکار بیکار۔ وقابل حضور محافل و مجالس نے، پس از وے کارہائے مطلوب برنیاید" (ازالۃ الخفاء ص ۴ ج ۱)

ترجمہ:۔ "اور ایک شرط یہ ہے کہ سربراہ مملکت مرد ہو عورت نہ ہو۔ کیونکہ صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ما افلح قوم ولوا امرھم امرأۃ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنالیا ہے تو فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی۔ جس نے اپنی بادشاہی کا معاملہ عورت

کے سپرد کر دیا۔ نیز اس لئے کہ عورت فطرۃً ناقص العقل والدین ہے۔ جنگ و پیکار میں بیکار ہے۔ اور محفلوں اور مجلسوں میں حاضر ہونے کے قابل نہیں۔ پس اس سے مقاصد مطلوبہ پورے نہیں ہو سکتے۔"

حوریں اور حورے

اور سوال میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ جنت میں نیک مردوں کو حوریں ملینگی تو نیک عورتوں کو "حورے" ملیں گے یہ محض لطیفہ ہے۔ بلاشبہ جنتی مردوں کے چہرے بارونق نورانی اور سفید ہوں گے۔ مگر لغت و عرف میں حور کا اطلاق صرف عورتوں پر ہوتا ہے۔ مردوں کو ان کے زمرے میں شامل کرنا بڑی زیادتی ہے۔ قرآن کریم میں "جہاں حور" کا ذکر آیا ہے وہاں ان کی صفات مؤنث ہی ذکر کی گئی ہیں۔ مثلاً دو جگہ ارشاد ہے۔ "وزوجناهم بحور عین" ایک جگہ ارشاد ہے۔ "وحور عین کامثال اللؤلؤ المکنون" اور ایک جگہ ارشاد ہے۔ "حور مقصورات فی الخیام"

مؤخر الذکر دونوں آیات شریفہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی اصل خوبی پوشیدہ رہنا ہے۔ اور خیموں میں بند رہنا۔ کہ ان دونوں صفتوں کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ، حوران بہشتی کی مدح فرما رہے ہیں۔ حافظ ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء (ص ۴۰ ج ۲) میں اور حافظ نور الدین ھیثمی نے مجمع الزوائد (ص ۲۰۲ ج ۹) میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا، بتاؤ! عورت کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے، صحابہ کرام سے اس کا جواب نہ بن پڑا۔ سوچنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، چپکے سے اٹھ کر گھر گئے۔ حضرت فاطمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال ذکر کیا۔ انہوں نے برجستہ فرمایا کہ تم لوگوں نے یہ جواب کیوں نہ دیا، کہ عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غیر مرد اس کو نہ دیکھیں نہ وہ غیر مردوں کو دیکھے۔ حضرت علیؓ نے یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا یہ جواب کس نے دیا ہے؟ عرض کیا فاطمہ نے: فرمایا کیوں نہ ہو۔ فاطمہ آخر میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔

موجودہ دور کے روشن خیال حضرات جن کی ترجمانی جناب عمر احمد عثمانی کر رہے ہیں۔ خدا نخواستہ جنت میں تشریف لے گئے تو یہ شاید وہاں بھی "حوران بہشتی" میں آزادی کی مغربی تحریک چلائیں گے۔ اور جس طرح آج مولویوں کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔ یہ وہاں حق تعالیٰ شانہ کے خلاف احتجاج کریں گے۔ کہ ان مظلوموں کو "مقصورات فی الخیام" کیوں رکھا ہے۔ انہیں آزادانہ گھومنے پھرنے اور اجنبی مردوں سے گھلنے ملنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

تنقید اور حقِ تنقید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک صالح عزیز کے نام

عزیزم، سلمہٗ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ

تمہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے والہانہ عقیدت ہے۔ اور تمہارے لئے یہ سوال حیرت و پریشانی کا موجب ہے کہ اکابرِ اُمت، جناب سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ان کی تحریکِ اسلامی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہیں؟ میں پُوچھتا ہوں کہ سر سیّد احمد خاں کی تحریکِ اصلاحِ اسلام، عبداللہ چکڑالوی کی تحریکِ قرآن، غلام احمد قادیانی کی تحریک تجدیدِ اسلام، غلام احمد پرویز کی تحریکِ طلوعِ اسلام، ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تحریک تجددِ اسلام اور سوشلسٹوں کی تحریک ترقی پسند اسلام کی مخالفت علماء نے کیوں کی؟ اس کے جواب میں تم یہی کہو گے کہ ان لوگوں نے اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق 'اسلام' کا ایک مصنوعی خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کرکے اُسے تو معیار قرار دیا، اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کی جو چیز اس مصنوعی خاکہ میں فٹ ہو سکی اُسے لے لیا، اور جو چیز اس کے خلاف نظر آئی اُسے یا تو ہنسی مذاق میں اُڑا دیا۔ یا تاویل کے تیشے سے تراش کر اُس کے مفہوم و معنی کو غارت کر دیا، گویا ان کا ذہن و فکر، عقل و شعور

اور دل و دماغ 'اسلام' کے تابع نہیں، بلکہ 'اسلام' کا رد و قبول ان کے ذہنی خاکہ کے تابع ہے۔ اور علماء کا فرض تھا کہ ان کے مصنوعی 'طلسمِ اسلام' کو توڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے حقیقی اسلام کی، جو چودہ سو سال سے سینوں اور سفینوں میں محفوظ چلا آتا ہے، اُمت کو دعوت دیتے اور ان نئے 'مفکرینِ اسلام' کے فتنہ سے لوگوں کو آگاہ کرتے۔

تم جانتے ہو کہ علماءِ اُمت نے ہر قیمت پر یہ فریضہ ادا کیا، انہیں گالیاں دی گئیں، ان پر فقرے چست کیے گئے، ان کا مذاق اُڑایا گیا، ان پر طعن و تشنیع کے نشتر چلائے گئے، مگر علماء اُمت کو تو اپنا فرض ادا کرنا تھا اور انہوں نے بہرحال اسے ادا کیا، اور جب تک جان میں جان اور مُنہ میں زبان ہے تب تک علماء اُمت سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے کے 'جرم' کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

اب سُنو! ___ اسی طرح کا ایک مصنوعی خاکہ جناب مودودی صاحب نے اپنی ذہانت و طبّاعی سے اختراع کیا، اسی کو 'اسلامی تحریک' کی حیثیت سے پیش کیا۔ اسی کی بنیاد پر 'اسلامی جماعت' تشکیل کی، اور آج ان کی 'جماعتِ اسلامی' کے بڑے چھوٹوں پر اسی مصنوعی خاکہ کی چھاپ ہے۔ خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں کہ جو حکم مذکورہ بالا لوگوں کا ہے وہی جناب مودودی پر بھی لگا رہا ہوں، نہیں! بلکہ درجات و مراتب کا فرق ہے، ظلمات بعضہا فوق بعض۔ تشبیہ سے مقصد صرف اتنا ہے کہ حقیقی اسلام کو سمجھنے سے یہ سب لوگ قاصر رہے اور اپنے فہمیدہ اسلام کا الگ ناک نقشہ مرتب کرنے میں سب شریک ہیں۔ یہ الگ امر ہے کہ ان میں سے بعض کا مرتبہ نقشہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام سے بالکل ہی مختلف ہو، اور بعض کا اس قدر مختلف نہ ہو، مگر اس میں کیا شک ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی عقل و فہم کے زور سے 'اسلام'

کا جو خاکہ سمجھا اُسی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، اسی کو مدار ٹھہرایا اور اسی کی قوم کو دعوت دی۔

عربی کی مثل ہے "لکل ساقطة لاقطة" یعنی ہر گری پڑی چیز کو اٹھانے والا کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔ ذہنی مطابقت اور قلبی تشابہ کی بنا پر ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ افراد مل ہی گئے ــــ یہ تمہارے سوال کا مختصر سا جواب ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس اجمال سے تمہاری تشفی نہیں ہوگی، اس لیے مجھے اس کی بقدر ضرورت تفصیل کرنا ہوگی۔ آج کی صحبت میں میں آپ کو صرف ایک نکتہ پر غور وفکر کی دعوت دونگا۔ تم نے جماعتِ اسلامی کے دستور میں جناب مودودی صاحب کے قلم سے یہ فقرہ پڑھا ہوگا:-

> "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو 'معیارِ حق' نہ بنائے، نہ کسی کو 'تنقید' سے بالاتر سمجھے، کسی کی 'ذہنی غلامی' میں مبتلا نہ ہو۔ ہر کو خدا کے بتائے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے، اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو، اس کو اسی درجہ میں رکھے۔"
>
> {مودودی مذہب[1] ص۵۲}

اس دستوری عقیدہ میں جناب مودودی صاحب نے ہر فردِ جماعت کو، خواہ اُسکی اپنی حیثیت کچھ ہی ہو، یہ تلقین فرمائی ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کسی انسان کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے، نہ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوا جائے۔ بلکہ جو کسوٹی مودودی صاحب اور اُن کی جماعت کو خدا نے عطاء کی ہے اُس پر ہر ایک کو ٹھونک بجا کر پرکھا جائے، اور پھر اس جانچ پرکھ کے نتیجہ میں جس کا

---

[1] میں تمہارا وقت بچانے کے لیے "مودودی مذہب" مؤلفہ مولانا قاضی مظہر حسین صاحب کا حوالہ دے رہا ہوں۔ اس میں درج شدہ حوالوں پر کوئی اعتراض ہو تو مصنف ماشاءاللہ بقیدِ حیات ہیں، ان سے رجوع کر سکتے ہیں۔ چاہو تو یہ ذمہ داری میں خود بھی قبول کرنے کو تیار ہوں۔

جو درجہ متعین ہو اُسے اُسی درجہ میں رکھا جائے۔

آپ ذرا "مودودی مذہب" کا مطالعہ کر کے دیکھیے کہ تنقید کی چھلنی میں چھان پھٹک کر مودودی صاحب اور اُن کی جماعت نے اکابر کے کیا کیا درجے متعین فرمائے ہیں۔ سُنئے! مودودی صاحب بتاتے ہیں کہ:۔

(۱)۔۔۔۔ موسیٰ علیہ السّلام کی مثال اُس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے۔

{مودودی مذہب صـ۲۲}

(۲)۔۔۔۔ پیغمبروں تک کو اس نفس شریر کی رہزنی کے خطرے پیش آئے ہیں۔ چنانچہ داؤد علیہ السّلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقعہ پر تنبیہ کی گئی کہ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (سورۂ ص رکوع ۲) ہوائے نفس کی پیروی نہ کرنا ورنہ یہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔ {صـ۲۱}

(۳)۔۔۔۔ حضرت داؤد علیہ السّلام نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی۔

{صـ۲۴}

(۴)۔۔۔۔ حضرت داؤدؑ کے فعل میں خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اس کا حاکمانہ اقتدار کے "نامناسب استعمال" سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔ {صـ۲۵}

(۵)۔۔۔۔ حضرت نوح علیہ السّلام اپنی بشری کمزوریوں سے مغلوب

اور جاہلیت کے جذبہ کا شکار ہو گئے تھے۔ {مودودی مذہب ص۲۶}

(۶)____ عصمت دراصل انبیاءؑ کے لوازم ذات سے نہیں ہے۔ .... اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہو جانے دی ہیں، تاکہ لوگ انبیاءؑ کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بھی بشر ہیں۔

{ص۳۰}

(۷)____ انبیاء کرامؑ سے قصور بھی ہو جاتے تھے اور انہیں سزا تک دی جاتی تھی۔ {ص۳۱}

(۸)____ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں، اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔ {ص۳۵}

---

(۹)____ صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے (یہ پوری عبارت مودودی مذہب ص۵۶ میں پڑھ لیں، آگے کی عبارت نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے)

(۱۰)____ صحابۂ کرامؓ جہاد فی سبیل اللہ کی اصلی اسپرٹ سمجھنے میں بار بار غلطیاں کر جاتے تھے۔ {ص۵۹}

(۱۱)____ ایک مرتبہ صدیق اکبرؓ جیسا بے نفس متورع اور سراپا للّٰہیت بھی اسلام کے نازک ترین مطالبہ کو پورا کرنے سے چوک گیا۔

{ص۶۰}

(۱۲)____ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی) شخصی عظمت نے حلت

مصطفوی کے وقت اضطراری طور پر حضرت عمرؓ کو تھوڑی دیر کے لئے مغلوب کر لیا تھا۔ {مودودی مذہب صـ۶۰}

(۱۳)____ حضرت عثمانؓ، جن پر اس کارِ عظیم (خلافت) کا بار رکھا گیا تھا، ان خصوصیات کے حامل نہ تھے، جو اُن کے جلیل القدر پیشرووں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ {صـ۶۵}

(۱۴)____ خلفائے راشدین کے فیصلے بھی اسلام میں قانون نہیں قرار پائے، جو اُنہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے۔ {صـ۶۶}

(۱۵)____ حضرت عثمانؓ نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور اُن کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ تنقید بن کر رہیں۔ {صـ۷۱}

(۱۶)____ مثال کے طور پر اُنہوں نے افریقہ کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان کو بخش دیا۔ {صـ۷۱}

(۱۷)____ اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں ایسی تھیں جو بڑے دُور رس اور خطرناک نتائج کی حامل ثابت ہوئیں۔ {صـ۷۲}

(۱۸)____ دوسری چیز جو اس سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ خلیفہ (حضرت عثمانؓ) کے سکریٹری کی اہم پوزیشن پر مروان بن الحکم کی ماموریت تھی۔ {صـ۷۲}

(۱۹)____ تاریخ بتاتی ہے اور صحیح بتاتی ہے کہ مروان اور یزید اُمتِ مسلمہ کے نزدیک ناپسندیدہ شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں۔ یہ نرم سے نرم الفاظ ہیں جو مروان اور یزید کے بارے میں کہے جا سکتے ہیں۔

{ماہنامہ فاران صـ۴۲ ستمبر ۷۶ء}

(۲۰)——— حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو (جو فقرہ ۱۷۔۱۸ میں نقل ہوا) بلاشبہ غلط تھا، اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ کسی نے کیا ہو۔ اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضہ اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے[1] {مودودی مذہب ۲۳}

(۲۱)—— ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اُن کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں، برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے ...... کسی کے مرنے کے بعد اُس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا۔ اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ { ص۷۵ }

(۲۲)——— زیاد بن سُمیّہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اُن افعال میں سے ہے جن میں اُنھوں نے سیاسی اغراض کیلئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی[2] { ص۷۶ }

(۲۳)——— حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنا حامی اور مددگار بنانے کیلئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں[3] اور اس کا ثبوت بہم پہنچا کر کہ زیاد اِنہی (ابوسفیانؓ) کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسے اسی بنا پر اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دیدیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت

---

[1] اور اللہ اللہ فی اصحابی کا مطالبہ کیا ہے۔ مدیر بینات [2] غالباً اسی سنت کی تقلید میں آنجناب نے بھی فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں "سیاسی اغراض کیلئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی"۔ مدیر۔ [3] زناکاری پر شہادتیں لینا، کیسا عجیب انکشاف ہے۔ مدیر بینات

سے جیسا کہ کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے، مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا، کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ {مودودی مذہب ص۶۷}

(۲۴)___ حضرت عمرو بن العاصؓ ...... سے دو کام ایسے سرزد ہو گئے ہیں جنہیں غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ {ص۸۴}

(۲۵)___ حضرت علیؓ نے .... مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری تک کے عہدے دے دیئے، درآنحالیکہ قتلِ عثمانؓ میں ان دونوں صاحبوں کا جو حصہ تھا، وہ سب کو معلوم ہے، حضرت علیؓ کے پورے زمانۂ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام[1] ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ {ص۸۵}

(۲۶)___ حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ جری ہو گئی تھیں، اور حضورؐ سے زبان درازی کرنے لگی تھیں۔ {ص۸۸}

---

(۲۷)___ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجددِ کامل پیدا نہیں ہوا۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ {ص۹۱}

(۲۸)___ امام غزالیؒ کے تنقیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ایک قسم ان نقائص کی ہے جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے، دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے

---

[1] جو ان کے پورے زمانۂ خلافت پر پھیلا ہوا ہے۔ مرتب

ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے۔ اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے۔ { ص۹۲ }

(۲۹) ــــ پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ (ولی اللہ) صاحب اور ان کے خلفاء کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا، اور اُن کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ { ص۹۲ }

(۳۰) ــــ اسی طرح یہ قالب (تصوف) بھی مباح ہونے کے باوجود اس بناء پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اس کے لباس میں مسلمانوں کو 'افیون' کا چسکہ لگایا ہے۔ اور اس کے قریب جاتے ہی ان 'مزمن مریضوں' کو پھر وہی 'چنیا بیگم' یاد آجاتی ہے جو صدیوں سے ان کو تھپک تھپک کر سُلاتی رہی ہے۔ { ص۹۲ }

(۳۱) ــــ مسلمانوں کے اس 'مرض' سے نہ حضرت مجدد صاحبؒ ناواقف تھے، نہ شاہ صاحبؒ۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید بھی موجود ہے، مگر غالباً اس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دی جو اس مرض میں 'مہلک' ثابت ہو چکی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے 'مرض' سے متأثر ہوتا چلا گیا۔ { ص۹۴ }

(۳۲) ــــ اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی جو ابن تیمیہ نے کی تھی، لیکن

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا جس کا کچھ اثر شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریروں میں بھی باقی رہا، اور پیری مریدی کا سلسلہ سید صاحبؒ کی تحریک میں چل رہا تھا، اس لئے 'مرضِ صوفیت' کے 'جراثیم' سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی۔ {مودودی مذہب ص۹۵}

(۳۲)—— اور یہی 'جہالت' ہم ایک نہایت قلیل جماعت[۱] کے سوا مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں۔ خواہ وہ اَن پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علماء، یا خرقہ پوش مشائخ، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی رُوح سے ناواقف ہونے میں سب یکساں ہیں۔ {ص ۱۹}

مَیں نے جناب مودودی صاحب کے بھرے ہوئے دریائے تنقید سے یہ چند قطرے پیش کئے ہیں، اور یہ سب کچھ اُنہوں نے بزعمِ خود، خدا کے بتائے ہوئے 'معیار' پر جانچنے اور پرکھنے کے بعد لکھا ہے۔ مَیں ان کے ایک ایک فقرے پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ تم خود سوچو کہ ان تنقیدات کے بعد اسلام کا کیا نقشہ ذہن میں آتا ہے۔ البتہ جی چاہتا ہے کہ تمہاری سہولت کیلئے چند اصولی باتیں پیش کر دوں۔

۱—— جناب مودودی صاحب کا ارشاد کہ "رسُولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کسی انسان کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے"۔ اس کے آثار و نتائج پر غور کرنے کیلئے سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ 'تنقید' کسے کہتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو جانچنا، پرکھنا اور کھوٹا کھرا معلوم کرنا۔ اور اردو محاورے میں یہ لفظ

---

[۱] غالباً مودودی صاحب کی اپنی جماعت۔ مدیر طلوعِ اسلام

نکتہ چینی، خردہ گیری اور اظہارِ نقص کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے، یعنی جانچنے پرکھنے کے بعد جب کوئی چیز عیب دار ثابت ہوتی ہے تو اُس کے کمزور پہلوؤں کے اظہار کا نام تنقید ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں پر تنقید کی تو اس کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اس کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اس پر نکتہ چینی کی اور اس کے عیوب و نقائص بیان کئے۔

۲ ــــــ جس چیز یا جس شخصیت کو تنقید کا محل سمجھا جائے اُس کے بارے میں سب سے پہلا تصور یہ قائم ہوتا کہ 'تنقید سے پہلے یہ چیز قابلِ اعتماد نہیں، بلکہ جانچ پرکھ کی محتاج ہے اور اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہوسکیگا کہ یہ لائقِ اعتماد ہے یا نہیں۔ کیونکہ جو چیز سو فی صد لائقِ اعتماد ہو اُس کے جانچنے پرکھنے کی ضرورت نہیں رہتی، اور نہ دنیا میں کوئی ایسا عقلمند آپ نے دیکھا ہوگا جو سکّہ بند اور لائقِ اعتماد چیزوں کی جانچ پرکھ کرتا پھرے۔ الغرض یہ ایک بدیہی اصول ہے کہ جو چیز لائقِ اعتماد ہے اُس کی تنقید (یا اردو محاورے کے مُطابق اُس پر تنقید) کی ضرورت نہیں۔ اور جو چیز محتاجِ تنقید ہے، وہ تنقید سے قبل لائقِ اعتماد نہیں۔ مثلاً بازار میں مُہر شدہ باٹ استعمال ہوتے ہیں۔ آپ نے کسی کو نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ سودا خریدتے وقت دکاندار سے یہ دریافت کرے کہ میاں! اس کا وزن بھی درست ہے؟ کیونکہ وہ سرکاری مُہر کے بعد تنقید سے بالاتر ہے اور اس پر سرکاری مُہر کا ہونا ہی اس کے قابلِ اعتماد ہونے کی ضمانت ہے، اس کے باوجود اگر کوئی شخص اس دانشمندی کا مظاہرہ کرے تو تم جانتے ہو کہ اسے کیا کہا جائے گا۔

اب جب مودودی صاحب ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ رسُولِ خدا (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے سوا کوئی بھی انسان تنقید سے بالاتر نہیں، تو اس کے معنیٰ اس کے سوا اور کیا ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کوئی انسان بھی ہمارے لئے لائقِ اعتماد نہیں اسی اعتماد کو جناب مودودی صاحب 'ذہنی غلامی' سے تعبیر کر کے یہ فرماتے ہیں کہ " نہ

(رسُولِ خدا کے سوا) کسی (انسان) کی 'ذہنی غلامی' میں مبتلا ہو۔" گویا جناب مودودی صاحب کے نزدیک چودہ سو سال کی اُمت میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کے کسی قول و فعل پر ہم اعتماد کرسکیں، تا وقتیکہ مودودی صاحب خدا کے بتائے ہوئے معیار پر جانچ کر اس کی درجہ بندی نہ کریں، اور ہمیں یہ نہ بتلادیں کہ فلاں شخص پر تم اس حد تک اعتماد کرسکتے ہو اور اس حد تک نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے خود تراشیدہ تصورِ اسلام میں خلفائے راشدین کے قاضیانہ فیصلوں کو بھی قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید سے اُمت کو وصیت فرمائی تھی کہ خلفائے راشدین کی سُنت کو مضبوط پکڑیں۔ مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث تم نے پڑھی ہوگی:۔

عن العرباض بن ساریۃ قال صلّٰی بنا رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم ثم اقبل علینا بوجھہ۔ فوعظنا موعظۃً بلیغۃً ذرفت منھا العیونُ ووجلت منھا القلوب فقال رجلٌ یا رسول اللہ کأنّ ھذہ موعظۃ مودّعٍ فاوصنا فقال: اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ وان کان عبدًا حبشیًّا، فانّہٗ من یعِش منکم بعدی فسیریٰ اختلافًا کثیرًا، فعلیکم بسنّتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، تمسکوا بھا وعضّوا علیھا بالنواجذ، و ایاکم ومحدثات الامور، فانّ کلّ محدثۃٍ بدعۃٌ وکلّ بدعۃٍ ضلالۃٌ ۔ (رواہ احمد، وابوداؤد، والترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ:۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھا کر فارغ ہوئے تو ہماری جانب

رُخ کر کے بہت ہی پُر اثر وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہ پڑیں اور دل کانپ گئے۔ وعظ سُن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آج کا وعظ تو ایسا (جامع اور مؤکّد) تھا جیسا رخصت کرنے والے کا وعظ ہوتا ہے (کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں چھوڑتا جس پر تنبیہ کی حاجت ہو) پس (اگر واقعی آپؐ کے رخصت ہونے کا وقت قریب ہے، تو) ہمیں کوئی وصیت فرمایئے (جس کو عمر بھر یاد رکھیں) آپؐ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ (تم میں سے جو اولوالامر ہو اس کی) سُنو اور مانو، خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت (نظریاتی) اختلافات دیکھے گا۔ پس تم میری سُنّت کو اور ان خلفاء کی سُنّت کو جو رشد و ہدایت پر فائز ہیں اختیار کرو، اسے خوب مضبوط پکڑ لو اور دانتوں سے تھام لو۔ اور نئے نئے اُمور سے اجتناب کرو، کیونکہ ہر نئی بات (جسے دین کا جزء سمجھ لیا جائے وہ) 'بدعت' ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مشکوٰۃ ص۲۹ بحوالہ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

۳۔۔۔۔ جاننا ہو کوئی شخص جب کسی دوسرے پر 'تنقید' کرتا ہے تو اس کا منشا کیا ہوتا ہے؟ سُنو اگر کسی کے علم پر تنقید کی جائے (خواہ وہ صرف کسی ایک مسئلہ یا معاملہ سے متعلق ہو) تو اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان صاحب کا علم صحیح نہیں، بلکہ ناقد کا علم صحیح ہے یا ناقد اس مسئلہ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے فہم پر تنقید کی جائے تو اس کا منشا اپنے فہم کی برتری کا احساس ہے۔ اور اگر عمل پر تنقید کی جائے تو اس کا منشا اپنے عملی تفوّق کا جذبہ ہے۔ الغرض جس بات میں آپ دوسرے پر تنقید کریں گے اس میں اپنے علم و عمل اور عقل و فہم کے مقابلہ میں دوسرے کے علم و عمل اور

عقل وفہم کو فروتر سمجھیں گے ۔ پھر کبھی تو نا قد واقعی ان امور میں اُس شخص سے جس پر تنقید کی گئی، فائق ہوتا ہے اور کبھی واقعۃً فائق نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی خوش فہمی کے جنون میں اپنے کو فائق تر سمجھتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں اسے 'کبر' یا 'تکبر' کہتے ہیں اور یہی 'کبر' تھا جس کا شکار سب سے پہلے ابلیس ہوا، اور اسی برخود غلط احساسِ برتری نے اسے 'معلمِ ملکوت' کے بجائے قیامت تک ملعون بنا دیا۔

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر ذرا مودودی صاحب کی تنقید اور اصول تنقید پر نظر ڈالئے۔ وہ ہر شخص کو حق دیتے ہیں کہ وہ رسُول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا سلفِ صالحین میں سے ہر شخص پر تنقید کرے۔ بتلائیے آخر اس کو کیا نام دیا جائے۔ کیا مودودی صاحب کے نزدیک ان کی جماعت کا ہر فرد سلفِ صالحین سے علم وفہم میں فائق ہے؟ اگر نہیں تو اس کا منشاء برخود غلط پندار کے سوا اور کیا ہے؟ اور پھر مودودی صاحب یہ کہتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السّلام سے فریضۂ رسالت میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں۔ اس وقت ان کا دعوٰی گویا یہ ہوتا ہے کہ وہ فریضۂ رسالت کی ذمّہ داریوں کو حضرت یونس علیہ السّلام سے زیادہ سمجھتے ہیں، بلکہ شاید خدا سے بھی زیادہ۔ کیونکہ کم از کم مودودی صاحب سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ اپنی جماعت کی کوئی ذمّہ داری کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جس کے بارے میں انہیں علم ہے کہ وہ اسے پوری طرح ادا نہیں کر سکے گا۔ مگر بقول ان کے خدا نے فریضۂ رسالت کی ذمّہ داری حضرت یونسؑ کے سپرد کر کے یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی۔

اسی طرح جب وہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السّلام جاہلیت کے جذبہ سے مغلوب ہو گئے تھے تو گویا وہ دعوٰی کرتے ہیں کہ جذباتِ جاہلیت پر اُن کی نظر حضرت نوح علیہ السّلام سے زیادہ ہے۔ اور یہ کہ ان جاہلی جذبات پر غالب آنے کی وہ حضرت نوح علیہ السّلام سے زیادہ ہمّت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اپنے بارے میں اُن کا ارشاد یہ ہے:-

"خدا کے فضل سے مَیں کوئی کام یا کوئی بات جذبات کے مغلوب

ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا، ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں
کہا ہے تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب
مجھے خدا کو دینا ہے نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں
کہ میں نے کوئی لفظ بھی خلافِ حق نہیں کہا۔" {مودودی مذہب ص۲۹}

جب وہ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متأثر ہو کر فلاں کام کیا تھا، اس وقت وہ نہ صرف اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جو شخص اپنی سوسائٹی کی 'ذہنی غلامی' میں مبتلا ہو جائے وہ پیغمبر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ وہ تأثر بھی دیتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام کی جگہ اگر حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہوتے تو اوریا سے اُس کی بیوی کی طلاق کا کبھی مطالبہ نہ فرماتے۔

جب وہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے فلاں معاملہ میں انسانی اخلاق تک کو ملحوظ نہیں رکھا، اس وقت وہ اپنے آپ کو انسانی اخلاقیات کا حضرت معاویہؓ سے بڑا عالم سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے شریعت کے فلاں قاعدے کی صریح خلاف ورزی کی، اُس وقت وہ اپنے آپ کو حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر عالم شریعت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

جب وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر حضرت سید احمد شہیدؒ تک مجددین کے تجدیدی کاموں میں یہ یہ نقائص رہ گئے، اُس وقت وہ یہ باور کراتے ہیں کہ وہ تجدید و احیائے دین کو ان تمام اکابر سے زیادہ سمجھتے ہیں اور جب وہ بڑے فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ:۔

"میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے
ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے[1]، اس لئے میں کبھی یہ

---

[1] اور قرآن اور سنت کا سمجھنا آنجناب کو کس نے سکھایا تھا؟ حال یا ماضی کے اشخاص نے؟ ملاء اعلیٰ کے
(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

"معلوم کرنے کیلئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مؤمن سے کیا چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول نے کیا کہا[۱]۔"
{مودودی مذہب ص۹۱}

اس وقت دراصل وہ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُمت کے طویل ترین دَور میں کوئی 'بزرگ' ان سے زیادہ دین کو سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا۔ خیر، یہ ایک الگ موضوع ہے، اس پر انشاء اللہ کبھی دوسری فرصت میں کچھ کہوں گا۔ سر دست مجھے یہ کہنا ہے کہ تنقید کا منشا ہمیشہ انا خیرٌ منہ کا احساس ہوتا ہے، اگر کوئی شخص واقعۃً کسی سے علم و فہم اور عمل و اخلاق میں بڑھ کر ہے تو اسے بلاشبہ اپنے چھوٹے پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ اور اگر بر خود غلط احساسِ برتری اس کا منشا ہو تو اس سے ہر مؤمن کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ اب اگر جناب مودودی صاحب واقعی ان تمام حضرات سے اپنے علم و فہم اور عمل و تقوےٰ میں فائق ہیں جن پر انہوں نے تنقیدیں کی ہیں تو بلاشبہ انہیں تنقید کا حق ہے۔ اور اگر ان حضرات کے مقابلہ میں علم و فہم اور عمل و تقویٰ میں تہی دامن ہونے کے باوصف وہ تنقید کا شوق رکھتے ہیں تو اس کا منشا بجز غرور و پندار اور تکبر کے کیا ہو سکتا ہے۔

۴ ـــــ پھر جناب مودودی صاحب کے نظریہ کے مطابق جب چودہ سو سالہ اُمت کا کوئی بھی فرد تنقید سے بالا نہیں، نہ کسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، بلکہ خدا کی بتائی ہوئی کسوٹی پر ہر ایک کو جانچنا اور پرکھنا لازم ہے تو سوال یہ ہے کہ جو دین آج کی اُمت کو سلف صالحین کی نقل و روایت اور علم و عمل کے ذریعہ پہنچا ہے اُس پر اعتماد کیسے کیا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) فرشتوں نے؟ یا مرزا غلام احمد کی طرح سب کچھ شکم مادر ہی سے لیکر آئے تھے؟ ناشکری کی حد ہے کہ دو چار الٹے سیدھے حرف جن اشخاص کی جوتیوں کی برکت سے حاصل ہوئے اُنہی کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ مدیر بینات

[۱] بنیادی طور پر ٹھیک یہی نظریہ مرزا غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز کا ہے۔ مدیر بینات

جائے؛ تم جانتے ہو کہ ہمارے دین کے دلائل کُل چار ہیں۔ کتابُ اللہ، سُنّتِ رسُول اللہ (خلفائے راشدین کی سُنّت اسی کے ضمن میں آجاتی ہے) اجماعِ اُمّت اور قیاسِ مجتہدین۔ ائمہ اجتہاد کے فقہی مسائل تو یوں ختم ہوئے کہ مودودی صاحب ماشاء اللہ خود مجتہدِ مطلق ہیں۔ انہیں دین فہمی کے لئے ماضی و حال کے کسی بزرگ سے علمی استفادہ کی حاجت نہیں۔ اور جب پُوری اُمّت کو محتاجِ تنقید اور نالائق اعتماد فرض کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ اُن کے اجماع کی بھی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور کتاب و سُنّت کا مدار روایت و درایت پر ہے۔ جن لوگوں کے علم و عمل پر ہی اعتماد نہیں اُن کی روایت و درایت کا حال معلوم خصوصًا جبکہ جناب مودودی صاحب کی تحقیق کے مُطابق صحابۂ کرامؓ ایک دوسرے پر چوٹیں کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو (نعوذ باللہ) جھوٹا بتایا کرتے تھے۔ اگر صحابۂ کرامؓ بھی نعوذ باللہ ایسے ہی تھے جس کی تصویر مودودی صاحب کی تنقیدات نے مرتّب کی ہے تو بعد کی اُمّت تو ظاہر ہے کہ ان سے بدتر ہی ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ قرآن و حدیث سے لیکر اجماع و قیاس تک ہر چیز مشکوک اور ناقابلِ اعتماد ٹھہری جب تک کہ خدا کے بتائے ہوئے معیار پر پرکھ کر مودودی صاحب ہمیں نہ بتائیں کہ فلاں چیز کتنی حد تک قابلِ اعتماد ہے اور کتنی حد تک نہیں۔

ذرا انصاف سے کہیئے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور مسٹر غلام احمد پرویز اس کے سوا اور کیا کہتے ہیں۔ اور پھر یہ "خدائی معیار" مودودی صاحب کو کہاں سے حاصل ہوگا جس پر جانچ جانچ کر وہ سلفِ صالحین میں سے ایک ایک فرد کی درجہ بندی کریں گے (اور جیسی درجہ بندی اُنہوں نے کر دی ہے اُس کا کچھ نمونہ تم دیکھ ہی چکے ہو) کیا ان پر نئے سرے سے وحی نازل ہوگی یا چودہ سَو سال پیچھے کی طرف زقند لگا کر وہ براہِ راست رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے قرآن و سُنّت سُن لیں گے؟

جب وہ ماضی یا حال کے کسی بھی بزرگ کے واسطے کے قائل نہیں، نہ کسی کی ذہنی

غلامی' کی ذلت اُٹھانے کیلئے وہ تیار ہیں تو آخری 'خدائی معیار' اُنہیں کس غار سے دستیاب ہوگا؟

۵ ـــــ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے آخری دین کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا ہے، دین کی حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ نصوصِ دین کے الفاظ بھی بغیر کسی تغیر و تبدل کے محفوظ رہیں۔ ان کے معانی بھی محفوظ ہوں۔ پھر ان پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح خود عمل کر کے دکھایا اور صحابہ کرامؓ سے اپنے سامنے عمل کرایا، وہ بھی محفوظ ہو، اور پھر ان اعمال سے جو اسلامی ذوق، احسانی کیفیت اور دین فہمی کا ملکہ پیدا ہوتا ہے وہ بھی محفوظ رہے۔ غرضیکہ یہ چار چیزیں ہوئیں۔ الفاظ، معانی، اعمال اور ذوقِ دین ـــــ ہم 'ذہنی غلامی' کے مبتلاؤں تو خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ یہ چاروں چیزیں بغیر کسی انقطاع کے محفوظ رکھیں اور جن حضرات کے ذریعہ محفوظ رکھیں وہ ہمارے محسن ہیں، مقتدا ہیں، معتمد علیہ ہیں، اور ہم ان کے ذہنی غلام ہیں، ممنونِ احسان ہیں۔ کیونکہ اگر ان حضرات کو درمیان سے ہٹا دیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ فلاں دور میں وہ دین کے الفاظ کو یا معانی کو، یا عمل کو، یا ذوق کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے یا یہ کہ اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو اس سے پورے دین ہی کی نفی ہو جاتی ہے۔ مگر مودودی صاحب کے نظریہ کے مطابق تو ان چاروں چیزوں میں سے ایک چیز بھی لائقِ اعتماد نہیں رہی کیونکہ ماضی اور حال کے بزرگوں کی 'ذہنی غلامی' میں مبتلا ہونے کی ذلت ان کے منصبِ عالی کے لئے ناقابلِ برداشت ہے جس کے لئے وہ کسی طرح بھی آمادہ نہیں ـــــ اور اگر ان کی رعایت سے یہ تسلیم بھی کر لیں کہ قرآن و سُنّت کے الفاظ محفوظ ہیں، تب بھی ان الفاظ کو معنیٰ پہنانے اور ان معانی کو عملی جامہ پہنانے اور پھر ان اعمال ریاضت سے دین کا ذوق نصیب ہونے کے مراحل باقی رہیں گے، اور چونکہ مودودی صاحب کسی بھی انسان کی 'ذہنی غلامی' قبول کرنے پر آمادہ نہیں اس لئے انہیں یہ سارے مراحل بغیر کسی کی راہنمائی کے طے کرنے ہونگے اسی طرح ان کی جماعت کے ایک ایک فرد کے لئے بھی چونکہ سلفِ صالحین کی 'ذہنی غلامی'

شجرِ ممنوعہ ہے، اس لئے اُنہیں بھی اپنی عقل و فہم کی پرواز سے یہ مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ اس سے ان کے دین کا جو حلیہ بنے گا اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ حاصل یہ کہ جو شخص آج چودہ سو سال پُرانے اسلام کے اندر رہنا چاہتا ہے اُس کو تو حاملینِ دین سلفِ صالحین کی 'ذہنی غلامی' کے بغیر چارہ نہیں۔ اور جو شخص اس ذلت کو برداشت نہیں کرتا یا نہیں کرنا چاہتا وہ خواہ کتنا ہی بلند پرواز کیوں نہ ہو 'اسلام' کو ——— محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کو ——— حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر سلفِ صالحین کے قال وحال پر اعتماد کئے بغیر اور ان کی 'ذہنی غلامی' میں مبتلا ہوئے بغیر بھی اسلام کو حاصل کرنے کا کوئی سائنٹفک طریقہ جناب مودودی صاحب نے ایجاد فرمایا ہے اُس کے معلوم کرنے کا متمنی ہوں، بشرطیکہ وہ مسٹر پرویز اور مرزا قادیانی وغیرہ ملاحدہ کے طریقہ سے ذرا مختلف ہو۔

۶ ——— جناب مودودی صاحب کی شستہ بیانی اور قلم کی روانی کا مَیں بھی معترف ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ وہ اپنی بلند پروازی میں ایسے الفاظ بھی استعمال فرما جاتے ہیں جو موقعہ و محل کے اعتبار سے بالکل ہی بے معنی ہوں۔ مثلاً یہی 'تنقید سے بالاتر' اور 'ذہنی غلامی' کے الفاظ کو لیجئے۔ یہ اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے بالکل مہمل ہیں۔ غور فرمایئے، اگر دینِ اسلام کی 'ذہنی غلامی' کوئی عیب نہیں بلکہ لائقِ صد فخر ہے تو حاملینِ اسلام اور سلفِ صالحین کی پَیروی اور 'ذہنی غلامی' کیوں لائقِ فخر نہیں؟ اور اگر دینِ اسلام ہم ایسے جاہلوں کی تنقید سے بالاتر ہے تو جن حضرات کے واسطہ سے ہمیں دین پہنچا اُن کا علم و فہم تنقید سے بالاتر کیوں نہ ہوگا؟ ارشادِ نبوی لا تجتمع امتی علی الضلالۃ [۱] کا آخر کیا مفہوم ہے؟

ایک طفلِ مکتب کا تصور کیجئے جو پہلے دن مکتب میں گیا۔ اُستاذ نے اُسے بغدادی

---

[۱] میری اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔

قاعدہ شروع کرایا ہو۔ جب اُستاذ نے اُس کو الف، بے کہلایا تو اس کے جواب میں وہ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضور! میں چودھویں صدی کا مفکر ہوں، آپ کی 'ذہنی غلامی' کیوں قبول کروں، تو اس صاحبزادے کی تعلیم جس قدر 'مکمل' ہوگی وہ محتاجِ بیان نہیں ـــــ ہم لوگ صحابۂ کرامؓ اور دیگر سلفِ صالحین کے مقابلہ میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتے جو اس ماڈرن صاحبزادے کی استاذ کے مقابلہ میں تھی۔ ہمیں دین کی ابجد انہی بزرگوں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے، ان کی 'ذہنی غلامی' سے انحراف کا نتیجہ بھی اس صاحبزادے سے مختلف نہیں ہوگا۔ خدا مجھے معاف فرمائے میرا خیال یہ ہے کہ سلفِ صالحین سے کٹ کر اور ان کی 'ذہنی غلامی' کا جوا اُتار کر جو لوگ اسلام کا ناک نقشہ مرتب کر رہے ہیں، وہ سرے سے اسلام کے قائل ہی نہیں، وہ قرآن اور سُنّت کے الفاظ بار بار اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں کفر و الحاد پھیلانے کیلئے اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ جناب مودودی صاحب کو میں ان لوگوں کی صف کا آدمی تو نہیں سمجھتا لیکن افسوس ہے کہ مودودی صاحب نے سلفِ صالحین میں سے ایک ایک فرد کی 'ذہنی غلامی' کی نفی کر کے دَورِ حاضر کے ملاحدہ کی 'ذہنی غلامی' کو ترجیح دی ہے، اور انہوں نے 'آزادروی' کا وہی راستہ اپنایا ہے جس پر آج کا ماڈرن طبقہ سرپٹ دَوڑ رہا ہے۔

۷ ـــــ جناب مودودی صاحب سلف صالحین کی اقتدا، و اتباع کو 'ذہنی غلامی' کا نام دے کر اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی 'ذہنی غلامی' ہے جس کو قرآن 'سبیل المؤمنین' قرار دے کر اس کے چھوڑنے والوں کو جہنّم رسید کرنے کی دھمکی دیتا ہے اور پھر یہ وہی 'ذہنی غلامی' ہے جس کو قرآن 'الصراط المستقیم' قرار دیکر اس کی ہدایت کی دُعا تلقین کرتا، اور پھر یہ وہی 'ذہنی غلامی' ہے جس کے لئے مسلمان ناک رگڑ رگڑ کر تضرع و فتنہ دعائیں کرتے ہیں۔ کتنی مکروہ اور بھونڈی تعبیر ہے۔ جس راستہ پر

مقدسین کے قافلوں کے قافلے گزرے ہیں اس کی پیروی کو 'ذہنی غلامی' بتایا جائے۔

تم نے اگر اسلامی دور میں اُبھرنے والے باطل فرقوں کا مُطالعہ کیا ہے تو یہ حقیقت تم پر آشکارا ہو گی کہ ان سب کی بنیاد اسی انا و لاغیری پر استوار ہوئی ان سب نے سلف کی 'ذہنی غلامی' سے عار کی اور اپنی عقل و فہم کے بازوؤں پر تخیلات کے جنگل میں پرواز شروع کر دی، اور پھر جس کا جدھر منہ اُٹھا اُسی سمت اُڑتا رہا۔

اسلام میں سب سے پہلا فتنہ عبداللہ بن سبا یہودی نے برپا کیا۔ جس کی بنیاد ہی "رسُولِ خدا کے سوا کسی انسان کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھنے" پر تھی۔ پھر اسی سبائیت کے بطن سے 'فتنہ خوارج' نے جنم لیا، جو بڑی شوخ چشمی سے کہتے تھے کہ حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ نے دین کو نہیں سمجھا، ہم ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر انہی بنیادوں پر معتزلہ، مرجئہ قدریہ وغیرہ فرقے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک نے سلف کی پیروی کو 'ذہنی غلامی' تصور کیا، فضلّوا واضلّوا۔ دورِ حاضر میں جو نئے نئے فرقے پیدا ہوئے اُن میں اصُول و نظریات کے اختلاف کے باوجود تمہیں یہی 'قدرِ مشترک' نظر آئے گی۔ سلف صالحین کا مذاق اُڑانا، ان کے کاموں میں کیڑے نکالنا، ان کی حیثیت کو مجروح کرنا، اُن پر تنقیدی نشتر چلانا اور ان کی پیروی کو رجعت پسندی، دقیانوسیت، قدامت پرستی، ذہنی غلامی جیسے القاب دینا دورِ جدید کا فیشن ہے۔ افسوس ہے کہ جناب مودودی صاحب نے بھی اپنی 'اسلامی تحریک' کی بُنیاد اسی نظریہ پر اُٹھائی ہے۔ ہم جب خارجیوں کے حالات پڑھتے تھے تو ہمیں ان کی جرأت پر تعجب ہوتا تھا کہ وہ ایک ایسی شخصیت کے مقابلہ میں دین فہمی کا دعوے کر رہے ہیں جس نے آفتابِ اسلام کو اپنی آنکھوں سے طلوع ہوتے دیکھا۔ جو ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق و معتمد علیہ رہا۔ جو نزولِ وحی کے ایک ایک واقعہ کا عینی شاہد تھا۔ جس نے اپنی زندگی بچپن سے کہولت تک اسلام پر نثار کر دی۔ ان لوگوں کی عقل کو آخر کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس کی دین فہمی پر تنقید کرتے تھے۔ مگر

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ آج جناب مودودی صاحب کی تنقیدوں نے (جو اُنھوں نے حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابۂ کبار پر کی ہیں) خارجیوں سے متعلق ہمارا سارا تعجب دُور کر دیا۔ مودودی صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ 'اسلامی نظام' کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے، نہ ان کے بعد کسی کو اس کی توفیق ہوئی۔ اب جناب مودودی صاحب کی 'تحریک اسلامی' اسلامی نظام برپا کرے گی۔ ان هي الاخارجية جديد۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خدا کے فرشتے حیا کرتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:-

اَلَا استحی من رجل تستحیی منه الملائکة (رواہ مسلم مشکوٰۃ ص۵۶۱)	کیا میں ایسے شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

مگر مودودی صاحب ان سے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے بلکہ ان پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بے پناہ قربانیوں سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:-

ما علی عثمان ما عمل بعد هذه ما علی عثمان ما عمل بعد هذه (رواہ الترمذی مشکوٰۃ)	عثمان اس کے بعد جو کچھ بھی کریں اُن پر الزام نہیں، عثمان آج کے بعد جو کچھ بھی کریں اُن پر الزام نہیں۔

مگر مودودی صاحب ان پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے کو سرمایۂ فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کو وصیت فرماتے ہیں:-

الله الله فی اصحابی لا تتخذوهم غرضاً من بعدی، فمن احبهم فبحبی احبهم ومن	میرے ساتھیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔ ان کو میرے بعد ہدفِ تنقید نہ بنا لینا، پس جس نے ان سے محبت کی پس میری محبت کی بنا پر ان

ابغضهم فببغضی ابغضهم۔ (ترمذی)

سے محبت کی، اور جس نے ان سے بغض رکھا تو مجھ سے بُغض کی بنا پر ان سے بُغض رکھا۔

لیکن مودودی صاحب ان کی تنقید کو چھلنی میں چھاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر کس و ناکس کو ان پر تنقید کا حق دیتے ہیں، ان کی عیب چینی کر کے اُمّت کو ان سے نفرت اور بغض رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ لوگ اُن کی "ذہنی غلامی" سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ جدید رنگ میں اُسی خارجیت کا احیاء ہے جو صحابہؓ کے دَور میں اُبھری تھی۔ و لعن آخر هذه الامة اولها[۱]

اس تحریر کو فقیہ الامت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر ختم کرتا ہوں تاکہ ان کے ارشاد سے مودودی صاحب کے فرامین کا "معیارِ حق" ہمیں معلوم ہو سکے۔

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه قال من كان مستنًا فليستن بمن قد مات، فان لا يؤمن عليه الفتنة اولئك اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم كانوا فضل هذه الامة ابرّها قلوبًا واعمقها علمًا واقلّها تكلفًا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے جس کو کسی کی اقتدا کرنی ہو تو ان حضرات کی اقتدا کرے جو فوت ہو چکے ہیں، کیوں کہ زندہ آدمی فتنہ کے اندیشہ سے مامون نہیں۔ میری مُراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے ہے۔ یہ حضرات ساری اُمّت سے افضل تھے، سب سے زیادہ پاک دل تھے، علم میں سب سے گہرے اور سب سے کم تکلّف تھے۔

---

[۱] "اور اُمّت کے پچھلے لوگ پہلوں پر لعن طعن کریں گے"۔ (حدیثِ نبوی)

اختارهم الله لصحبة	اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ
نبیّه ولاقامة دینه	وسلم کی صحبت و رفاقت اپنے دین
فاعرفوا لهم فضلهم	کی اقامت و حمایت کے لیے ان کو
واتبعوا علیٰ اثرهم	منتخب فرمایا۔ لہذا ان کے فضل و
وتمسکوا بما استطعتم	کمال کو پہچانو، ان کے نقشِ قدم پر
من اخلاقهم وسیرتهم	چلو۔ جہاں تک ممکن ہو ان کی سیرت و
فانهم کانوا علی الهدی	اخلاق کو اپناؤ کیوں کہ وہ سیدھی
المستقیم۔ (رواہ رزین، مشکوٰۃ ص۳۲)	ہدایت پر تھے۔ (رزین)

حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اور پوری اُمت کو اس زرّین نصیحت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین

مکتبہ لدھیانوی